آج

۵۸

ہوشنگ گلشیری
سعیدالدین
میلان کنڈیرا

ارون پرکاش
ہردیش
ہرمن ہیسے

کارل چاپیک
اینا کیون

ترتیب

اجمل کمال

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

آج

ادبی کتابی سلسلہ شمارہ 58

جنوری 2008

سالانہ خریداری:

پاکستان: ایک سال (چار شمارے) 400 روپے (بشمول ڈاک خرچ)

بیرون ملک: ایک سال (چار شمارے) 60 امریکی ڈالر (بشمول ڈاک خرچ)

رابطہ:

پاکستان: آج کی کتابیں، 316 مدینہ سٹی مال، عبداللہ ہارون روڈ، صدر، کراچی 74400

فون: 5213916 5650623

ای میل: ajmalkamal@gmail.com, aajquarterly@gmail.com

دیگر ممالک:

Dr. Baidar Bakht, 21 White Leaf Crescent, Scarborough,

Ontario M1V 3G1, Canada.

Phone: (416) 292 4391Fax: (416) 292 7374

E-mail: bbakht@rogers.com

Scanned with CamScanner

ارجمند آرا

ترتیب

ہوشنگ گلشیری

15

شہزادہ احتجاب

(ناول)

❋

سعید الدین

103

نظمیں

❋

میلان کنڈیرا

171

مذاق

(ناول کا ایک حصہ)

❋

Scanned with CamScanner

ارون پرکاش

233

گج پُران

ہردیش

263

مَنو

٭

ہرمن ہیسے

287

ڈاکٹر فاؤسٹ کے ساتھ ایک ساتھ

کارل چاپیک

292

وہ بھی کیا دن تھے

اینا کیون

295

واردات

Scanned with CamScanner

ہوشنگ گلشیری

شہزادہ احتجاب

(ناول)

فارسی سے ترجمہ

اجمل کمال

Scanned with CamScanner

تعارف

آئندہ صفحات میں ممتاز ایرانی ادیب ہوشنگ گلشیری کے فارسی ناول ''شازدہ احتجاب'' کا مکمل اردو ترجمہ ''شہزادہ احتجاب'' کے عنوان سے پیش کیا جارہا ہے۔ تہران سے 1969 میں شائع ہونے والے اس مختصر ناول کو اشاعت کے بعد جلد ہی ایک شاہکار کا درجہ حاصل ہوگیا تھا۔ ناول کے انگریزی مترجم جیمز بوچن (James Buchan) کے لفظوں میں، ''اس ناول نے ثابت کیا کہ ایرانی لکھنے والوں نے نہ صرف یوروپ اور امریکہ کے جدید فکشن کی تکنیکیں سیکھ لی ہیں بلکہ ان میں چند اپنی اختراعات کا بھی اضافہ کیا ہے۔ ایرانی تاریخ کے جسیم موضوع کو ایک حسرت آمیز اور غیر دلکش گھریلو ڈرامے کی صورت میں پیش کرنے والے ہوشنگ گلشیری کو اپنے تجربے میں کامیاب ہونے کا کوئی حق نہیں پہنچتا تھا، پھر بھی وہ کامیاب ہوا۔''

اپنے ایک انٹرویو میں گلشیری کا کہنا تھا کہ یہ ناول محض ''ایک ایسے شخص کی کہانی بیان کرتا ہے جو کھانسی میں مبتلا ہوکر مرگیا''۔ یہ واقعہ بیسویں صدی کے نصف اول کی ایک رات کے دوران ایران کے ایک صوبائی قصبے میں پیش آتا ہے۔ مرنے والا فرضی کردار، شہزادہ خسرو احتجاب، ایران کے قاچار شاہی خاندان کے آخری افراد میں سے ایک ہے۔ اس شاہی خاندان کے اقتدار کا خاتمہ 1925 میں شاہی فوج کے ایک افسر رضا خان کے ہاتھوں ہوا جس نے رضا شاہ کے نام سے تخت پر قابض ہوکر پہلوی خاندان کی حکمرانی کی بنیاد رکھی۔

یہ حکمرانی اس کے بیٹے کے دور میں 1979 کے اسلامی انقلاب کے نتیجے میں ختم ہوئی۔ لیکن جس وقت گلشیری کا ناول شائع ہوا، تب ایران پر رضا شاہ کے بیٹے محمد رضا پہلوی کی سخت گیر اور سفاک گرفت ہنوز قائم تھی۔ پہلے پہل حکمرانوں کو ''شہزادہ احتجاب'' کی کمزور اور افلاس زدہ شخصیت میں اپنی ہستی کی جھلک دکھائی نہ دی۔ تاہم 1974 میں بہمن فرمان آرا نے گلشیری کے اس ناول پر اسی عنوان سے فلم بنائی تو مطلق العنان شاہی کے ادارے پر وہ تیکھی تنقید زیادہ واضح ہوکر سامنے آئی جو دراصل اس ناول کی جان ہے۔ فلم کے مکمل ہوتے ہی گلشیری کو چھ ماہ کی قید جھیلنی پڑی۔ اس سے پہلے 1960 کے عشرے کے شروع کے سیاسی ہلچل کے زمانے میں بھی، جب محمد رضا پہلوی اپنے مطلق العنان اقتدار کو مستحکم کرنے میں مشغول تھا، گلشیری کو مختصر مدت کی قید کاٹنی پڑی تھی۔

شاہی دور کا خاتمہ کرنے والے اسلامی انقلاب کو بھی آزاد خیال لکھنے والوں کی کچھ زیادہ برداشت نہ تھی۔ اس بار اس ناول اور گلشیری کی دوسری تحریروں کو عورتوں کے مقام اور دیگر امور پر مذہبی نوعیت کے اعتراضات کا سامنا کرنا پڑا۔ اسلامی دور میں ہوشنگ گلشیری کو، جن کی وابستگی کسی سیاسی نظریے یا پروگرام سے

بڑھ کر ادبی تخلیق سے تھی، ہر طریقے سے پریشان کیا گیا، یہاں تک کہ 1990 کے عشرے کے دوران انھیں قتل کیے جانے کا خطرہ بھی درپیش رہا۔

ہوشنگ گلشیری 1937 میں اصفہان کے ایک ایسے گھرانے میں پیدا ہوئے تھے جس کے افراد کثیر اور وسائل قلیل تھے۔ ان کی پرورش جنوبی ایران کے گرم موسم اور تیل کے مرکز شہر ابادان میں ہوئی جہاں ان کے والد اینگلو ایرانین آئل کمپنی میں کلرک کے طور پر ملازم تھے۔ 1955 میں گلشیری اصفہان لوٹ آئے جہاں اس وقت تک سترھویں صدی کے پُرشوکت دنوں کی حسین اور مخدوش یادگاریں جابجا موجود تھیں۔ اصفہان یونیورسٹی سے فارسی ادب میں گریجویشن کرنے کے بعد وہ شہر اور اس کے آس پاس کے قصبوں کے ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے اسکولوں میں پڑھانے لگے۔

گلشیری نے 1950 کے عشرے کے آخر میں کہانیاں لکھنا شروع کیا اور پھر اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ مل کر ''جُنگِ اصفہان'' نامی ادبی رسالہ نکالا جو تہران کے باہر کا سب سے اہم رسالہ بن گیا۔ 1968 میں گلشیری کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ ''مثل ہمیشہ'' شائع ہوا۔ اسی دور میں انھوں نے ادب پر پابندیوں اور سنسرشپ کے خلاف تحریک میں حصہ لیا اور ایرانی ادیبوں کی انجمن کے قیام میں شامل رہے۔ ان کا پہلا ناول ''شازدہ احتجاب'' 1969 میں اور دوسرا ''کریستین وکید'' 1971 میں شائع ہوا۔

1979 یعنی انقلاب کے برس میں گلشیری نے نقاد اور مترجم فرزانہ طاہری سے شادی کی جو ایک مشترک ادبی سرگرمی کی ابتدا ثابت ہوئی۔ انقلاب کے نتیجے میں وجود میں آنے والی اتنی ہی مطلق العنان حکومت نے سیاسی سنسرشپ کی پرانی شاہی روایت پر معاشرتی سنسرشپ کی تہہ کا اضافہ کرنا شروع کیا تو گلشیری کا گھر ادب کے مطالعے اور تدریس کا مرکز بن گیا۔ اس دوران انھوں نے اپنے ناول اور کہانیوں کے مجموعے شائع کرنا بڑی دشواریوں کے ساتھ جاری رکھا۔ ان کتابوں میں ''نمازخانۂ کوچک من''، ''برۂ گمشدۂ راعی''، ''معصوم پنجم''، ''درولایت ہوا''، ''جبہ خانہ''، ''حدیث ماہی گیر و دیو''، ''آینہ ہای دردار'' اور ''پنج گنج'' شامل ہیں۔ آخرالذکر کتاب ایران سے نہیں بلکہ سویڈن سے شائع ہوئی، جس سے ان دنوں کے حالات کا کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ایک اور ناول جسے، اس کے اسلوب کی بنا پر، ہوشنگ گلشیری سے منسوب کیا جاتا ہے، ''شاہِ سیاہ پوشان'' ہے جس کے اوراق سان فرانسسکو میں مقیم ایرانی اسکالر عباس میلانی کو 1990 میں ایران سے ڈاک کے ذریعے موصول ہوئے۔ اس ناول کو انھوں نے انگریزی میں ترجمہ کر کے *King of the Benighted* کے عنوان سے شائع کیا، جس کے سرورق پر مصنف کے طور پر منوچہر ایرانی کا فرضی نام درج تھا۔

1990 کے عشرے کے دوران گلشیری نے اپنی تحریروں کی اشاعت کا کام تقریباً موقوف کر کے اپنی پوری توجہ فکر اور اظہار کی آزادی پر لگائی جانے والی پابندیوں کے خاتمے کی تحریک پر مرکوز کر دی۔ اس کے ردعمل میں سرکاری ٹیلی وژن پر گلشیری کی بے عزتی کی گئی اور دائیں بازو کے اخباروں نے ان پر بیرونی طاقتوں سے روابط رکھنے کے الزامات لگائے۔ گلشیری کو متفقہ طور پر ممتاز ترین ایرانی فکشن نگاروں میں شمار کیا جاتا تھا، لیکن اس کا مطلب یہ بھی تھا کہ قبل از اشاعت سنسر کے دوران ان کی تحریروں کی نسبتاً زیادہ سختی سے جانچ کی جاتی تھی۔ اس ناگوار عمل سے بچنے کی خاطر انھوں نے اپنا آخری ناول ''جن نامہ'' بھی 1998 میں اسٹاک ہوم سے شائع کرایا۔ یہ وہ دن تھے جب ایران میں سیکولر دانشوروں کے سلسلہ وار قتل کی وارداتیں جاری تھیں۔ قتل کی اس خوفناک لہر کی زد میں آنے والوں میں کئی ادیب، مثلاً محمد مختاری، محمد جعفر پوینده اور مجید شریف بھی شامل تھے۔ انٹیلی جنس کی وزارت کے ایجنٹوں کی چلائی ہوئی اس لہر نے ایرانی رائے عامہ کو سخت مشتعل کر رکھا تھا۔ (بعد میں عدلیۂ اسلامی کی تحقیقات کی رو سے اعلان کیا گیا کہ ان وارداتوں میں بدمعاش عناصر ملوث تھے جن کا سرغنہ ایک سینئر اہلکار سعید امامی تھا، جو کچھ عرصہ پہلے جیل میں پراسرار حالات میں ہلاک ہو چکا تھا۔) 15 دسمبر 1998 کو محمد مختاری کی تدفین کے موقعے پر گلشیری نے جو تقریر کی، اور جسے بی بی سی کی فارسی سروس نے پورے ایران میں اور بیرون ملک ایرانیوں کے لیے نشر کیا، وہ انتشار زدہ حکومت کے خلاف سرکشی اور بچی کھچی اور محصور ایرانی ثقافت کے حق میں ایک پکار کا درجہ رکھتی تھی۔ اس دوران گلشیری کی صحت بہت گر چکی تھی اور وہ 5 جون 2000 کو انتقال کر گئے۔

اس ناول میں شہزادہ احتجاب کا فرضی کردار جس شاہی خاندان کے آخری افراد میں سے ایک ہے وہ ایران کا قاجار خاندان ہے جس نے اٹھارویں صدی کی قبائلی لڑائیوں سے ابھر کر 1785 میں تخت طاؤس پر قبضہ کیا۔ اس خاندان کی حکمرانی 1925 تک قائم رہی جب اس کی فوج کے ایک قازق نژاد افسر رضا خان نے، برطانیہ کی شہ پر، آخری قاجار شاہ کو معزول کر دیا۔ نئے شاہی خاندان نے قدیم فارسی نام ''پہلوی'' اختیار کیا اور 1979 کے مذہبی انقلاب کے ہاتھوں معزول ہوا جب شیعہ مذہبی پیشواؤں نے، جن کے طبقے کو پروان چڑھانے میں قاجار اور پہلوی شاہوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا، شاہی کے ادارے کے خاتمے کا اعلان کر دیا۔

ڈیڑھ صدی پر محیط قاجار شاہی کا دور زراعت کے جمود، بے آئین اور مطلق العنان حکمرانی، مذہبی نفاق اور یوروپ کی بڑھتی ہوئی مداخلت سے عبارت تھا۔ اگرچہ اس شاہی خاندان کے بنیاد گذار آغا محمد کا عضوِ تناسل اس کے دشمنوں نے کاٹ ڈالا تھا، لیکن اس کے بیٹے فتح علی شاہ نے اس محرومی کی تلافی کرتے ہوئے ایک وسیع و

Scanned with CamScanner

عریض شاہی گھرانہ اور مستقل دربار قائم کیا۔ اس نے ایران کے مختلف علاقوں کے علاوہ گرجستان (جارجیا) اور قفقاز (کاکیشیا) تک سے عورتیں لا لا کر اپنے حرم میں جمع کیں اور 1834 میں اس کے مرنے کے بعد اس کے پس ماندگان میں کوئی ساٹھ بیٹے اور چالیس بیٹیاں شامل تھیں

یوروپ کی پیش قدمی سے بیک وقت مسحور اور خوفزدہ ہو کر فتح علی کے اخلاف نے ایک جدید انتظامیہ اور فوج قائم کرنے کی غیر متواتر کوششیں کیں۔ ناصر الدین شاہ (1896-1831) نے، جس کا ذکر اس ناول میں ''جدِ اعلیٰ'' کے نام سے آتا ہے، خود کو اتنا مستحکم کر لیا تھا کہ اسے ایران اور برطانیہ میں ہم رتبہ بادشاہ کا درجہ دیا جاتا تھا۔ اس نے ایران کے وسائل کو ترقی دینے کے لیے مشتبہ یوروپی تجارتی مفادات کو ملک میں در آنے کی اجازت دی لیکن ملک میں بڑھتی ہوئی قوم پرستی کی لہر کے دوران وہ ایک قاتل کی گولی کا نشانہ بن گیا۔ 07-1905 کے دستوری انقلاب اور اس کے ایک برس بعد ہونے والی ایک ناکام فوجی بغاوت نے قاچار خاندان کی حکمرانی کو بہت کمزور کر دیا یہاں تک کہ 1925 میں رضا خان کے ہاتھوں اس کا خاتمہ ہو گیا۔

ایران کی تاریخ کے یہ واقعات اس ناول میں پس منظر کی دھندلی پرچھائیوں کے طور پر موجود ہیں۔ یہ پرچھائیاں شہزادہ احتجاب کے نیم تاریک کمرے کے کونوں میں بھٹکتے سایوں اور اس کے الجھے ہوئے ذہن سے گزرتے ہوئے مبہم تاثرات کی صورت میں سامنے آتی ہیں۔ لفظ ''قاچار'' پورے ناول میں ایک بار بھی استعمال نہیں کیا گیا۔ جہاں تک پہلویوں کا تعلق ہے، جو ایران کے تخت پر قبضہ کرنے کے بعد قاچار دور کے امرا کو ان کی زمین اور جائیداد سے محروم کرنے پر تلے ہوئے تھے، ان کا ذکر شہزادے کی پھپھیوں کی زبان سے محض ''یہ لوگ'' کے الفاظ میں کیا گیا ہے۔ ہمیں ان واقعات کے پیش آنے کے مقام کے طور پر اصفہان کا پتا اس اشارے سے چلتا ہے کہ اس شہر کے وسط سے ایک دریا گزرتا ہے جس کے کنارے پر قحط کے شکار لوگ ایک نیم مردہ گدھے کا خون پیتے دکھائے گئے ہیں۔ تاریخ بیحد خفیف اشاروں کے ذریعے اپنی جھلک دکھاتی ہے جو ذرا سی عدم توجہ سے نظر انداز ہو سکتے ہیں: اصفہان کے شاہی چوک سے گزر کر اپنی سزائے موت کی طرف جاتے ہوئے بابی قیدی جن کے زخموں میں جلتی ہوئی موم بتیاں لگا دی گئی ہیں، بگھی چلانے والے مراد خان کا تارکول کی سڑک پر گرنا اور گھوڑے کے سموں تلے اس کی ٹانگ کا کچلا جانا، گلی میں نکل کر احتجاج کرنے والوں کے ہجوم کا بکتر بند گاڑیوں اور مشین گنوں سے قتل عام، جیپ پر سوار ہو کر ہرنوں کا شکار، کیمروں کی کھینچی ہوئی اولین تصویریں، تمباکو، افیون، قمار بازی، ایکسرے، الکحل، دوربین، گلی میں کھمبوں پر لگی روشنیاں۔ کہانی کا زمانۂ حال بیسویں صدی کے وسط کا وہ دور ہے جب ایران میں پہلی آٹوموبیل گاڑیاں آ چکی تھیں اور امریکیوں کی آمد (کینیڈی انتظامیہ کے دور

Scanned with CamScanner

سے لے کر) شروع ہونے کو تھی۔

کہانی کے پس منظر میں، اور شہزادے کی چندھیائی ہوئی آنکھوں اور اس کے کمرے کی دیواروں پر ٹنگی گردآلود تصویروں میں جدید اصفہان کی دو ممتاز شخصیتوں کی پرچھائیاں جھلکتی دکھائی دیتی ہیں: ناصر الدین شاہ کا بڑا بیٹا مسعود میرزا (جس کا لقب ''ظل السلطان'' تھا) اور انیسویں صدی کے اصفہان کا طاقتور اور غیر محتاط مذہبی پیشوا آیت اللہ نجفی۔

1850 میں ایک تبریزی کنیز عفت السلطنہ کے بطن سے پیدا ہونے والے ظل السلطان کو اپنی ماں کے نچلے طبقے سے تعلق کے باعث تخت کی وراثت سے محروم کر دیا گیا تھا۔ اس کی تلافی کے طور پر اسے مختلف صوبوں میں حاکم مقرر کیا جاتا رہا جن میں اہم ترین تعیناتی اصفہان کی تھی جو 1865 میں ہوئی۔ جاہ پسندی، آمریت اور آزادروی اس کے مزاج کی خصوصیات تھیں۔ اس نے شہر کی بعض نفیس ترین یادگاریں محض اس خدشے سے تباہ کروادیں کہ کہیں اس کا باپ (شاہ ایران) اپنے دار السلطنت کو تہران سے وہاں منتقل کرنے کا ارادہ نہ کرے۔ کم از کم ایک موقعے پر، 1879 میں، اس وقت کے برطانوی قونصل کے بیان کے مطابق، اس نے شہر میں غلے کی ذخیرہ اندوزی کی تاکہ بھوکوں مرتی ہوئی آبادی سے من مانی قیمت وصول کر سکے۔ آخرکار انگریزوں سے ساز باز کے شبہے میں اسے تمام عہدوں سے برطرف کر دیا گیا لیکن وہ اپنی زندگی اور اصفہان شہر سے 1907 کے دستوری انقلاب تک چمٹا رہا۔ اس کی توانائی، سفاکی اور شکار سے انتہائی رغبت کے ضمن میں اس کا ذکر ناول میں ''داداحضور'' اور ''بڑے شہزادے'' کے طور پر آتا ہے۔ (''شہزادہ احتجاب'' میں اگر کسی تاریخی شخصیت کا ذکر نام لے کر کیا گیا ہے تو وہ فاطمہ سلطان انیس الدولہ ہے جو ناصر الدین شاہ قاچار کی بڑی ملکہ اور اس کے حرم کی سربراہ تھی۔)

اصفہان کے بازار اور گلیوں میں ظل السلطان کا حریف شیخ محمد تقی (1846-1914) تھا جسے عرف عام میں آیت اللہ یا آقا نجفی کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا، لیکن ناول میں اس کا ذکر محض ''آقا'' کے نام سے کیا گیا ہے۔ ناول میں ان دونوں کرداروں کی رقابت کا نقطۂ عروج وہ منظر ہے جو قتل کی ایک حقیقی واردات سے قریبی مماثلت رکھتا ہے۔

ظل السلطان کے بیٹے اکبر میرزا صارم الدولہ (1885-1975) نے جون 1907 میں اپنی ماں مونس السلطنہ کو قتل کر دیا تھا۔ وصیت کے سلسلے میں جھگڑا ہونے پر اس نے اپنی ماں پر بدچلنی اور آقا نجفی کے چھوٹے بھائی آقا نوراللہ کے ساتھ ناجائز تعلقات کا الزام لگایا۔ مونس السلطنہ نے آقا کے پاس پناہ لی جس نے اسے اس کی شادی شدہ بیٹی کے گھر بھجوادیا۔ لیکن صارم الدولہ تعاقب کر کے اپنی ماں تک جا پہنچا اور اس پر تین گولیاں

Scanned with CamScanner

داغیں جن میں سے ایک نے اس کے پھیپھڑے کے پار ہو کر اسے ہلاک کر دیا۔ تاہم یہ جرم اس کے آگے چل کر ایران کے وزیر مالیات بننے کی راہ میں رکاوٹ نہ بنا، اور اسی حیثیت میں اس نے لارڈ کرزن سے مذاکرات کر کے 1919 میں ایک معاہدہ کیا جس کا جھکاؤ انگریزوں کے اور خود اس کے مفادات کی جانب اس قدر واضح تھا کہ تہران کی پارلیمنٹ نے اس کی توثیق سے انکار کر دیا۔ صارم الدولہ پہلوی حکمرانی کے تقریباً خاتمے تک زندہ رہا اور 1975 میں پیرس میں فوت ہوا۔

اس ناول میں جس گروہ کا کہیں ذکر نہیں ملتا وہ انگریز ہیں جن کا سایہ ایران کی جدید تاریخ پر دیو کی طرح چھایا ہوا ہے۔ ہندوستان میں اپنے تجارتی اثاثوں کی طرف جانے والے راستوں کے تحفظ کی خاطر ان کی طے شدہ پالیسی برصغیر کے گرد اپنی مطیع ریاستوں کا حلقہ قائم کرنے کی تھی۔ انیسویں صدی کے وسط تک انگریز جنوبی ایران میں قدم جما چکے تھے اور شمال میں مقیم تعیش پسند قاجار حکمرانوں کے خلاف سازشوں کا جال پھیلا چکے تھے۔ ہمیں یہ تو معلوم ہو جاتا ہے کہ ''دادا حضور'' کو فخرالنسا کے باپ معتمد میرزا کو ہلاک کر پانے سے پہلے ہی اقتدار سے محروم کر دیا جاتا ہے، لیکن یہ نہیں بتایا جاتا کہ اس کا سبب 1887 میں ظل السلطان کی طرف سے انگریزوں کے اعزاز گرینڈ کراس آف دی اسٹار آف انڈیا کو قبول کرنا تھا۔ جہاں تک امریکیوں کا تعلق ہے، اتفاق کی بات ہے کہ ''شہزادہ احتجاب'' کی اشاعت کے کچھ ہی عرصے بعد ہزاروں امریکی فوجی اصفہان میں وارد ہوئے اور پہلویوں کی ایرفورس کو تربیت دینے اور عارضی طور پر قائم کیے ہوئے شراب خانوں میں غم غلط کرنے لگے۔ انگریزوں کی طرح انھوں نے بھی اپنا کوئی نشان نہیں چھوڑا۔

''میں نے کسی شہزادے کو کبھی دور سے بھی نہیں دیکھا،'' گلشیری نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا۔ ان کا کہنا تھا کہ شہزادہ احتجاب کی تشکیل ان کے مطالعے کی بنیاد پر ہوئی اور ایک شاگرد سے گفتگو کی بنیاد پر جو شہزادوں کے گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ تاریخی ماخذوں میں سب سے نمایاں ''تاریخ مسعود'' نامی کتاب ہے جو ظل السلطان کے سفر، شکار اور صوبائی حاکم کے طور پر کی جانے والی سرگرمیوں کی یادداشتوں پر مشتمل ہے اور جس کی سنگی طباعت 1907 میں کی گئی تھی۔ انھی یادداشتوں کا ذکر ناول میں ''سفرِ مازندران'' نامی اس مخطوطے کے طور پر آتا ہے جسے فخرالنسا نے بیاہ کر آنے کے بعد شہزادہ احتجاب کے بے ترتیب کمرے میں پایا تھا۔ گلشیری نے بتایا کہ ''تاریخ مسعود'' انھوں نے مخطوطے کی شکل میں اصفہان کی خیابان چہار باغ پر واقع میونسپل کتب خانے میں پڑھی تھی۔ صارم الدولہ نے اپنے پشتینی مکان باغِ نو میں موجود ساری کتابیں اس کتب خانے کو عطیہ کر دی تھیں۔

Scanned with CamScanner

''اس ناول کی فضا کو تشکیل دینے کا ایک اور ذریعہ نمائش پر رکھے جانے والے بعض قدیم نوادر تھے جن کی دید نے گلشیری کے ذہن پر گہرا اثر ڈالا: ناصر الدین شاہ کی کرسی، رضا خان کا عصا جس کی نوک ٹوٹی ہوئی تھی، اور پھر باغ نو کے باہر بنے ہوئے چبوترے۔ اس کے علاوہ، اگرچہ گلشیری نے اس کا ذکر نہیں کیا، اُن دنوں اصفہان کا بازار ان چھوٹی موٹی گھریلو چیزوں سے پٹا پڑا ہوتا تھا جنھیں معاشرتی زوال کی زد میں آئے ہوئے اشراف کے خاندان ایک ایک کر کے فروخت کر رہے تھے: لالہ کے گلدان، پرانی وضع کے پستول اور ریوالور، فانوس، پچکے ہوئے خود، یوروپی وضع کا فرنیچر، چینی مٹی کے برتن، کشمیر یا کرمان کی شالیں، افیون پینے کی چلمیں اور سیکڑوں اکڑے ہوئے فوٹوگراف (جن میں سے ایک، مجھے یاد ہے، ظل السلطان کے جلادوں کے سربراہ میر غضب کا تھا)۔ مختصر یہ کہ گلشیری کو شہزادہ احتجاب کا کمرہ وجود میں لانے کے لیے خیابانِ فروغی پر واقع اپنے گھر سے زیادہ دور جانے کی ضرورت نہ تھی۔

''تاہم ایرانی اشرافیہ سے گلشیری کے ابا کے باوجود اس ناول میں کسی مذمتی تحریر کا رنگ نہیں پایا جاتا، اور نہ تاریخ کے سبق کا۔ اس سے چراغ کے تیل کی بو نہیں آتی۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ راب گریئے (Robbe-Grillet) کے انداز کا، کرداروں سے تہی فکشن لکھنے کی امنگ رکھنے اور ایرانی جاگیرداری اور اب تک موجود اشرافیہ کے لیے کوئی ہمدردی نہ رکھنے کا دعویٰ کرنے والے ادیب نے اتنے دلچسپ کردار تخلیق کیے۔''

خسرو احتجاب میں، جو اپنی بیوی فخر النسا کے مرنے کے بعد اپنی گھریلو خادمہ فخری اور اپنے بیمار ذہن میں چکر کھاتی ہوئی ذاتی اور خاندانی یادوں کے ساتھ ایک شکستہ ہوتے ہوئے پرانے مکان میں رہ رہا ہے، کوئی ایک بھی نمایاں خصوصیت نہیں پائی جاتی۔ وہ نہ دلیر ہے، نہ ذہین، نہ مہربان، نہ تخجیع، نہ دولت مند، یہاں تک کہ زیادہ بدطینت بھی نہیں۔ اس کے باوجود پڑھنے والا اس کے انجام سے بے پروا نہیں رہنے پاتا۔ فخر النسا بھی، جو پہلے پہل ویسی ہی ہلاکت خیز ہیروئن معلوم ہوتی ہے جو صادق ہدایت سے لے کر اب تک کے جدید ایرانی ادیبوں کو اس قدر مرغوب رہی ہے، درحقیقت ایرانی فکشن میں ایک نیا اضافہ ہے: بازار میں ملنے والے مینیاتور (miniature) سے نکلی ہوئی سیاہ چشم حسینہ (قد جیسے سرو، مژگاں جیسے خنجر، بال سی باریک کمر، دل اڑا لے جانے والی زلف، وغیرہ)، لیکن وہ اپنی انفرادی تاریخ بھی رکھتی ہے۔ شادی کی شاہی سیاست اور افیون کی لت کا شکار ہو کر مرنے والے معتمد میرزا کی یتیم بیٹی، دودھ کی جگہ شکر کے ٹکڑے چوس کر، اپنی بوڑھی دادی کی نگرانی میں بڑی ہونے والی فخر النسا کے بچپن کو غیر متوقع نرمی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ ادھر شہزادہ احتجاب کی گھریلو خادمہ فخری اپنے طویل لمحے آئینے کے سامنے بسر کرتی ہے (جن کا احوال، گلشیری کے مطابق، ایک ہی بیٹھک میں تحریر کیا گیا)۔ ان تمام حساس تخلیقی تدبیروں کے زیر اثر ان کرداروں کا انسانی پہلو اتنا نمایاں ہو جاتا ہے کہ شہزادے کا

Scanned with CamScanner

اپنی بیوی اور خادمہ کے ساتھ ظالمانہ سلوک اس کے اسلاف کے ہاتھوں بہت سے لوگوں کے سر قلم کیے جانے سے کہیں زیادہ ناقابل برداشت محسوس ہونے لگتا ہے۔ ایرانی تاریخ کی ڈیڑھ صدیوں کو ایک خستہ حال صوبائی قصبے میں پیش آنے والے اس منظر میں سمیٹ دیا گیا ہے جہاں ایک عمر رسیدہ شخص اپنی گھریلو خادمہ کو پیٹ رہا ہے۔ جیسا کہ عباس میلانی کا کہنا ہے، اس سے پہلے کسی لکھنے والے نے ایران کے روایتی معاشرے کے سوز و درد کو اتنی خوبی سے گرفت میں نہیں لیا تھا۔

اس ناول کا بیانیہ بیک وقت سادہ بھی ہے اور تلمیحات سے پُر بھی۔ اس بیانیے میں سب سے زیادہ اور نہایت ہنر مندی کے ساتھ جس تدبیر سے کام لیا گیا ہے وہ بدلتا ہوا بیان کنندہ ہے۔ ایک جملے سے دوسرے تک پہنچتے پہنچتے راوی بدل جاتا ہے اور یہ طے کرنے کا کام پڑھنے والے کو کرنا ہوتا ہے کہ اس جملے کا 'میں' کون ہے۔ کہانی کے رفتار پکڑنے پر شہزادہ احتجاب کے الجھے ہوئے ذہن کے آسیبوں کے طور پر ماضی کے کردار ایک ایک کر کے دیواروں پر ٹنگے تصویروں کے چوکھٹوں سے باہر قدم رکھنے اور بیانیے میں شامل ہونے لگتے ہیں۔ یہ اسلوب اور اس کی امیجری سینما کی تکنیک سے بہت ملتی جلتی ہے، اور یہ تعجب کی بات نہیں کہ اس ناول کو اتنی کامیابی سے فلم کی صورت دی جا سکی۔ ناول کا ایک نہایت پر اثر منظر قید خانے کا ہے جس میں مصنف کے ذاتی تجربے کی جھلک بھی محسوس کی جا سکتی ہے۔ پہلوی یا ان کی جگہ لینے والے اتنے ہی مطلق العنان انقلابی حکمرانوں کا براہ راست ذکر کہیں بھی نہیں آتا، لیکن گلشیری کی تخلیقی ہنر مندی کی کامیابی یہ ہے کہ بے لگام اقتدار کے مرکزی موضوع کی چھوٹ نہ صرف ان ایرانی حکمرانوں پر، دنیا کے دیگر خطوں میں ان جیسے دوسرے حکمرانوں پر بھی پڑتی ہوئی دیکھی جا سکتی ہے۔

(ناول کے اس تعارف کا بیشتر حصہ 2005 میں شائع ہونے والے انگریزی ترجمے *The Prince* میں شامل مترجم جیمز بوچن کے تحریر کردہ تعارف کی بنیاد پر کیا گیا ہے۔)

شہزادہ احتجاب اپنی اُسی آرام کرسی میں دھنسا بیٹھا تھا اور اپنے جلتے ہوئے ماتھے کو دونوں ہاتھوں میں تھامے کھانس رہا تھا۔ ایک بار اس کی خادمہ اور ایک بار اس کی بیوی اوپر آئی۔ فخری نے دروازہ آدھا کھولا، بتی کا بٹن دبانے ہی کو تھی کہ شہزادے کے فرش پر پیر پٹکنے کی آہٹ پا کر لپکتی ہوئی واپس نیچے چلی گئی۔ فخر النسا بھی آئی اور شہزادے نے دوبارہ فرش پر پیر پٹکے۔

اُس شام جب شہزادہ مڑ کر گلی میں داخل ہوا تو پیڑوں کے نیچے کے نیم اندھیرے میں اسے پہیوں دار کرسی دکھائی دی تھی، مراد اس میں اُسی طرح بوڑھا اور مڑا تڑا پڑا ہوا تھا، اور اس کے بعد اس کی بیوی نظر آئی جس کی صرف ایک آنکھ چادر میں سے دکھائی دے رہی تھی۔

''سلام۔''

عورت بھی بولی، ''سلام۔''

''مراد، پھر آ گیا؟ میں نے تجھے سو بار بتایا نہیں...''

''ہاں، شہزادے، مگر میرے معاملات درست ہونے کا نام ہی نہیں لے رہے ہیں۔ جب میں نے دیکھا کہ رات کے کھانے کو کچھ بھی نہیں ہے تو کہا، حسنی، چل کرسی نکال، شاید شہزادے کی مہربانی سے کام بن جائے...''

اس پر شہزادے نے جیب میں ہاتھ ڈال کر چند تومان [1] نکالے اور حسنی کے ہاتھ پر رکھ دیے تھے۔ مراد نے کہا تھا:

''خدا عمر اور عزت دے، شہزادے۔''

حسنی بھی بولی تھی، ''خدا آپ کا بھلا کرے۔''

پھر وہ پہیوں دار کرسی کو چلا کر لے گئی اور شہزادہ پسینے میں شرابور آگے بڑھ گیا اور جب تک اس نے چابی

---

[1] تومان: دس ریال۔

Scanned with CamScanner

سے دروازہ نہ کھول لیا، کرسی کے پہیوں کی چر چراہٹ اسے سنائی دیتی رہی۔

اس پر بھی شہزادے کو کسی بات کا احساس نہ ہوا۔ اس نے اپنی چھڑی اور ٹوپی فخری کو تھمائی، فخر النسا کے پوڈر لگے گال کو چوما اور اوپر چلا آیا۔ دروازہ بھیڑ کر وہ اسی طرح، اندھیرے میں، آرام کرسی پر بیٹھ گیا۔ فخری باورچی خانے میں چلی گئی، لیکن جب پایا کہ اس کے دل کو چین نہیں آ رہا تو اوپر آئی۔ شہزادے کے پیر پٹکنے کی آہٹ پاتے ہی وہ بھاگ کر اپنے کمرے میں چلی گئی اور آئینے کے سامنے جا بیٹھی۔ کان اوپر سے آنے والی ہلکی سے ہلکی آواز پر لگائے ہوئے تھی کہ شاید شہزادے کا مزاج بہتر ہونے کا کوئی اشارہ ملے اور وہ زینے سے اتر کر آواز دے:

''فخری!''

اس پر فخری اٹھتی، رومال سے سر ڈھانک کر اور پیش بند[2] باندھ کر میز پر کھانا لگاتی۔ پھر جب شہزادہ ہاتھ دھو کر پونچھتے ہوئے پکارتا:

''فخر النسا!''

تو وہ سر سے رومال کھول کر پیش بند کی جیب میں ٹھونس لیتی، لباس بدلتی اور آئینے کے سامنے بیٹھ کر جلدی جلدی اپنے چہرے پر پوڈر لگاتی، بالوں میں کنگھی کرتی اور کھانے کے کمرے میں جا کر شہزادے کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ جاتی۔ کھانے کے بعد جب شہزادہ اوپر چلا جاتا تو فخری برتن اکٹھے کر کے دھونے لگتی اور فخر النسا چہرے پر پوڈر لگا کر لپکتی ہوئی خواب گاہ میں چلی جاتی۔ نصف شب کو شہزادہ اندر آتا اور آہستہ سے کہتا:

''سو گئیں، فخر النسا؟''

لیکن اُس رات شہزادے کا حال ہر رات جیسا نہ تھا۔ وہ اپنی آرام کرسی پر، اسی کرسی کی طرح بے حرکت بیٹھا تھا۔ بس کبھی کبھی کھانسی سے اس کے کندھے لرزنے لگتے اور وہ پیشانی کو دونوں ہاتھوں میں اتنے زور سے تھام لیتا کہ اسے پیشانی کی رگیں صاف محسوس ہونے لگتیں۔ اور تب کہیں وہ دادا حضور اور دادی حضور، ابا حضور اور اماں حضور اور پھپھیوں اور یہاں تک کہ فخر النسا تک کی سرزنش کرتی نظروں کو اپنے ذہن سے جھٹک پاتا۔

---

[2] پیش بند: ایپرن۔

Scanned with CamScanner

شہزادہ سمجھ گیا تھا کہ یہ وہی آبائی بخار ہے جس نے ٹھیک اپنے وقت پر اسے آلیا ہے۔ لیکن اس نے خود کو، اس کمرے کی طرح جو جگہ جگہ سے قدیم چیزوں سے خالی ہوتا چلا گیا تھا، اس کھانسی اور بخار کے سامنے سپر ڈالنے نہیں دیا تھا۔

پورے کمرے میں سیلن کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے پیروں تلے قالین تھا۔ شہزادے کے پورے بدن نے اس آبائی آرام کرسی کے صرف ایک ذرا سے گوشے کو بھر رکھا تھا۔ اسے اپنے نیچے کرسی کا وزن اور ٹھوس پن محسوس ہو رہا تھا۔ جھینگروں کی مسلسل آواز کسی تار کی طرح تھی جس کا سرا رات کی گہرائی میں گم ہوتا چلا گیا تھا۔

شاید وہ باغیچے کے پیڑوں کے نیچے اگی گھاس پھوس میں چھپے ہوئے ہوں گے یا... میں نے کہا، ''فخری، پردے کھینچ دے۔ میں سڑک کی ان لعنتی بتیوں میں سے ایک کو بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔'' فخری بولی، ''شہزادہ جان، کم سے کم کھڑکیاں تو کھولنے دیجیے کہ کچھ تازہ ہوا اندر آئے۔''

شہزادہ چلایا، ''تو چپ رہ! وہی کر جو کہہ رہا ہوں۔''

فخری نے پیش بند باندھ رکھا تھا۔ ہاتھ میں جھاڑو تھی۔ سر پر وہی پھولدار رومال، وہی سیاہ اور زندہ آنکھیں، اور وہی کھلا ہوا منھ۔ اس کے دانتوں کی قطار ٹیڑھی تھی اور سفید۔ بولی، ''اچھا، اتنی تو اجازت دیجیے کہ ان تصویروں کے چوکھٹے صاف کر دوں۔''

''نہیں، کوئی ضرورت نہیں، سمجھ میں آیا؟ تیرا کام صرف دوسرے کمروں کی دیکھ بھال کرنا ہے۔''

فخرالنسا کا دہن کیسا چھوٹا سا تھا! اتنا چھوٹا کہ جب ہنستی تو صرف چند سفید دانت دکھائی دیتے۔ وہ اسے اوپر سے، اپنی عینک کے موٹے شیشوں میں سے دیکھا کرتی۔ اس کی گردن کے تیکھے خطوط کبھی ختم نہ ہوتے، سیدھے شانوں کے خطوط میں مل جاتے اور وہاں سے دونوں ہاتھوں تک پہنچتے جن کی پشت کبھی اس کے جالی دار پیراہن کی آستین سے ڈھکی ہوتی کبھی نہ ڈھکی ہوتی۔ بولی، ''شہزادے، یہ سب کیا پھیلاوا ہے؟ کچھ صفائی ستھرائی کرو۔ یا نوکروں سے کہو...'' اس نے اپنی لمبی سفید انگلی گھوڑے کی ایال پر پھیری۔ سفید گھوڑا تھا جس پر قہوے کے رنگ کے دھبے تھے۔ اس کی انگلی کی کھینچی ہوئی لکیر ایال سے شروع ہو کر دم تک پہنچی۔

فخر النسا چار گھوڑوں والی بگھی کے پاس کھڑی تھی، وہی سفید جالی دار پیراہن پہنے جس میں سینے پر چنٹیں پڑی ہوئی تھیں، اور اپنی انھیں آنکھوں کے ساتھ جو اس کی عینک کے موٹے شیشوں کے پیچھے سے دیکھتی تھیں یا نہیں دیکھتی تھیں۔ پھر بولی:

''فخری، تیرے پاس ماچس ہے؟''

فخری نے اپنے پیش بند کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور کہا، ''یہ لیجیے۔''

فخر النسا بولی، ''خود جلا دے۔''

یہ کہہ کر فانوس کی طرف اشارہ کیا، بے شک، اپنے اسی ہاتھ سے جو چنٹوں دار آستین سے باہر نکلا ہوا تھا۔ فخری نے فانوس روشن کیا۔ فانوس کی تمام شمعوں کو روشن کیا۔ کیسی روشنی! اور فخر النسا... اس کی تو پلک تک نہ جھپکی۔ بولی، ''شمع دان بھی جلا دے۔'' پھر اشارہ کیا، اپنے اُسی ہاتھ سے... یا شاید نہیں کیا۔ میں نے کہا، ''یہ کیا، فخر النسا؟'' بولی، ''کیوں، کیا ہوا، شہزادے؟'' اس کی آنکھیں دکھائی نہ دیتی تھیں... کبھی ٹھیک سے دکھائی نہ دیتی تھیں۔ شعلے اس کی عینک کے شیشوں میں کپکپا رہے تھے۔ اس نے بغل میں دبائی ہوئی کتاب کو طاقچے پر رکھ دیا۔ اپنے دامن کو ہاتھ میں تھامے ہوئے تھی۔ اِدھر اُدھر بکھری ہوئی چیزوں میں سے راستہ بناتی ہوئی بڑھی، دادا حضور کا گھڑیال اٹھایا اور اسے چابی دینے لگی۔ ٹک ٹک کی آواز آنے لگی۔ اس نے پہلے دادا حضور کے گھڑیال کو اور پھر جیبی گھڑیوں کو چابی دی۔ کہنے لگی، ''فخری، کھڑی دیکھ کیا رہی ہے؟ آ کر میرا ہاتھ بٹا۔'' فخری اس کی مدد کرنے لگی... میں بھی کرنے لگا۔ دادا حضور کے گھڑیال نے گھنٹہ بجایا، اونچی اور صاف آواز میں۔ پیادہ سپاہی اس میں سے باہر نکلے، پانچ تھے، لمبے، چڑھی ہوئی مونچھوں والے۔ سینے پر ہاتھ رکھ کر تعظیم میں جھکے اور پھر اندر ہٹ گئے۔ فخر النسا بولی، ''ملاحظہ فرمایا، شہزادے؟ یہ حضورِ انور کی خدمت میں یقیناً روسی ناظم الامور نے پیش کیا تھا۔'' اس نے انگلی سے گھڑیال کے نچلے حاشیے پر سے گرد صاف کی۔ میں نے کہا، ''فخر النسا، میں پاگل ہوا جا رہا ہوں۔'' وہ سب سوئیاں ان گھڑیوں کے ڈائلوں پر حرکت کر رہی تھیں۔ ان کی ٹک ٹک ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی اٹھ رہی تھی۔ پھر بندوقیں اٹھائے ہوئے سپاہی باہر نکلے۔ فخر النسا ہنسی۔ اس نے زمین پر پیر مار کر فوجی سلامی دی۔ اس کی عینک پھسل کر ناک پر آ رہی تھی۔ وہ پھر ہنسنے لگی۔ اس کی آنکھیں، بے شک، آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھیں۔ اس نے جھک کر اپنی رانوں پر

Scanned with CamScanner

ہاتھ مارے۔ اس کی دونوں چوٹیاں سینے پر جھول رہی تھیں۔ پستان گول تھے۔ ہنسے جا رہی تھی۔ اس کی ہنسی کی آواز اس تمام ٹک ٹک کے اوپر سنائی دے رہی تھی۔ فخری بھی ہنس رہی تھی۔ مگر بس اس کے موٹے ہونٹ ہلتے دکھائی دے رہے تھے۔

فخر النسا کی تیوری پر بل پڑ گئے تھے۔ اس کے ہاتھ میں ایک طلائی ساغر تھا۔ وہ جھکی اور ساغر کو شہزادے کی آنکھوں کے سامنے لے آئی۔

"دیکھو، شہزادے۔"

شہزادے نے دیکھا۔ ساغر کے بدن پر ایک برہنہ عورت بال بکھرائے دکھائی دے رہی تھی۔ ہاتھ میں سیب لیے ہوئے تھی۔ ایک بیل پر لگے دو پتوں نے اس کے پستانوں کو ڈھانپ رکھا تھا۔ اس کے پیٹ اور رانوں پر گرد کی تہہ جمی تھی۔ فخر النسا بولی:

"فخری جان، ایسے دو ساغر نکال کر میز پر رکھ دے۔"

شہزادہ بولا، "آخر، یہ..."

"دیکھنا چاہتی ہوں ان میں شراب کیسا مزہ دیتی ہے۔"

اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ بولی، "بھرا ہوا ہے؟"

شہزادہ بولا، "معلوم نہیں۔"

فخر النسا نے کہا، "دیکھتے ہیں۔ لڑکی، ذرا مجھے دے..."

یہ کہہ کر فخری کے پیش بند کی جیب میں ہاتھ ڈال کر رومال نکال لیا۔ پہلے پستول کی نال پر سے گرد صاف کی اور پھر... کہ شہزادہ بولا:

"لیلیٰ کو ہاتھ نہ لگانا۔"

کہنے لگی، "کیوں شہزادے، ڈر لگتا ہے؟"

یہ کہہ کر تیوری چڑھائی۔ عینک اب بھی اس کی ناک پر تھی۔ اس نے پستول کی نال دیوار کے رخ کر کے گرد جھاڑی اور اسے قندیل کے پاس رکھ دیا۔ پھر ہاتھ بڑھا کر دونالی بندوق اور کارتوسوں کی پیٹی ایک ایک کر کے اٹھائی اور صاف کی۔ پھر ہرن کے سینگوں پر سے گرد جھاڑی۔ عینک اتار کر ہاتھ میں لے لی۔ فخری اپنی خانم کے پیچھے، پیش بند کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑی تھی۔ فخر النسا نے

Scanned with CamScanner

مڑ کر شہزادے پر نگاہ ڈالی۔

''سترہ سال کی عمر تھی۔۔بے شک، جدِ اعلیٰ کے ہاتھ کا شکار کیا ہوا تھا۔''

پھر اونچی اور مردانہ آواز میں بولی:

''اب تک ہم نے ایسا عمدہ شکار نہ کھیلا تھا۔ بہت خوب ہوا۔ کسانوں نے تین شالیں اور دو گھوڑے پیش کیے اور تین سو تومان کی نذر گذاری۔''

یہ کہہ کر ہنسنے لگی۔ انگلی سے بلوریں پیالے پر چوٹ ماری۔ پیالے سے نکلنے والی کھنکھناہٹ اس تمام ٹک ٹک کے شور میں پانی کے گھونٹ کی طرح لگی... ٹھنڈے پانی کے گھونٹ کی طرح۔ اس نے پھر انگلی سے چوٹ ماری۔ اس بار زیادہ زور کی آواز نکلی۔ گھڑیوں کی سوئیاں حرکت میں تھیں، سست اور مطمئن، سینہ تانے اُن وقتوں کی طرف رواں دواں جب پیادوں، بندوق برداروں یا رقاصاؤں کو اپنی اپنی باری پر باہر نکلنا تھا۔ گھڑیوں کی ٹک ٹک پیالے کی کھنکھناہٹ پر غالب آ گئی۔ فخر النسا نے انگلی سے پھر چوٹ ماری... اسی لمبی سفید انگلی سے۔ بلور کی کھنکھناہٹ ان تمام آوازوں میں سے ابھری، تیزی سے بلندی پر پہنچی اور چاروں طرف پھیل کر ساری آوازوں پر چھا گئی۔ اس کے بعد صرف بلور کی آواز تھی جو رفتہ رفتہ دھیمی ہوتی گئی اور آخرکار گھڑیوں کی ٹک ٹک میں گم ہو گئی۔ میز پر چھوٹی تلواریں اور آہنی خود رکھے تھے۔ صدف کے بنے قلمدان بھی تھے۔ اس نے جدِ اعلیٰ کا خود اٹھا لیا۔ بولی، ''ذرا آگے آؤ، شہزادے، پہن کر دیکھو۔'' میں نے کہا، ''رہنے دو۔ رکھ دو اسے۔ ابھی دو دن ہوئے نہیں آئے ہوئے کہ یہ سب شروع کر دیا؟'' اس نے خود میرے سر پر رکھ دیا۔ اس نے میری آنکھوں تک کو ڈھانپ لیا۔ فخر النسا جھکی ہوئی تھی۔ آنکھوں پر عینک تھی جس کے پیچھے سے وہ مجھے دیکھ رہی تھی۔ بولی، ''تم پر ذرا بھی تو نہیں جچتا، شہزادے۔ کہیں قمر الدولہ[3] نے باغبان کے ساتھ تو نہیں... ہاں؟ تم میں تو اپنے اجداد کی شان و شوکت کا ایک ذرہ بھی نہیں۔'' میں نے کہا، ''بس نہیں کرو گی، فخر النسا؟''

اس نے آہنی خود میرے سر سے اتار کر میز پر رکھ دیا۔ الماری کے خانوں میں طرح طرح کی چیزیں بھری ہوئی تھیں۔ اس نے رومال ان پر مارا تو گرد اٹھی۔ کہنے لگی، ''نوکر اور نوکرانیاں کیا مر گئی تھیں؟'' میں نے کہا، ''میں نے حکم دے رکھا تھا کہ کوئی... '' چابی میرے پاس رکھی تھی۔ اس نے

---

3. قمر الدولہ: غالباً شہزادے کی ماں کو دیا گیا لقب۔

ٹھوڑی کے نیچے انگلی رکھ کر میرا سر اوپر اٹھایا۔ اس کی انگلی ٹھنڈی تھی، اس کے بدن کی طرح جو پورا سرد اور سفید تھا، کھنچا ہوا اور بے خون۔ پستان چھوٹے اور گول تھے اور بال نرم۔ کہا کرتی تھی، ''مجھے اندھیرے میں اچھا لگتا ہے، شہزادے۔ بستر پر آنے سے پہلے لیمپ یاد سے بجھا دینا۔'' میں نے اس کی طرف دیکھا، وہ نگاہ جمائے مجھے دیکھ رہی تھی۔ انگلی اب تک میری ٹھوڑی کے نیچے تھی۔ ''حکم دے رکھا تھا، ہاں؟ تو گویا اجداد کا خون اب تک تم میں باقی ہے۔'' میں نے کہا، ''کم از کم فخری کے سامنے تو...'' ہنسنے لگی۔ ''فخری سے ڈرتے ہو، ہاں؟ یہ تو زبان بند رکھنے والی لڑکی ہے، شہزادے۔'' اس نے فخری کے بالوں کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ فخری نے کندھے جھکا رکھے تھے۔ قالین پر بنے پھولوں کو دیکھ رہی ہوگی، بے شک۔ فخرالنسا بولی، ''فخری جان، کل جب تو ان سب چیزوں کی گرد جھاڑے گی تو تجھے بتاؤں گی کہ ان کو کس ترتیب سے رکھنا ہے۔ یہ ہفت دری[4] بہت چھوٹی ہے۔ کتابیں میرے کمرے میں پہنچا دینا۔'' کتابیں بھی میں نے وہیں چن رکھی تھیں، دیوار کے ساتھ۔ فخرالنسا نے اپنی انگلی سے ان میں ایک کتاب نکالی۔ کہنے لگی، ''سفرنامۂ مازندران! لیتھو کی چھپی ہوئی ہے۔ میں نے کس قدر کوشش کی تھی کہ کہیں سے یہ کتاب ہاتھ آ جائے۔ بابا مرحوم کو افیون کے دھویں کی ایسی لت تھی کہ جو کچھ ان کے پاس تھا، یا نہ تھا، سب بیچ ڈالا، اپنی کتابیں بھی۔ مگر تم...'' اس نے اپنی انگلی سے میرے بال جو، بے شک، پیشانی پر بکھرے ہوے تھے، پیچھے کیے اور کہنے لگی، ''میں تمھاری یہ کتاب ضبط کر لینا چاہتی ہوں، تمھیں منظور ہے؟''

فخری، جو اب تک اپنی خانم کے پہلو میں موجود تھی، بولی، ''خانم جان، موم بتیاں دھواں دے رہی ہیں۔''

اس نے کہا، ''بجھا دے، سب کو۔''

فخری نے بجھا دیں، ایک ایک کر کے۔ فخرالنسا بولی:

''فخری جان، بجلی کی روشنی جلا دے۔ مگر اپنی جگہ سے ہلنا مت۔ لڑکی، ان گلدانوں کو احتیاط سے اٹھا۔''

فخرالنسا کی سرد انگلیاں شہزادہ احتجاب کے کانوں، گالوں اور ٹھوڑی کو چھوتی ہوئی اس کے منھ

---

4 ہفت دری: سات دروازوں والا کمرہ۔ مرکزی کمرہ۔

Scanned with CamScanner

تک پہنچیں۔ شہزادے نے ان انگلیوں کو چوم لیا۔ وہ سرک کر اس کی ناک اور آنکھوں پر پہنچ گئیں۔ اس کی پلکیں مُندی ہوئی تھیں۔ ہلکے ہاتھ شہزادے کے کندھوں کو چھو رہے تھے۔ شہزادے نے اپنا ہاتھ بڑھا کر فخر النسا کے بالوں کی ایک لٹ کو چھوا اور بہت آہستہ سے ہاتھ پھیرتا ہوا اس کے سرے تک پہنچا۔ بال لمبے تھے اور شہزادے کو اپنا بازو دور تک پھیلانا پڑا۔ کوئی سرد بھاری سی چیز اس کے ہاتھ میں تھی۔ فخر النسا ہنسنے لگی، بولی، ''تم کس قدر سست ہو۔ آخر کب شروع کرو گے، ہاں؟''

یہ دادا حضور کا پستول تھا، بھاری اور سرد۔ کمرہ گھڑیوں کی متواتر ٹک ٹک سے بھرا ہوا تھا، اور ہر طرف سیلن کی بو، ادھ بجھی موم بتیوں کی چراندھ اور فخر النسا کی مہک، جو اُس طرف، اندھیرے میں کھڑی تھی۔ شہزادہ زور سے بولا:

''کاش میں نے کھڑکی کھول دی ہوتی، کم از کم یہ بو...''

وہ کھانسنے لگا۔ لیکن جانتا تھا کہ کتنی ہی زور سے کیوں نہ کھانسے، دروازوں اور کھڑکیوں میں جڑے شیشوں کو ہلا نہیں سکے گا۔ اسے پھر کھانسی آئی۔

شہزادہ احتجاب جانتا تھا کہ کچھ فائدہ نہیں، کہ یہ اس کے بس میں نہیں، کہ دادا حضور ہمیشہ، اسی سفید و سیاہ تصویر کے مانند رہیں گے: ٹھیک اس کھال کی طرح جس میں بھس بھر دیا گیا تھا؛ ایک ایسی پرچھائیں کی طرح جو اس سے دور لیکن ان تمام کتابوں، تصویروں اور ایک دوسرے کی تردید کرتی ہوئی روایتوں میں منڈلاتی رہے گی۔ وہ جاننا چاہتا تھا، اپنی خاطر اور فخر النسا کی خاطر، سمجھنا چاہتا تھا کہ اس کھال کے اندر، اور ان تصویروں کے سایوں اور روشنیوں کے پیچھے، اور ان کتابوں کی سطروں کے درمیان کیا ہے... زور سے بولا:

''مجھے کچھ کام کرنا ہے۔''

یہ کہہ کر پھر کھانسنے لگا۔ اور ان سب سپاہیوں، خواجہ سراؤں، پیادوں کے درمیان؛ باادب، باملاحظہ کی پکاروں اور حرم کی ان سب عورتوں اور کنیزوں کے درمیان جو حوض میں پانی اچھال اچھال کر آپس میں کشتی لڑنے میں مشغول تھیں... ننگی؟ جدِ اعلیٰ بے شک ہنس رہے ہوں گے، اور ان کا دل انور انبساط میں ہوگا... شاباش کے سکے اچھالتے ہوئے جن پر جھپٹنے کے لیے عورتیں اور کنیزیں ایک دوسرے سے الجھ رہی ہوں گی، زندہ اور سفید گوشت کے متحرک تودے، ہنستے ہوئے، ہانپتے ہوئے، کبھی

Scanned with CamScanner

کبھار کوئی بازو یا ٹانگ اس ڈھیر میں سے باہر نکلتی دکھائی دیتی۔ اور جب گوشت کا یہ ڈھیر منتشر ہوتا تو جدِ اعلیٰ پھر شاباش دیتے۔ اس طرف، ان سب کے پیچھے، دادا حضور کھڑے تھے... یا بیٹھے تھے؟ ایک پستہ قد اور فربہ، یا دراز قد اور دبلے بچے کی دھندلی سی شبیہ، کالے بالوں والا یا... اور آنکھیں؟ تلوار، کلاہ، چرمی جوتے اور چمکدار تکمے۔ اور اتالیق، وزیر اور مشیر۔ حاکم... معلوم نہیں کس ولایت کا۔ اور اگر کہیں موقع ہاتھ آتا، جب کوئی حاضر ہونے والا نہ ہوتا، یا آخوند[5] ذاتِ اقدس کے واسطے دعا کرنے، یا اُمرا پابوسی کا شرف حاصل کرنے نہ آرہے ہوتے...

"اگر کسی چڑیا کی آنکھیں نکال دی جائیں تو وہ کتنی دور تک اڑ سکتی ہے؟"

یہ کہہ کر وہ کھانسنے لگتے، اونچی آواز میں، دیر تک۔ سمجھ جاتے کہ اور بات نہ کر سکیں گے، اور دادا حضور کو اپنے تخت پر بیٹھا یا رام کیے ہوئے گھوڑے کی پیٹھ پر سوار، یا اس بے شکل، زندہ اور ہنستے ہوئے گوشت کے تودوں کے ڈھیر کے اُس طرف کھڑا چھوڑ دیتے۔

اور دادا حضور نے ہاتھ اٹھا کر اپنی مونچھوں کو تاؤ دیا، کھانسے اور اپنی تصویر کے چوکھٹے میں جنبش کی۔ جب گرد بیٹھ گئی تو شہزادے کو دادا حضور کا کسی قدر زرد پڑا ہوا چہرہ، پیشانی پر پڑی گہری لکیریں اور ٹھوڑی کے نیچے چربی کی دو تہیں دکھائی دیں۔ دادا حضور نے اپنی آستین پر سے گرد جھاڑی۔ ان کے شاہی چغے کا رنگ اڑ چکا تھا۔ تصویر کی پلیٹ پر پڑی ہوئی لکیر اب بھی دادا حضور کے بائیں کندھے کے پاس سے گزر رہی تھی۔ ان کے ہاتھوں کے سایہ دار اور بے رنگ خطوط رفتہ رفتہ واضح شکل اختیار کرتے معلوم ہو رہے تھے۔ لیکن شہزادے کو یہ خیال نہ آیا کہ کھڑا ہو جائے اور اُن دنوں کی طرح سینے پر ہاتھ رکھ کر بار بار کہے:

"بلہ، قربان!"

گھنی خاکستری بھنوؤں اور ان کے نیچے کی گوشت کی تہوں کے درمیان سے سیاہ پتلیاں شہزادے پر جمی ہوئی تھیں۔ ہاتھ، جو اَب گوشت اور رگوں کا ایک تودہ سا رہ گیا تھا، بڑھا اور الماری کے خانے پر رکھا چاندی کی موٹھ والا عصا اٹھا لیا۔ اپنے رومال سے موٹھ پر کی گرد صاف کی۔ ہونٹوں کی لکیروں کا رنگ اب تک اڑا ہوا تھا۔ دادا حضور کی کرسی شہ نشین کے اوپر رکھی تھی۔ یہودی نے اپنی عینک

---

[5] آخوند: مولوی۔

ٹھیک سے جمائی، منھ پر زبان پھیری، فرش پر جوتے گھسیٹتا ہوا آگے بڑھا اور دادا حضور کی کرسی کی طرف مچی ہوئی آنکھوں سے دیکھنے لگا۔ شہزادے نے جو دیکھا کہ دادا حضور عصا ہاتھ میں لیے اپنی کرسی کی طرف بڑھ رہے ہیں تو چلانے کو ہوا کہ ''بد یہودی! دادا حضور کے سامنے؟'' اور چاہا کہ اسے کمرے سے باہر نکال دے۔ یہودی نے اپنی چھدری داڑھی کو کریدا۔

''شہزادہ جان، اس کرسی کے انجر پنجر ڈھیلے ہو چکے ہیں۔ امت کی قسم، اسے تو ہاتھ لگاتے بھی مجھے ڈر لگتا ہے۔''

شہزادے نے کہا، ''او بے حیا، اگر دادا حضور کو پتا چل جاتا...''

''اب اگر ان نو دولتیوں میں سے کوئی آ نکلے تو...''

شہزادہ احتجاب جانتا تھا کہ یہ بات اس بد بخت یہودی کی سمجھ میں نہیں آنے کی کہ یہ اس کے بس میں نہیں، کہ آدمی پندرہ برس کی یادوں کو حقیر سکّوں کے عوض نہیں بیچ سکتا۔ مگر اب کہ دادا حضور اسی آبائی کرسی پر جا بیٹھے تھے اور ہفت دری، اپنے شہ نشین، اور کھڑکیوں دروازوں میں جڑے رنگین شیشوں اور دیواروں پر بنے گل بوٹوں اور یہاں تک کہ دیواری ستونوں کے دو طاقچوں اور ان میں لگے ہوئے آئینوں سمیت واضح صورت اختیار کر گئی تھی اور الماری کے خانوں میں پرانی قابیں اور رکابیاں چنی ہوئی تھیں، فانوس میں تمام شمعیں روشن تھیں، انگیٹھی میں خوش رنگ آگ جل رہی تھی اور اس میں سے جلتی ہوئی لکڑیوں کی وہی مانوس مہک اٹھ رہی تھی، اب وہ دادا حضور سے یہ کہہ سکتا تھا:

''باور فرمائیے، حضور کی یہ کرسی میرے لیے اس دولت سے کہیں زیادہ قیمتی ہے... یہ....'' کہ دادا حضور چلا کر بولے:

''کیا تم اس ایک چیز کو بھی نہیں چھوڑ سکتے تھے؟'' یہ کہہ کر انھوں نے عصا اوپر اٹھایا اور اسے یوں حرکت دی جیسے اپنے پوتے کی پنڈلی پر مار رہے ہوں۔ لیکن مارا نہیں۔ کہنے لگے:

''یہ ٹھیک ہے کہ میں نے بہت سی زمینیں بیچ کر تمھارے باپ کی حرمزدگیوں کا خرچ پورا کیا، مگر تم! تف ہے تم پر! دس ہزار تومان میں مجھی کو بیچ ڈالا!''

شہزادہ کہنا چاہتا تھا، ''میں نے عرض کیا، میں تو فقط...'' لیکن دادا حضور کی سمجھ میں نہ آیا کہ اب یہ ممکن نہیں رہا کہ بگھی پر سوار ہو کر شہر کی سڑکوں کی سیر کو روانہ ہو جایا جائے، کہ گھوڑے کو اور سائیس کو اور

گاڑی بان کو روٹی چاہیے، اور بوڑھا سائیس بھی خالی ہاتھوں سے گھوڑوں کی مالش نہیں کر سکتا بلکہ اسے اپنے بیوی بچوں کے منہ سے نوالہ چھین کر گھوڑوں کو کھلانا پڑتا ہے اور ہر صبح سویرے اس پرانی بگھی کو دھونا پڑتا ہے...

''تشریف لائیے، جناب شہزادے صاحب...''

گاڑی بان نے اپنی کلاہ ایک ہاتھ میں تھام رکھی تھی، دوسرا ہاتھ سینے پر تھا، اس حالت میں اس نے زمین تک جھک کر کلاہ تھامے ہوئے ہاتھ سے گاڑی کی طرف اشارہ کیا۔ گاڑی کے ہر حصے سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ شہزادہ یہ دیکھ کر ایک بار تو دنگ رہ گیا کہ مراد خان کی مونچھوں کی نوکیں جو برسوں سے اس کے دہن کے دونوں طرف لٹکی رہی تھیں، اب اس کے گالوں کی سمت اٹھی ہوئی تھیں۔

''تشریف لائیے، شہزادہ احتجاب...''

شہزادہ سوار ہوا اور خود کو نشست پر گرا دیا۔ مراد خان نے کلاہ کو سر پر رکھا اور آگے کی نشست پر بیٹھ گیا۔ اس نے گھوڑوں کو ہشکار کر چلایا اور بگھی باغ کے وسط سے گزرنے والی بجری کی سڑک پر دوڑنے لگی۔

''مراد خان، آہستہ چلاؤ!''

''گھبرائیے مت، شہزادہ جان!''

بگھی سڑکوں پر سے گزر رہی تھی۔ لوگ مڑ مڑ کر دیکھ رہے تھے۔ اور شہزادہ دیکھ رہا تھا کہ کس طرح گھوڑوں اور مراد خان کے منہ سے نکلنے والی بھاپ آپس میں گھل مل رہی تھی اور کس طرح مراد خان اپنی جھکی ہوئی کمر کو سیدھا کیے بیٹھا تھا اور گھوڑوں پر چابک برسا رہا تھا۔ گھوڑوں کی نعلیں سڑک کے تارکول سے ٹکرا کر آواز پیدا کر رہی تھیں۔

''ہش!''

چوراہے پر پہنچ کر مراد خان نے گھوڑوں کی لگام کھینچی۔ پھر شہزادے نے دیکھا کہ مراد خان جھک کر گر پڑا۔ گھوڑوں کے سم، بے شک، ٹھوکر کھا گئے ہوں گے۔ سڑک پر جمی ہوئی برف کی وجہ سے۔ وہ گھوڑوں کی ٹانگوں اور بگھی کے پہیوں کے ٹھیک درمیان میں گرا تھا۔ بگھی اب تک سڑک پر گھسٹ رہی تھی۔ وہ بالکل کراہا نہیں۔ صرف اتنا بولا:

Scanned with CamScanner

''کچھ نہیں ہوا،شہزادے۔گاڑی چلالوں گا۔''

اب شہزادہ احتجاب داداحضور کو بتانا چاہتا تھا کہ اس نے کیوں نوکروں کو لاتیں اور مکے مار مار کر نکال دیا تھا، حتیٰ کہ مراد کو بھی۔ بولا:

''میں اس کم بخت کی بیساکھیوں کی ٹھک ٹھک سن کر بالکل بیزار ہو چکا تھا۔''

داداحضور نے چلا کر کہا:

''اور پدر سوختہ، تم نے اسے نکال باہر کیا تا کہ وہ اِدھر اُدھر بیٹھ کر کہانیاں سنایا کرے کہ بڑے شہزادے نے، میں نے، کیا کیا کام کیے، کہ کس طرح اپنے ہاتھوں سے اپنی حرافہ ماں کو قتل کیا۔ میں حجتہ الاسلام، کہف مومنین و مومنات، کے گھر گیا تو آقا کے نوکروں نے کہا: ہم جا کر آقا کو اطلاع دیتے ہیں۔ وہ گئے اور واپس آئے اور مجھ سے، بڑے شہزادے سے، کہنے لگے: آقا نے فرمایا ہے کہ جو کوئی آقا کی توجہات کے سائے میں پناہ لے لے اسے... میں نے نوکر کے سینے پر ہاتھ رکھ کر دھکا دیا اور زنان خانے میں داخل ہو گیا۔ حوض کے گرد بیٹھی عورتیں چیخ مار کر اندر کمروں کی طرف بھاگیں۔ میری فاحشہ ماں بھی بھاگ کر کمرے میں گھس گئی اور دروازہ بند کر کے اس سے پیٹھ لگا کر کھڑی ہو گئی۔ جب تک آقا کے نوکر آ کر مجھ سے کہیں کہ آقا فرماتے ہیں... تب تک میں دروازے کا ایک رنگین شیشہ توڑ کر کئی گولیوں سے اس کو خاموش کر چکا تھا کہ اب نہ کوئی غلط کام کرے گی اور نہ آقا کی توجہات کے سائے میں پناہ لے گی۔''

شہزادہ ابھی پوچھنے ہی کو تھا کہ ''داداحضور، انھوں نے آقا کے گھر جا کر پناہ کیوں لی تھی؟'' کہ داداحضور لمبے لمبے قدم رکھتے ہوئے کمرے میں ٹہلنے لگے اور چاندی کی موٹھ والے عصا کو ہاتھ میں گھما گھما کر چلانے لگے:

''تم نے مراد کو اس کی لنگڑی ٹانگ سمیت کیوں نکال باہر کیا کہ اِدھر اُدھر بیٹھ کر کہانیاں سنایا کرے...؟''

''میں نے اسے پہیوں والی کرسی بنوادی تھی۔ اس کی عورت مری تو میں نے اس کے لیے ایک اور عورت کا بندوبست کرایا جو بڑھاپے میں اس کا خیال رکھے اور وہ سکون سے ایک کونے میں بیٹھا رہے۔ لیکن بھلا قصہ یوں ختم ہوتا ہے! دوپہر سے کچھ پہلے اسی پہیوں والی کرسی پر سڑک سے آ کر باغ

Scanned with CamScanner

کے وسط میں جم جائے گا۔ پھر حسنی، اپنی بیوی، کی مدد سے یہ ساری سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آ جائے گا، اور میں کرسی کے پہیوں کی چر چراہٹ سنتے ہی سمجھ جاؤں گا کہ پھر آ پہنچا۔ پھر کہے گا: ''شہزادہ جان، غلام رضا خان اپنی عمر آپ کو سونپ کر چل بسا۔''

دادا حضور نے کہا، ''غلام رضا خان؟''

شہزادہ بولا، ''آپ کو یاد نہیں آیا؟ حاجی صمصام کا بیٹا، فخر الزماں کا پوتا۔ آپ کا حقیقی عم زاد تھا۔ وہی جو صرف سلام کے دن شرف یاب ہوتا تھا۔ ہر وقت اپنی گھڑی کی زنجیر سے کھیلا کرتا تھا۔ بڑے شہزادے کے، آپ کے، سامنے سگریٹ سلگانے کی جرأت نہ کرتا تھا۔''

''ہاں ہاں!''

''گینگرین ہو گیا تھا اسے۔ پورا بدن سوج گیا تھا۔ چہرہ ایسا پھول گیا تھا کہ پہچاننا دشوار تھا۔ خدا اس کی مغفرت کرے، بڑی سخت موت پائی۔ پورے ایک سال بستر پر رہا۔''

دادا حضور نے اپنے عصا کو ہوا میں لہرایا:

''تو تم نے یہی باتیں پھیلانے کے لیے اسے نکال باہر کیا؟''

''نہیں، یہ بات نہیں۔ جب وہ تمام سگے اور سوتیلے چچازادوں اور چچازادیوں، خالہ زادوں اور خالہ زادیوں، پھپھی زادوں اور پھپھی زادیوں کے مرنے کی خبر پہنچا چکا تو میں نے کہا: چلو اب جان چھٹی۔ لیکن اگلے روز، ظہر کی اذان سے ذرا پہلے، پھر آ موجود ہوا۔ میں نے کہا: مراد خان، تم تھکے نہیں؟''

مراد خان نے اپنی مونچھوں کو دانتوں میں لے کر چبایا اور سر کے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ بولا، ''شہزادہ جان، آپ پر خدا کی رحمت...''

شہزادے نے کہا، ''ہاں؟''

مراد نے اپنی دونوں ٹانگوں پر ہاتھ پھیرا اور اپنے لیے سگریٹ بنایا۔

''آپ کو خبر ملی کہ حاجی تقی اپنی عمر آپ کو دے کر رخصت ہوا؟''

''حاجی تقی؟''

''پرچون فروش تھا۔ بازارچے کے نیچے دکان تھی۔ باخدا آدمی تھا، شہزادے۔ نمازِ شب کبھی قضا

نہ کی۔ کل رات سجادے پر ہی جان دی، کتنے سکون سے!''

شہزادہ بولا،''دادا حضور، غور فرمایا آپ نے؟ اگر کسی کی موت نہ بھی ہوئی ہو، تب بھی اسی طرح سڑک اور سیڑھیوں پر سے ہوتا ہوا آئے گا، سگریٹ بنائے گا اور قصے سنانے لگے گا:

''میں سواروں کے دستے میں شامل تھا۔ ہم نے اپنے اپنے گھوڑے پر زین ڈالی اور بندوقیں کندھوں پر لٹکا لیں۔ ہمیں کارتوسوں کی ایک ایک دو دو پیٹیاں دی گئیں۔ بڑے شہزادے نے کہا تھا: دیکھنا کہیں رعیت میں کسی کو نہ مار ڈالنا۔ گھوڑے دوڑاتے ہم چرتو یہ گاؤں پہنچے۔ چند سوار گاؤں کے باہر متعین کر دیے کہ کہیں بڑے چچا فرار نہ ہو جائیں۔ جب ہم نے جانچ لیا کہ کوئی مزاحمت نہیں ہوگی تب گاؤں میں داخل ہوئے۔ وہاں بھی کسی بندوقچی کا کوئی نشان نہ تھا۔ رعیت ساری اپنے دروازوں کے باہر کھڑی دیکھ رہی تھی۔ بڑے شہزادے نے چیخ کر کہا: 'ہٹ جاؤ سب لوگ! 'سب گھروں میں گھس گئے اور دروازے بند کر لیے۔ ہم گھوڑے دوڑاتے قلعۂ ارباب کے اندر پہنچ گئے۔ بڑے چچا استقبال کو سامنے آئے۔ ان کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ ہاتھوں میں کچھ کاغذات تھے۔ بار بار کہہ رہے تھے: برادرِ بزرگ، یہ رہے کاغذات، سارے کاغذات... مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ بس اتنی اجازت مل جائے کہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ اس گاؤں میں زندگی گزار لوں۔ بڑے شہزادے نے اپنی مونچھ کی نوک کو چبایا۔ وہ اپنے گھوڑے سے اتر آئے اور اس کی لگام مجھے تھما دی۔ سپاہی بڑے چچا کو کھینچتے ہوئے اندر کمرے میں لے آئے۔ ان کے بچوں اور دیہاتی بیوی کو بھی لایا گیا۔ بڑے شہزادے نے کہا: کتنے پلّے ہیں؟''

دادا حضور بولے،''میں نے یہ نہیں کہا تھا۔ میں جانتا تھا کتنے ہیں۔ میں نے کہا تھا: اتنے ہی میں تین بچے پیدا کر لیے، بددیہاتی!''

شہزادے نے کہا،'' ملکیت کے کاغذات بڑے چچا کے ہاتھوں میں تھے۔ بچے بھی، بے شک، اپنی ماں کا دامن پکڑ کر کھڑے ہوئے تھے۔ ایک سوار نے عورت کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ اور آپ نے مارا، الٹے ہاتھ کا تھپڑ اتنے زور سے بڑے چچا کے منہ پر مارا کہ وہ لڑکھڑا کر کمرے کے فرش پر گر پڑے۔ کاغذات ان کے ہاتھ سے چھوٹ کر پورے کمرے میں بکھر گئے۔ ایک سپاہی نے ان کے ہاتھ پیر باندھ دیے۔ آپ نے ایک تکیہ بڑے چچا کے منہ پر رکھ لیا اور اس پر بیٹھ گئے۔ مراد بتا رہا تھا۔''

دادا حضور بولے، ''اس نے مجھے پیغام بھجوایا تھا: یہ ساری جائیداد میرے باپ کا بھی ترکہ ہے۔ جیسے آپ ہیں ویسا میں بھی ہوں۔ یعنی دو ٹکے کی دیہاتن کا بیٹا، اور میری، بڑے شہزادے کی برابری!''

شہزادہ بولا، ''مراد بتا رہا تھا: جب حضرتِ والا شکار کے لیے نکلے تھے تو اس چرنو یہ گاؤں میں اس عورت سے متعہ کر لیا تھا۔ بعد میں عورت نے کہلوایا کہ اسے بچہ ٹھہر گیا ہے۔ حضرتِ والا نے چند گاؤں اس بچے کے نام کر دیے۔''

دادا حضور بولے، ''ابا حضور نے صرف مہینے بھر کے لیے اس سے متعہ کیا تھا۔''

شہزادہ بولا، ''مراد کہہ رہا تھا: بڑے شہزادے نے تکیے پر بیٹھے بیٹھے سگریٹ طلب کیا۔ میں نے اس دن تک بڑے شہزادے کو کبھی سگریٹ منھ سے لگاتے نہ دیکھا تھا۔ مجھے سخت ڈر لگ رہا تھا۔ ہاتھ کانپ رہے تھے۔ سپاہی کمرے کی دیوار کے ساتھ ساتھ کھڑے تھے۔ بڑے چچا کی بیوی کا منھ کھلا ہوا تھا۔ رو نہیں رہی تھی۔ بڑے چچا کے منھ سے اب بھی خرخراہٹ کی آواز نکل رہی تھی جب میں نے سگریٹ بنا کر بڑے شہزادے کو دیا۔ بڑے چچا اس وقت بھی ہاتھ پیر پٹک رہے تھے۔ میں نے سگریٹ سلگایا۔ بڑے شہزادے نے تکیے پر بیٹھے بیٹھے سگریٹ پیا اور اس کا دھواں نتھنوں سے خارج کرنا شروع کیا۔ بڑے چچا کا بدن اب تک جھٹکے کھا رہا تھا۔ میں نے ان کی ٹانگوں کو ہلتے ہوئے دیکھا۔''

میں نے پوچھا، ''اور ان کے ہاتھ؟ خون میں بھر گئے تھے؟''

بولا، ''میں نے دیکھا نہیں۔''

میں نے پوچھا، ''رسی کس کر باندھی تھی؟''

بولا، ''بالکل۔''

میں نے پوچھا، ''اور بچے؟''

بولا، ''دو لڑکیاں تھیں اور ایک لڑکا۔ ان کی آنکھیں سیاہ تھیں، شہزادے۔''

میں نے کہا، ''یہ تو معلوم ہے۔ بچے کر کیا رہے تھے؟''

بولا، ''پتا نہیں۔ میں نے دیکھا نہیں۔''

میں نے پوچھا، ''اور دادا حضور؟''

Scanned with CamScanner

بولا،''بتایا تو۔ میں متواتر انھیں کو دیکھ رہا تھا، تکیے پر بیٹھے سگریٹ پی رہے تھے۔''

میں نے پوچھا،''اور بڑے چچا کی بیوی؟''

بولا،''میرا خیال ہے رو رہی تھی۔ پھر آواز بند ہو گئی۔ شاید کسی سپاہی نے منھ بند کر دیا ہو گا۔''

میں نے پوچھا،''اور بچوں کے منھ بھی بند کر دیے؟''

بولا،''شاید۔''

میں نے پوچھا،''اور دادا حضور؟''

بولا،''وہ اسی طرح تکیے پر بیٹھے تھے۔ جب سگریٹ ختم ہونے پر آئی تو اس کے ٹکڑے کو بڑے چچا کے ہاتھ پر مسل کر بجھایا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ بولے:'کنویں میں پھینک دو ان سب کو۔' پہلے بڑے چچا کو پھینکا گیا۔''

میں نے پوچھا،''عمر کیا تھی؟''

بولا،''میرے خیال سے بائیس سال۔''

میں نے پوچھا،''پھر؟''

بولا،''پھر ان کی بیوی کو کنویں میں پھینکا۔ بچوں کو بھی پھینک دیا اور اوپر سے پتھر ڈال دیے۔''

میں نے پوچھا،''پھر کیا ہوا؟''

بولا،''کچھ نہیں۔ قلعۂ ارباب سے باہر نکلے۔ وہاں بڑے شہزادے نے رعیت کے ایک آدمی پر گولی چلائی۔ وہ قلعۂ ارباب میں گھس رہا تھا۔''

شہزادہ احتجاب نے دادا حضور کو دیکھا جو اپنی جواہرات سے مرصع کرسی پر بیٹھے تھے، سگریٹ کا دھواں ان کے نتھنوں سے باہر نکل رہا تھا اور اس کی راکھ وہ کندہ کی ہوئی راکھ دانی میں جھاڑ رہے تھے۔ اس نے دادا حضور کے عکس کو رہا کر دیا اور وہ اپنی تصویر کی طرح، رسمی پوشاک کے پیچھے جا بیٹھے۔ شہزادہ کھانسا۔

دادی حضور نے اپنے لمبے سفید عروسی پیراہن کی تہوں کو سمیٹ کر ہاتھ میں پکڑ لیا تاکہ تصویر کے چوکھٹے پر جمی ہوئی گرد اسے آلودہ نہ کر دے۔ جب وہ چوکھٹے سے باہر آئیں اور دیکھا کہ ان کا عزیز از جان پوتا ان کی طرف متوجہ نہیں تو پہلے انھوں نے اپنے پیراہن کی شکنیں درست کیں، پھر

Scanned with CamScanner

دادا حضور کی طرف نگاہ ڈالی۔ دادا حضور اب تک سگریٹ پی رہے تھے۔ اور دادی حضور، اگرچہ وہ اب بھی جوان اور چھریرے بدن کی تھیں، ایک آدھ بار اس طرح کھانسیں جیسے اپنے بڑھاپے کے دنوں میں کھانسا کرتی تھیں۔ شہزادہ احتجاب اپنی جگہ بیٹھا رہا، اس نے اٹھ کر ان سے یہ نہ پوچھا، ''دادی حضور، اگر اجازت ہو تو حکیم ابونو اس کو خبر کروں؟''

ابا حضور نے، جو اپنے کمیت [6] گھوڑے پر سوار ہو کر اسے دوڑا رہے تھے، جو یہ دیکھا کہ خسرو نے اب تک اٹھ کر دادی حضور کی دست بوسی نہیں کی، تو گھوڑے کی لگام کھینچی اور کود کر اتر آئے۔ کیا مراد بھی تھا وہاں؟ ابا حضور نے اپنے چابک کو زور سے اپنے چرمی بوٹوں پر مارا۔ شہزادہ احتجاب اب تک اپنی جگہ بیٹھا ہوا تھا۔ جلتی ہوئی پیشانی کو اس نے ہاتھوں میں تھام رکھا تھا۔ گھوڑے نے گردن گھما کر اِدھر اُدھر دیکھا، سم زمین پر مارے، ہنہنایا اور اپنے سامنے کے پیر ہوا میں اٹھا لیے۔ اس کی ایال نے تصویر کے پورے چوکھٹے کو گھیر لیا۔ پھر اس نے جست لگائی اور بگٹٹ دوڑتا ہوا تصویر کے پس منظر میں دکھائی دیتی نیچی پہاڑیوں میں اوجھل ہو گیا۔ صرف پہاڑیوں کی قطار کے اوپر گرد و غبار کا حاشیہ ہوا میں معلق رہ گیا۔

ابا حضور کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ ٹوپی ہاتھ میں لے رکھی تھی۔ بال پیشانی پر بکھرے ہوئے تھے۔ لباس شرابور تھا۔ کیا سچ مچ اتنی تیز بارش ہوئی تھی؟ ابا حضور کی اعزازی جھالریں ان کے لباس کے کندھوں پر جھول رہی تھیں۔ مغرب کا وقت ہو رہا تھا۔ پھپھیاں اور دادی حضور، جو سب کی سب دادا حضور کے گرد حلقہ کیے ہوئے تھیں، دادا حضور کا اشارہ پا کر باہر چلی گئیں۔ بڑی پھپھی نے ابا حضور کو کندھوں سے پکڑ رکھا تھا۔ دادا حضور بولے:

''اچھا، کہو کیا کہتے ہو!''

ابا حضور نے پیشانی پر پڑے بالوں کو پیچھے کیا، ٹوپی کو ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں لیا، اور کندھے کی جھالروں کو اتار کر جیب میں ڈال لیا۔

''سب ختم ہو گیا۔ استعفیٰ دے دیا ہے۔''

دادا حضور نے اپنے عصا کو مضبوطی سے تھاما، اسے ہوا میں گھمایا اور اس کی نوک ابا حضور

6 کمیت: سیاہی مائل سرخ (تیلیا) رنگ کا گھوڑا جس کی ایال اور دُم سیاہ ہو۔

Scanned with CamScanner

سینے پر ٹھونکی۔

''اچھا، اچھا، تو پھر ابھی تمھیں اس بدقسمت جگہ کو دو چار برس کے لیے چھوڑ جانا ہوگا تا کہ پلوں کے نیچے سے کچھ پانی بہہ جائے۔''

ابا حضور نے شہزادہ احتجاب پر نگاہ ڈالی جو ان کی ٹانگوں سے لگا کھڑا تھا۔ شہزادے کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔ ابا حضور کا ہاتھ ٹھنڈا تھا۔

''وہ کیوں؟ میں تو حکم کا پابند تھا۔''

''حکم کے پابند تھے؟ تو پھر تم نے خود پر ذمہ داری کیوں آنے دی؟''

''مجھے حکم تھا کہ کسی کو اس سڑک سے نہ گزرنے دوں۔''

دادا حضور کھانسے۔ بڑی پھپھی نمودار ہوئیں۔ خسرو کو صرف ان کا سر دکھائی دیا۔ بڑی پھپھی کی آنکھیں بالکل سفید تھیں۔ دادا حضور نے کہا:

''اچھا، پھر؟''

''پھر اچانک وہ لوگ آ گئے۔ کئی ہزار نفر تھے، شاید۔ مجھے صرف ان کے سروں کا سایہ دکھائی دیا اور ان کے کھلے ہوئے منھ۔ ان کے ہاتھوں میں لاٹھیاں اور ڈنڈے تھے۔ میں ڈر گیا۔''

دادا حضور پھر کھانسے۔ ان کے عصا کی نوک اب زمین پر تھی۔ دادا حضور نے اس کا سہارا لے رکھا تھا۔ ان کا رنگ زرد ہو گیا تھا۔ اپنی مونچھ کا سرا چبا رہے تھے۔ ابا حضور کا ہاتھ خسرو کے بالوں میں اٹکا ہوا تھا۔

''میں نے نہیں چاہا تھا کہ ایسا ہو۔ پہلے تو مجھے خیال تک نہ آیا تھا کہ لوگوں کے ساتھ یہ بھی ہو سکتا ہے، کہ انھیں اتنی آسانی سے ہموار کیا جا سکتا ہے۔ وہ جب چل پڑے تو گویا لہریں اٹھنے لگیں۔ ان کے ہاتھ، اور ہاتھوں میں پکڑے ہوئے ڈنڈے اور ان کے کھلے ہوئے منھ۔ میں نے حکم دیا: مشین گنوں کا فائر کھول دو! پہلے ایک سرسراہٹ سی ہوئی، پھر شور اٹھا اور اس کے بعد لوگوں کی لہریں پسپا ہونے لگیں۔ سروں کا سیاہ بادل دور ہوتا گیا۔''

دادا حضور نے کہا: ''اور بس؟''

ابا حضور بولے: ''میں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ہمارے پیچھے صرف کٹے

Scanned with CamScanner

ہوئے ہاتھ اِدھر اُدھر بکھرے پڑے تھے۔ شاید ان کی مٹھیوں میں لاٹھیاں اور ڈنڈے اب تک دبے ہوئے تھے۔''

دادا حضور پھر کھانسنے لگے تھے۔

''اچھا، تو اب پشیمان ہو رہے ہو؟''

وہ خسرو کی طرف دیکھ رہے تھے۔ شہزادہ احتجاب نے خود کو ابا حضور کی ٹانگ سے چمٹا لیا۔ ابا حضور کا ہاتھ اب بھی بیٹے کے بالوں میں تھا۔ دادا حضور بولے:

''یا صرف اس سے ڈر رہے ہو کہ کہیں تمھیں قید خانے میں نہ ڈال دیں؟''

اس کے آگے کھانسی نے انھیں بولنے نہ دیا۔ پھپھیاں آ گئیں، یہاں تک کہ دادی حضور بھی۔ دادا حضور اب تک کھانس رہے تھے۔ اور اب ابا حضور کمرے میں اِدھر سے اُدھر ٹہل رہے تھے۔ ٹوپی ہاتھ میں تھی اور چابک فرش پر قدموں کے ساتھ ساتھ گھسٹ رہا تھا۔

ابا حضور اپنی اسی سپاہیانہ وردی کی اوٹ میں تھے اور اس دھوئیں کے پیچھے جو چھلوں کی صورت ان کے منھ سے باہر نکل رہا تھا، یا ان عورتوں کی سرمہ بھری آنکھوں کے عقب میں، یا درختوں کے پیچھے۔ درختوں کے سائے نے بجری کی پوری سڑک کو ڈھانپ رکھا تھا۔ اس سے آگے اندھیرا اور بھی گہرا تھا۔ شاخوں اور پتوں نے سڑک پر جھک کر محراب کی شکل کی ایک راہداری بنا رکھی تھی۔ سبز رنگ کی محرابی راہداری۔ شہزادہ احتجاب نے، جسے سردی لگ رہی تھی، ابا حضور کو دیکھا جو سڑک کی بجری کو جوتے کی نوک سے ٹھوکریں مارتے ہوئے، نپے تلے قدموں سے اس راہداری کی طرف بڑھ رہے تھے۔ خسرو سڑک کے کنارے منڈیر پر بیٹھا ہوا تھا۔ اسے ابا حضور پر نظر جمائے رکھنے کے لیے سر کو اس قدر گھمانا پڑ رہا تھا کہ اس کی گردن دُکھنے لگی۔ لال اور سفید رنگ کی گیند اس کے ہاتھوں میں رہ گئی تھی۔ جب ابا حضور اس کے پاس سے لمبے اور نپے تلے قدم رکھتے ہوئے گزر کر آگے گئے تو اس نے گیند کو نہر میں اچھال دیا۔ بعد میں وہ ابا حضور کے قدموں پر نگاہ جمائے جمائے گیند اٹھانے کو جھکا تو اس نے ایک پھپھی کو، اپنا وہی لمبا سیاہ پیراہن پہنے، کھڑکی میں کھڑے ابا حضور کو دیکھتے ہوئے پایا۔

نہر میں جڑی کاشی کی ٹائلوں کا رنگ سبز اور سفید تھا۔ پھاٹک کے چرچرانے کی آواز آئی اور ابا حضور سڑک کے کنارے لگے درختوں کے درمیان مڑ گئے۔ نوکر پھاٹک تک گئے اور جب لوٹے تو

Scanned with CamScanner

ان کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا۔ دادا حضور نے، بے شک، کاغذ کو ہاتھ میں لے کر ایک نظر دیکھا اور پھر چیخ کر کہا: ”حرامزادو! کیا میرے پلنگ کے نیچے خزانہ گڑا ہوا ہے؟“ [7]

دادا حضور کے کھانسنے کی آواز کھڑکیوں سے باہر آ رہی تھی۔ وہ بیچ دری بیٹھے تھے۔ بڑی پھپھی اپ، سیاہ پیراہن کے دامن کو انگلیوں میں تھام کر سیڑھیوں سے نیچے آئیں۔

”خسرو! تمھارے ابا حضور کہاں ہیں؟“

شہزادہ احتجاب نے سڑک کے دوسری طرف درختوں کے جھنڈ کی طرف اشارہ کیا۔ پھپھی سیڑھیوں اور سڑک پر دوڑتی ہوئی شہزادے کے پاس تک آ گئی تھیں۔ وہ اسی طرح آگے بڑھ کر درختوں میں چلی گئیں۔ اور خسرو کو اس بار اپنی گیند نہر میں اچھالنے کی ضرورت نہ پڑی۔

شہزادہ احتجاب جانتا تھا کہ اب پھپھیوں کی باری ہے۔ اور پھپھیاں اپنے لمبے سیاہ پیراہنوں اور سفید آنکھوں کے ساتھ آئیں اور آ کر بیٹھ گئیں۔ شہزادے کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ جانتا تھا کہ پھپھیوں کی سفید و سیاہ تصویروں کے پیچھے بہت کچھ چھپا ہوا ہے۔ اگر وہ کوشش کرتا تو اُس طرف کے اندھیرے میں کوئی چیز پا سکتا تھا، شاید کوئی قیمتی چیز، جس کی مدد سے فخر النسا کو از سرِ نو بنا سکے، یا خود کو ہی۔ لیکن اب جب اس نے ان پھپھیوں کی آنکھوں کو اپنے قلم تراش سے چھیل دیا تھا اور وہ سب اتنی دور تھیں، اور ان کے بدنوں کی جلد ان لمبے سیاہ پیراہنوں میں چھپی ہوئی تھی... اس نے ان سب کو بہت پہلے ترک کر دیا تھا۔ ایک بار پھر وہ سیاہ اور پُر گو دیواریں شہزادے کے بالکل پاس سرک آئیں۔

”خسرو خان!“

”خسرو، اِدھر آؤ۔“

بڑی پھپھی بولیں، ”کسی شہزادے کو زیب نہیں دیتا کہ باغبان کے بیٹے کی پتنگ چھین لے۔“

شہزادہ پتنگ اڑانا چاہتا تھا۔ دو دیواریں دیمک کی کھائی ہوئی آنکھوں سمیت اس کے دونوں طرف بیٹھی تھیں۔ اور خسرو متواتر اس سوچ میں تھا کہ ان کے بیچ سے کیسے سرکے۔ ہوا تیز ہو رہی تھی۔ آسمان کی نیلی زمین پر پتنگ کے پروں اور دُم کے سرخ اور سبز رنگ کھل اٹھے تھے۔ اب وہ پھڑ پھڑا

---

[7] رضا شاہ نے آخری قاجار شاہ کو معزول کر کے اقتدار پر قبضہ کرنے کے بعد اگلے دو عشروں کے دوران قاجار امرا کی جائیداد اور مال و دولت ضبط کرنے کے معاملے میں بہت بے رحمی سے کام لیا۔

نہیں رہی تھی۔ باریک ڈور اس کے ننھے ہاتھوں سے پھسلتی ہوئی نکل رہی تھی اور پتنگ ہوا میں چڑھتی جا رہی تھی۔ اب پتنگ کا فقط سینہ دکھائی دے رہا تھا، پروں اور دُم کی پتلی جھالریں آسمان میں گم ہو گئی تھیں۔ باغبان کا بیٹا کھڑا ہوا تھا۔ اس نے آنکھوں پر ہاتھوں کا سایہ کر رکھا تھا۔ ہوا اتنی تیز ہو گئی کہ شہزادے کے نازک، بے خون ہاتھوں میں ڈور سنبھالنے کی طاقت نہ رہی۔ شہزادہ چاہتا تھا کہ باغبان کا بیٹا آ کر پتنگ کو نیچے اتارنے میں اس کی مدد کرے۔ ادھر بڑی پھپھی چلا رہی تھیں:

''خسرو خان، تمھیں شرم آنی چاہیے!''

شہزادے کے ہاتھ سے ڈور چھوٹ گئی۔ پتنگ اور چھوٹی ہوتی چلی گئی۔ اس کے پروں اور دم کا سرخ اور سبز رنگ آسمان میں گھل چکا تھا۔ باغبان کا بیٹا بھاگتا ہوا درختوں کے پیچھے اوجھل ہو گیا۔ شہزادہ احتجاب اسی طرح ہاتھوں میں سر تھامے بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ وہ کھانس نہیں رہا تھا۔

پہلے دادا حضور نے شروع کیا۔ ان کی کھانسی خشک اور طویل تھی۔ ان کے کندھے کھانسی کی شدت سے کانپ رہے تھے۔ شہزادے کو بڑے کمرے کی کھڑکیوں کے رنگین شیشوں کے لرزنے کی جھنجھناہٹ سنائی دی۔ اور وہ خود، جو بہت چھوٹا اور دبلا تھا، دادا حضور کی منقش کرسی کے برابر میں کھڑا تھا۔ اس کا ہاتھ ابا حضور کے ہاتھ میں تھا۔ ابا حضور نے جواہرات سے مرصع درباری چغہ پہن رکھا تھا۔ پہلو میں تلوار لٹکی ہوئی تھی۔ باقی لوگ ابا حضور کے برابر قطار میں اپنی اپنی جگہ کھڑے تھے، سگے سوتیلے عم زاد وغیرہ۔ کمرے کے اُس کونے میں گول داڑھی اور سیاہ یا سفید عمامے والے آخوند بیٹھے تھے۔ انھوں نے اپنے ہاتھ پیٹ پر باندھ رکھے تھے اور تسبیحوں سے کھیل رہے تھے۔ اس کے بعد پیادہ سپاہیوں کی قطار تھی جن کی مونچھیں لٹکی ہوئی تھیں اور سروں پر سیاہ بانات کی ٹوپیاں تھیں۔ سپاہی چاندی کی موٹھ والی لاٹھیوں کا سہارا لیے ہوئے تھے اور ساکت آنکھوں سے اپنے سامنے تک رہے تھے۔ شہزادے نے مڑ کر ابا حضور کے چہرے پر نگاہ ڈالی۔ اسے صرف مونچھوں کا سیاہ جھنڈ اور ان کی اٹھی ہوئی نوکیں دکھائی دیں۔

سامنے کے دروازے سے ایک دراز قد سپاہی ہاتھ میں سینی لیے داخل ہوا۔ سینی کشمیری شال سے ڈھکی ہوئی تھی۔ وہ حوض کے کنارے کنارے چکر لگا کر آگے بڑھ رہا تھا۔ حوض میں مچھلیاں تھیں؟

Scanned with CamScanner

فواروں کا پانی ہوا میں اوپر تک جا رہا تھا۔ دادا حضور کے سامنے پہنچ کر وہ جھکا۔ دادا حضور نے شال ہٹائی۔ سینی سونے اور چاندی کے سکوں اور منہ بند تھیلیوں سے بھری ہوئی تھی۔ دادا حضور نے ایک تھیلی اٹھائی۔ ایک سوتیلا عم زاد آگے بڑھا۔ اس نے دادا حضور کی دست بوسی کی۔ دادا حضور نے تھیلی اس کے ہاتھ پر رکھی اور کھانسنے لگے۔ کھانسی خشک اور طویل تھی۔ ہال کمرے کی کھڑکیوں میں جڑے رنگین شیشے جھنجھنانے لگے۔ آخوندوں کی تسبیحیں ان کی پیٹوں پر تھیں۔ سپاہیوں نے مڑ کر دیکھا۔ سینی والا سپاہی اب بھی دادا حضور کے سامنے کھڑا تھا۔ کھانسی پھر اٹھی۔ دادا حضور نے اپنی جیب سے سفید رومال نکالا اور منہ پر رکھ لیا۔ جب ان کے کندھے کانپ کر جھکے تو کھڑکیوں کے رنگین شیشے پھر جھنجھنائے۔ ابا حضور نے شہزادہ احتجاب کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ شہزادے نے پھر تسبیحوں کی طرف دیکھا۔ کھانسی کی خشک اور طویل آواز پھر ابھری تو شہزادے کو فانوس کی شاخوں کی جھنجھناہٹ سنائی دی اور لوگوں کی قطار منتشر ہونے لگی۔ شہزادہ اب دادا حضور کو دیکھ نہیں پا رہا تھا، لیکن ان کی کھانسی کی آواز اب بھی سنائی دے رہی تھی اور لوگوں کا ہجوم قدِ آدم آئینوں میں لاانتہا تک منعکس دکھائی دے رہا تھا۔

وہ اپنے دھنسے ہوئے گالوں سمیت عورتوں کے درمیان بیٹھا تھا۔ اماں حضور کا سر سیاہ اوڑھنی سے ڈھکا ہوا تھا جس کی گرہ ان کے گلے پر بندھی ہوئی تھی۔ اماں حضور کے سر کے دونوں طرف اور اوپر قطار میں دکھائی دیتی عورتوں کی آنکھوں کو دیمک چاٹ گئی تھی۔ اماں حضور عورتوں کے بیچ سے اٹھیں۔ ہاتھوں کو، جو اب تک ان میں سے ایک عورت کے کندھوں پر رکھے رہے تھے، اوپر اٹھایا کہ شاید شہزادہ احتجاب اپنی جگہ سے اٹھ کر ماں کے ہاتھ تھام لے۔ لیکن شہزادہ سر جھکائے اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ اماں حضور کے ہاتھ سفید تھے۔ ان چھوٹے چھوٹے ہاتھوں پر سبز رگیں دکھائی دے رہی تھیں۔ شہزادہ جانتا تھا کہ اب اماں حضور ایک ایک کر کے تصویر میں موجود ہر عورت کے چہرے پر نگاہ ڈال رہی ہیں۔ اماں حضور نے اپنے لمبے پیراہن کا دامن ہاتھ میں تھاما اور سیدھی دادا حضور کے سامنے آ کھڑی ہوئیں۔ پہلے تعظیم کر کے دادا حضور کی دست بوسی کی پھر دادی حضور کی۔

دادا حضور کی کھانسی پہلے سے زیادہ خشک اور بے آواز ہو گئی تھی۔ پھپھیاں بغیر آواز پیدا کیے آ جا رہی تھیں۔ حکیم ابونواس جوشاندے کی بو اور اپنے طویل لبادے کے ساتھ سبز محرابی راہداری میں سے آتا دکھائی دیا۔ اس کی پھپھی زاد فخر النساء اب تک اپنی تصویر کے چوکھٹے میں بیٹھی تھی۔ اس کے دہن کے

کونے میں ایک گل میخک [8] اٹکا ہوا تھا اور دامن پر چرمی جلد والی ایک بڑی کتاب دھری تھی۔ اس کی سفید اور لمبی انگلیاں کتاب کی جلد پر تھیں۔ داہنے ہاتھ میں اس نے اپنی نظر کی عینک تھام رکھی تھی۔

فخر النسا نے عینک کو اپنے سفید رومال سے صاف کیا اور دوبارہ آنکھوں پر لگا لیا۔ اٹھی۔ اپنے جالی دار سفید لباس کا دامن سمیٹا، اور کتاب کے اوپر سے، جواب گر کر قالین کے اِسلیمی [9] نقوش پر آ پڑی تھی، قدم اٹھاتی ہوئی نیچے اتر آئی۔ گل میخک کو اپنے دامن کے کونے سے نکال کر گلدان میں رکھ دیا اور اپنے بالوں کی لٹوں کو اپنی انھیں سفید لمبی انگلیوں پر لپیٹنے لگی۔ اور شہزادہ احتجاب، جو جانتا تھا کہ فخری کس قدر بے ڈھنگی ہے اور کس طرح اپنے بالوں کی دولٹوں کو پیشانی پر لہرانا بھول جاتی ہے، چلاّ اٹھا:

''اپنے ان موٹے ہونٹوں پر اس قدر سرخی مت لگا! تیری سمجھ میں یہ بات کیوں نہیں آتی کہ تجھے فخر النسا کی طرح سنورنا ہے۔ سمجھی؟ اور یہ تل ہونٹوں کے بائیں طرف ہونا چاہیے، تیرے گنوارو منھ کے اوپر نہیں!''

فخری رونے لگی اور اپنے چہرے کو، جو شہزادے کے تھپڑوں سے سنسنا رہا تھا، ہاتھوں سے ڈھانپ لیا۔ اس کے فربہ، پُرگوشت کندھے اس کی خانم کے پیراہن میں پھنسے ہوئے تھے۔

''شہزادے، آخر وہ ایک خانم تھیں، خانم۔ اور اگر میرے ہاتھ ایسے ہیں تو میں کیا کروں؟ فخر النسا کی انگلیاں پتلی اور لمبی تھیں۔''

شہزادے نے فخری کے آنسو پونچھے۔ اس کے موٹے اور بھدے ہاتھوں کو، جن سے صابن اور بھوسے [10] کی بو آ رہی تھی، اپنے سفید، بے خون ہاتھوں میں تھام لیا۔

''رنج مت کر۔ مجھے یہی ہاتھ پسند ہیں۔ یہی ہاتھ۔ تو کوشش کیا کر کہ تیری شکل فخر النسا جیسی بن جائے۔ بال کھول کر سینے پر ڈال لیا کر اور دولٹوں کو پیشانی پر چھوڑ دیا کر۔ ہر رات صدفی گلے والا جالی دار سفید پیراہن پہن لیا کر۔''

فخری نے شہزادے کے ہاتھوں کو کس کر پکڑ لیا۔ اپنے ہونٹ شہزادے کے ہاتھ کی جلتی ہوئی

---

8 گل میخک: کارنیشن کا پھول۔

9 اِسلیمی: Arabesque

10 بھوسے اور مٹی کا آمیزہ برتن مانجھنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔

Scanned with CamScanner

کھال پر رکھ دیے۔ وہ شہزادے کے سامنے گھٹنوں کے بل جھک گئی۔

''اور برتن؟ برتن کون دھوئے گا؟ اور کمروں کی جھاڑ پونچھ؟ کمروں میں جھاڑو کون دے گا؟''

شہزادہ فخری کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔ پھر اس نے اپنے انگوٹھے سے اس کے آنسو پونچھے جو اس کے گالوں پر لکیر بناتے ہوئے بہہ رہے تھے۔

''وہ فخری کا کام ہے۔ تم گھر کی مالکہ ہو۔ سمجھیں؟ برتن دھونا اور جھاڑو دینا فخری پر چھوڑ دو۔ جب میں اس کے کولھے پر چٹکی لوں گا تو وہ کھلکھلاتی ہوئی بھاگ کر باورچی خانے میں چلی جائے گی۔''

فخر النسا نے اپنا سنگھار مکمل کیا۔ گل میخک اب بھی گلدان میں تھا۔

پھپھیاں اپنے لمبے سیاہ پیراہنوں اور دیمک کی کھائی ہوئی آنکھوں سمیت بڑے شہزادے کے پہلو میں کھڑی تھیں۔ دادا حضور اپنی ہتھوں والی کرسی میں دھنسے بیٹھے تھے۔ ابا حضور آ کر بڑے شہزادے کے سامنے کھڑے ہوئے، پھپھیوں کو دیکھا، پھر قالین پر بنے پھولوں کو دیکھا، پھر بولے:

''مجھے رخصت ہونے کی اجازت مرحمت فرمائیے۔''

''کہاں؟''

دادا حضور کھانسے۔ ابا حضور بولے:

''میں اس رعیت میں اٹھنے بیٹھنے سے بالکل تھک چکا ہوں۔ اب اور میرے بس میں نہیں۔''

پھپھیوں نے ابا حضور کے کندھے پکڑ لیے۔ دادا حضور بولے:

''خوب! تھک چکے ہو؟ اپنی جاگیر کا انتظام کرنا تمھارے بس میں نہیں رہا؟ انھیں دیہات اور اسی رعیت سے تنگ آ گئے ہو؟ نوکری کرنے کا خیال ہے کیا؟ ٹھیک ہے، تمھاری مرضی۔ جو جی میں آئے کرو۔ جانا چاہتے ہو جاؤ۔ مگر یہ جان لو کہ اب سے تم میرے بیٹے نہیں ہو۔''

پھپھیوں نے کہنا شروع کیا:

''یہ ہمارے لیے بڑی شرم کی بات ہو گی اگر تم، بڑے شہزادے کی آخری امید، جا کر ان لوگوں[11] کی نوکری کر لو۔''

---

11 اشارہ غالباً رضا شاہ پہلوی کی طرف ہے۔

چھوٹی پھپھی بولیں، ''بھائی، ایسا مت کیجیے۔ کم از کم اس وقت جب... '' یہ کہہ کر انھوں نے دادا حضور کی طرف اشارہ کیا۔ ابا حضور نے مٹھیاں بھینچ لیں۔ پھر جب دیکھا کہ خسروان کی ٹانگ کے بالکل ساتھ کھڑا ہے تو ہاتھ بڑھا کر شہزادے کے نرم بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگے۔

''آخر، ابا حضور، زمین سے اب کچھ آمدنی نہیں ہوتی، آپ تو جانتے ہی ہیں... ''

دادا حضور نے اپنے عصا کے لیے ہاتھ بڑھایا جو بڑی پھپھی لیے کھڑی تھیں۔ چھوٹی پھپھی نے کہا:

''تو پیسے اور زیادہ آمدنی کے لیے آپ ان لوگوں کی نوکری کر لیں گے؟'' یہ کہہ کر وہ رونے لگیں اور سر بڑی پھپھی کے کندھے پر رکھ دیا۔ دادا حضور کھانسنے لگے۔ حکیم ابونواس ان کے سر کے پاس کھڑا تھا۔ کھانسی کا دورہ ختم ہوا تو بڑے شہزادے نے حکیم ابونواس کو پیچھے دھکیلا اور بولے:

''زمین کا اب کچھ فائدہ نہیں رہا؟ اس وقت جب تجھ ناخلف کی جان بچانے کے لیے میں نے ایک دیہہ دے دیا تھا، تب اس کا فائدہ تھا۔ جب تیری عیاشیوں کا خرچ اس سے پورا ہوتا تھا تب اس کا فائدہ تھا۔ اور جب میرے جانے کا وقت قریب ہے اور تجھے ذمہ داری اٹھا کر خاندان کا ستون بننا ہے، تو اس کا فائدہ نہیں رہا، ہاں؟''

''اجازت ہو تو کہوں، ابا حضور، میرا ارادہ یہ نہیں کہ... ''

''جا، دفع ہو جا۔ میرا بیٹا، بڑے شہزادے کا بیٹا، ان نودولتیوں کی نوکری کرے اور ان کا نشان اپنے سینے پر آویزاں کرے، تف ہے!''

شہزادہ احتجاب جانتا تھا کہ اب کے اماں حضور رو رہی ہیں۔ اس نے دیکھا کہ اماں اپنی جگہ سے اٹھ کر واپس تصویر کے چوکھٹے میں جا بیٹھیں اور اپنے آنسو خشک کرنے لگیں۔ ان کی تصویر کا پس منظر سفید ہو چکا تھا۔ دادا حضور پھر کھانسنے لگے اور رنگین شیشے پھر جھنجھنانے لگے۔ دادی حضور نہیں کھانس رہی تھیں۔ جوشاندے کی بو تمام کمرے، اور بڑے کمرے میں یہاں تک کہ بجری کی سڑک تک پھیلی ہوئی تھی۔ دادی حضور بولیں:

''شہزادہ جان، آپ کا بیٹا اب بڑا ہو گیا ہے۔ جانتا ہے کہ کیا کر رہا ہے۔''

بڑی پھپھی بولیں، ''فروغ سلطان، بہتر ہو گا کہ آپ... ''

Scanned with CamScanner

چھوٹی پھپھی نے بات پوری کی، ''کچھ نہ بولیں۔''

دادی حضور کھانسنے لگیں۔ انھوں نے رومال اپنے منھ پر رکھ لیا۔ ان کے کندھے لرز رہے تھے، پھر بھی اتنی بات انھوں نے ضرور کی:

''شہزادے، میرا ابھی ایک بیٹا باقی بچا ہے، اور آپ نے ان چڑیلوں کو اسے بھی...''

بڑی پھپھی بولیں، ''چڑیل، میں چڑیل ہوں؟''

چھوٹی پھپھی رونے لگیں اور سر بڑی پھپھی کے کندھے پر رکھ لیا۔

دادا حضور نے کہا، ''بس، تم چپ رہو۔'' اور اپنی کرسی کا ہتھا پکڑ لیا۔ سب چپ ہو گئے۔ اماں اپنی تصویر کے چوکھٹے میں بیٹھی رونے لگیں۔

گھوڑا پہاڑیوں میں سے نکل کر آ رہا تھا۔ اس کی زین اور ساز دھوپ میں چمک رہے تھے۔ وہ ہنہنایا۔ خسرو نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ شہزادے کا سر جھکا ہوا تھا لیکن اس نے دیکھ لیا کہ گھوڑا پچھلی دو ٹانگوں پر کھڑا ہو رہا ہے۔ اس کی ایال نے تصویر کی ساری پہاڑیوں کو ڈھانپ لیا تھا۔ سر پر بندھی پٹی کی جھالریں اس کی آنکھوں پر آ پڑی تھیں۔ مراد کی مونچھیں اس کے کانوں تک چڑھی ہوئی تھیں اور ان کا سایہ کھڑکی کے شیشوں اور قالین پر پڑ رہا تھا۔ ابا حضور بولے:

''مراد خان، گھوڑے پر زین ڈال دی؟''

خسرو بھی رونے لگا۔ شہزادہ احتجاب نے دیکھا کہ پھپھیاں ابا حضور کے گھوڑے کے پیچھے پیچھے شاخوں اور پتوں کی محرابی راہداری تک دوڑتی ہوئی گئیں۔ چار قزل[12] گھوڑے سیاہ بگھی کو کھینچ رہے تھے۔ گھوڑوں کی ایالیں اور دُمیں بھی سیاہ تھیں۔ بگھی پر پڑا ہوا مخملی غلاف بھی سیاہ رنگ کا تھا۔ مراد خان، بے شک، آگے والے گھوڑوں میں سے ایک کے دہنے کو تھام کر پیدل چل رہا تھا۔ شہزادہ احتجاب اور دادی حضور اور ابا حضور بگھی کے ایک نشیمن میں بیٹھے تھے۔ آئینوں میں ابا حضور کا چہرہ تنا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ بگھی کے اندر کی مخمل سرخ تھی۔ اس مخمل پر لگی ہوئی کلابتون کی جھالریں نرم تھیں۔ یہ دادا حضور کی بگھی تھی۔ اس کے آگے آگے سیاہ تابوت لوگوں کے سروں کے اوپر جھومتا چل رہا تھا۔ مراد خان نے چغہ پہن رکھا تھا اور کندھے پر سیاہ شال ڈال رکھی تھی۔ سیاہ شال ہی اوڑھے ہوئے

---

12 قزل: قرمزی یا سرخ رنگ۔

Scanned with CamScanner

سپاہی بگھی کے ساتھ ساتھ چلتے ہوے لوگوں کو پیچھے ہٹا رہے تھے۔ ابا حضور کے دستانے بھی سیاہ تھے۔ گھڑسوار سپاہی بگھی کے دونوں طرف چل رہے تھے۔ شہزادے نے کہا:

''مجھے نیچے اترنا ہے۔''

دادی حضور بولیں، ''گھوڑوں کے پیروں تلے آ جاؤ گے۔''

شہزادہ بولا، ''ٹھیک ہے۔ مجھے نیچے اترنا ہے۔''

ابا حضور نے خسرو کی کلائی کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ ان کے چہرے پر خفگی کے آثار تھے۔ ان کے چغے کے تکمے چمک رہے تھے۔ پورے راستے پر چھڑکاؤ کیا گیا تھا۔ لوگ دونوں طرف کھڑے تھے۔ عورتیں بھی بچوں کے ہاتھ پکڑے کھڑی تھیں۔ یہاں تک کہ درختوں اور بالا خانوں پر بھی لوگ تھے۔ گھڑسوار گھوڑے دوڑا رہے تھے۔ دادا حضور کو تابوت میں لٹا دیا گیا تھا اور ان پر کشمیری شال ڈال دی گئی تھی۔ وہ کھانس نہیں رہے تھے۔ ان کی مونچھیں لٹکی ہوئی تھیں اور چہرے کی جھریاں صاف ہو چکی تھیں۔ پیشانی چمک رہی تھی۔ صرف اماں حضور اور پھپھیاں رو رہی تھیں۔ چھوٹی پھپھی بڑی پھپھی کے کندھے پر سر رکھے رو رہی تھیں۔ سوار آ آ کر گزر رہے تھے۔ پھپھیاں پیچھے والی بگھی میں سوار تھیں۔ اماں اس سے بھی پیچھے والی بگھی میں تھیں۔ لوگ سڑک کے دونوں کناروں پر نہر اور درختوں کے پیچھے تک کھڑے تھے۔ دادی حضور نہیں تھیں۔ ابا حضور تھے اور اماں۔ اور پھپھیاں، پیچھے والی بگھی میں۔

مراد خان سیاہ مخملی پوشاک، سیاہ پتلون اور نرم چمڑے کے سیاہ دستانے، چمکتے ہوے بوٹ اور پوست کی کلاہ پہنے، گھوڑے کے دہنے کو تھامے پیدل چل رہا تھا۔ اس کے آگے لوگوں کا ہجوم تابوت گاڑی کے قدم سے قدم ملا کر چل رہا تھا۔ اماں رو رہی تھیں۔ دادی حضور کی بگھی آگے تھی۔ زمردی شال کے اوپر تین بڑے قدحے برف سے بھرے رکھے ہوے تھے۔ ان میں گلاب پاش بھی تھے۔ چار گلدان شال کے چاروں کونوں پر رکھے تھے اور دو گلدان قدحوں کے درمیان۔ قرآن کے سپاروں کا صندوق اوپر رکھا تھا، وہاں جہاں رحل بھی رکھے تھے۔ لوگ رحلوں پر یا اپنے دامنوں پر سپارے رکھے ان پر جھکے ہوے پڑھ رہے تھے، بے حرکت اور بے صدا۔ ان کے سر جھک جھک کر اٹھ رہے تھے۔ قرآن پڑھنے والے چالیس شاخوں والے بلوریں فانوس کے نیچے بیٹھے تھے اور ان کے سامنے پیتل کے عودسوز رکھے تھے۔ اس طرف کونے میں جہاں کوئی نہیں تھا، جنازے کے اونچے لیمپ اپنے

آویزوں اور پروں سمیت کھڑے تھے۔ ہوا نہیں چل رہی تھی۔ پروں کا رنگ سبز تھا یا سیاہ؟... سیاہ تھا۔
شہزادے کو صرف کچھ الجھی ہوئی اور سمجھ میں نہ آنے والی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ فانوس کی شاخیں ذرا بھی نہیں ہل رہی تھیں۔ اس کی ساری شمعیں جلادی گئی تھیں۔ ابا حضور نے شہزادے کی کلائی نہیں پکڑ رکھی تھی۔ شہزادے نے اپنے چغے میں لگے ہوئے تکموں کی طرف دیکھا، پھر بولا:

''اماں، مجھے اترنا ہے۔''

اماں نے کہا، ''اب تم بڑے ہو گئے ہو، بیٹے۔'' اور رونے لگیں۔ شہزادہ مراد خان کے برابر میں چل رہا تھا۔ آگے ابا حضور کی تابوت گاڑی چلتے ہوئے ہل رہی تھی۔ مراد خان بولا:

''سب کو جانا ہے، شہزادے!'' اس نے اپنے بوٹوں پر نظر ڈالی۔ ''تمھارے ابا حضور اچھے آدمی تھے، شہزادے۔''

شہزادے نے کہا، ''مجھے معلوم ہے۔''

شہزادہ احتجاب جانتا تھا کہ اب دادا حضور پھر اپنی تصویر کے چوکھٹے میں جا بیٹھے ہیں اور ابا حضور پھر اپنے گھوڑے کو دوڑاتے ہوئے پہاڑیوں کی سمت جا رہے ہیں۔ قاریوں کی آوازیں ایک دوسرے میں الجھ رہی تھیں۔ شہزادہ کھڑا رہا جب تک لوگ آتے اور جاتے رہے۔ ابا حضور کو دادا حضور اور دادی حضور کے پائینتی دفن کیا گیا۔ وہ سب سپاروں پر جھکے ہوئے پڑھ رہے تھے اور سپاروں والے لڑکے لوگوں کو نئے سپارے لا لا کر دے رہے تھے۔ قاری اونچی آواز میں پڑھ رہے تھے۔ پھپھیاں بہت مدت سے اپنی تصویروں کے چوکھٹوں میں بیٹھی تھیں۔ ان کی آنکھوں کی جگہ سوراخ بن گئے تھے۔ اماں حضور اب رو نہیں رہی تھیں۔ اور شہزادہ کھانس رہا تھا۔

دروازہ کھلا تو شہزادہ احتجاب کو پھولدار چادر کے چوکھٹے میں دو سیاہ آنکھیں دکھائی دیں۔ شہزادے نے کہا:

''فخر النسا کہاں ہیں؟''

چادر کھلی تو ترشی ہوئی ناک، سرخی لگے گال، مسکراہٹ اور دانت نظر آئے، اور پھر... شہزادہ بولا:

''میں نے کہا، لڑکی، فخر النسا کہاں ہیں؟''

Scanned with CamScanner

چادر کے اندر ایک ہاتھ نے تیزی سے پھر آنکھوں کے گرد چوکھٹا بنا دیا۔ آنکھیں سیاہ اور زندہ تھیں اور ان کی پتلیاں چمک رہی تھیں۔ لمبی پلکوں کے سائے چادر کے سرے تک پہنچ رہے تھے۔ دو لمبی اور گھنی بھنوؤں کی جھلک، اور سر کی ایک تیز حرکت سے زینے کے اوپر کی طرف اشارہ، اور شہزادہ نہ جانے کیسے زینے پر چڑھ کر اوپر جا پہنچا۔ فخر النسا اس کی طرف پیٹھ کیے، وہی چنٹوں والا جالی دار پیراہن پہنے بیٹھی تھی۔ دو لمبی گندھی ہوئی چوٹیاں اس کی کمر پر پڑتی نازک سلوٹوں تک پہنچ رہی تھیں۔ شہزادہ کھڑا رہا۔ شہزادے نے اس کے کندھوں کے نرم اور ہموار خطوط کا جائزہ لیا اور پھر اس کے دونوں بازوؤں کا جو اس کے پیراہن میں سے جھلک رہے تھے۔ جب اس کی نظریں کرسی کی پشت تک پہنچیں تو اس کی گردن کی سفید جلد اور اس پر بکھرے ہوئے بالوں پر جم کر رہ گئیں۔ فخر النسا اپنی گھومنے والی کرسی پر بیٹھی تھی۔ اس کے ہاتھ کے پاس ایک میز تھی۔ شہزادے کو پتلی شاخ والا بلوریں مینا دکھائی دیا اور پھر لمبے پایوں والے بلور ہی کے دو ساغر نظر آئے جن کے پاس دو قابوں میں گز اور خشک میوے رکھے تھے۔ بلور آدھا بھرا ہوا تھا۔ فخر النسا اب تک شہزادے کی طرف پیٹھ کیے بیٹھی تھی۔ شہزادہ آگے بڑھا۔ اس کی نازک گردن کے خط اور داہنے کاندھے پر پڑی سلوٹوں کی اوٹ سے اسے چرمی جلد والی ایک بڑی کتاب اور اس پر فخر النسا کی سفید اور لمبی انگلیوں کی جھلک دکھائی دی۔ فخر النسا نے ایک انگلی کتاب میں رکھ کر اسے بند کر لیا۔ گھومی اور اس سے پہلے کہ شہزادہ اور آگے بڑھ کر اس کی عینک میں سے جھانکتی، سرزنش کرتی نگاہ کو بھانپ سکتا، بولی:

''آیئے تشریف رکھیے، خسرو خان۔''

شہزادہ احتجاب نے چھت کی منڈیر اور اس کے پار کاج کے درختوں اور ان پر لگے مخروطی پھلوں کی طرف دیکھا اور پھر فخر النسا کی عینک کی طرف۔

''میں مخل نہیں ہونا چاہتا تھا، لیکن میں نے دیکھا...''

''ہاں، دیکھا کہ اب آپ تنہا ہیں، آپ کی والدہ وفات پا چکی ہیں، تو بہتر ہے کہ اپنی منگیتر کی کچھ خبر لے لی جائے۔ تشریف لایئے۔''

شہزادہ میز کے دوسری طرف رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''تو آپ کو میرے حاضرِ خدمت ہونے کی خبر تھی؟''

Scanned with CamScanner

فخر النسا نے مینا کا دستہ تھام لیا۔ جب وہ شراب کو ساغر میں انڈیل رہی تھی، شہزادے کو قمری کے چہچہانے کی آواز سنائی دی۔

''لیجیے، گھر کی کشید کی ہوئی ہے۔ میرا خیال ہے سات سال پرانی ہوگی۔ میں نے جلیل آباد سے منگوائی ہے۔''

شہزادے نے فخر النسا کے چہرے کے نازک مینیا توری نقوش پر نگاہ ڈالی جو بیک وقت اتنے نزدیک اور اتنے دور تھے، اور ٹھوڑی کے خط اور سفید ترشی ہوئی لمبی گردن کو دیکھا جو اس کے پیراہن کی چنٹوں تک پہنچ رہی تھی۔ لیکن اس سے پہلے کہ اس کے چھوٹے پستانوں کا جائزہ لے سکے جو اس کی سینے پر کی چنٹوں میں گم سے ہو گئے تھے، فخر النسا بولی:

''جلدی نہ کیجیے۔ ابھی بہت وقت پڑا ہے۔''

''ہاں ہاں۔''

شہزادے نے اپنا ساغر خالی کر دیا۔ شراب تلخ تھی اور جس وقت اس کے حلق سے نیچے اتر رہی تھی اسے اپنی پیشانی پسینے سے تر ہوتی محسوس ہوئی۔ شہزادے نے پوچھا:

''سات سال پرانی ہے؟''

''جی ہاں، وہی شراب ہے جو آپ کی والدہ مرحومہ کے حکم پر ہماری منگنی کے دن کشید کی گئی تھی۔''

شہزادے نے فخر النسا کی لمبی سفید انگلیوں کو دیکھا۔ اس کی چار انگلیاں میز کے سرے پر تھیں۔ اور دوسرا ہاتھ؟... شہزادہ سمجھ گیا کہ وہ اس وزنی کتاب کے نیچے ہے۔ اس نے پوچھا:

''یہ کیا کتاب ہے؟''

''ہمارے جدِ اعلیٰ کی یادداشتیں۔''

''اور آپ... آپ کو اس میں کیا پڑھنے کو ملا؟''

ایک بار پھر ان پانچ انگلیوں نے، جو پانچ مچھلیوں جیسی تھیں، بلوریں مینا کا دستہ تھام لیا اور ساغر میں سے پھر قمری کے چہچہانے کی سی آواز ابھری۔

''ایک اور نوش کیجیے۔ طبیبوں کا کہنا ہے کہ شراب بواسیر کے لیے...'' یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگی۔

Scanned with CamScanner

شہزادہ احتجاب نے ایک بار پھر ان لبوں کے کنارے پڑنے والی ان سلوٹوں اور اندر سے جھانکتی سفید چھوٹے چھوٹے دانتوں کی قطار کو دیکھا۔ بولا:

''بواسیر؟''

شہزادے کا حلق تلخی سے تر ہو گیا۔ گز کے رنگین کاغذی غلاف کو کھولتے ہوئے فخر النسا نے کہا:

''دیکھیے، اگر ہمیں ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھنا ہے تو یہیں سے شروع کرنا چاہیے، اپنے اجداد سے۔''

فخر النسا نے کتاب اوپر کی اور شہزادے نے پھر اس کے بائیں رخسار کے تل کے پاس پڑتی ہوئی سلوٹ کو دیکھا اور پھر پینے لگا۔

''باور کیجیے، ہمارے ان جدِ اعلیٰ کو اپنے بواسیرِ مبارک کے سوا کسی شے کی فکر نہ تھی۔ ایک روز خون آیا، دوسرے روز چیرا لگوانے کی ضرورت ہوئی، یا حکیم ابونواس نے سواری کی ممانعت کر دی، یا ایک روز جلاب دیے گئے یا اندر محل سرا میں، عملۂ خلوت کی نظر سے چھپا کر، شراب نوش کی تاکہ بواسیر کو آرام ہو۔ ہر جگہ بس یہی ذکر ہے۔''

''خوب، تو اس میں پڑھنے کے قابل کیا چیز ہے؟''

''جانتی ہوں، مگر یہی تو مشکل ہے: سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمارے بزرگوں میں سے ہر ایک کو اپنے مزاجِ مبارک، اپنے اندرونِ مبارک، اپنے بواسیرِ مبارک ہی کی فکر کیوں لاحق رہتی تھی۔ اور اگر یہ ذکر نہیں، یا کوئی ایسا نہ ملا جس کا گلا، مثلاً اسی آپ کے باغیچے میں، اِس کان سے اُس کان تک کاٹ ڈالا جائے، تو بس سوار ہوئے اور انھیں سب میر شکار اور منشی اور فراش اور پیش خدمت اور تفنگ دار اور ملا اور حکیم کو ساتھ لے، کوہ و صحرا کو نکل کھڑے ہوئے اور سرخ ہرن اور پہاڑی بکرے اور کالے تیتر اور خرگوش اور کس کس کی جان کے درپے ہو گئے۔ اور جب وہاں سے تھکے ہارے لوٹے تو ایک اور متعہ کر ڈالا۔ اور صبح ہوئی تو کسی کو خلعت سے نواز دیا، کسی کا سر قلم کروا دیا اور کسی کی املاک ضبط کر لی۔''

شہزادہ احتجاب نے ٹانگ پر ٹانگ رکھ لی۔ داہنا ہاتھ میز کے سرے پر رکھ کر اس کی ایک ایک انگلی کو گننے لگا۔ پھر بلوریں مینا کو اٹھایا کہ قمری کی صدا پھر سے سن سکے۔ فخر النسا نے کہا:

''شراب اچھی ہے۔''

Scanned with CamScanner

شہزادے نے پھر اپنی پیشانی کو پسینے سے تر ہوتا محسوس کیا۔ بولا:

''کیا یہ سب بے کاری کی وجہ سے نہیں تھا؟''

''بے کاری؟ ہرگز نہیں، بلکہ اس وجہ سے کہ اس وجودِ مبارک کو صبح سے رات تک ایک لمحے کی فرصت نہ تھی۔ کئی لاکھ رعایا پر حکمرانی کرنی ہوتی تھی اور ان سب عریضوں درخواستوں پر دستخط فرمانے ہوتے تھے، کوڑے لگوانے ہوتے تھے، سر قلم کروانے ہوتے تھے، ملازموں کی جائیدادیں ضبط کرنی ہوتی تھیں، سینوں پر ہاتھ رکھے ہاں ہاں کرتے ان تمام خوشامدیوں سے نمٹنا ہوتا تھا، ان سب کی جیبیں خالی کروانی ہوتی تھیں اور وہ بھی اس طرح کہ اپنا ایک پیسہ خرچ نہ ہو۔ یہ سب کم کام ہے؟ اور ان سب آخوندوں اور لاٹھیوں ڈنڈوں سے مسلح ان کے طلبا کو قابو میں رکھنا جو کان لگائے رہتے ہیں کہ کب آقا کسی کے واجب القتل ہونے کا حکم صادر فرمائیں۔ ان تمام باعفت مستورات کا خیال رکھنا اور انھیں مصروف رکھنا جو اندر محل سرا میں بند اس تاک میں رہتی ہیں کہ کوئی خواجہ سرا یا غلام بچہ ایسا دکھائی دے جائے جس میں تھوڑی بہت مردانگی موجود ہو۔ یہ سب کام نہیں ہے؟ ذرا خیال کیجیے، اکیلا آدمی اور اتنی باکرہ دوشیزائیں، اتنی مشکی چشم وابرو والی عورتیں، اتنے نوخط لڑکے جو حضورِ انور کو پیش کیے جاتے ہیں! اور اس پر یہ کم بخت بواسیر اور اس کی خونریزی اور اس سے بھی زیادہ کم بخت یہ حکیم ابونواس جس نے مجامعت کی بھی ممانعت کردی!''

اس نے شہزادے پر نگاہ ڈالی جس کا چہرہ تنا ہوا تھا۔

''اور آپ؟ آپ اس مقابلے میں کیسی کارکردگی دکھاتے؟''

''کیسا مقابلہ؟''

فخر النسا ہنسنے لگی۔ زور زور سے ہنسنے لگی۔ اس کے گالوں پر دونوں طرف پڑنے والی سلوٹیں اس کی تراشیدہ ٹھوڑی تک پہنچ رہی تھیں۔ اس کے دہن کے بائیں طرف کا چھوٹا سا تل ان میں چھپ گیا۔

''بہت بھولے ہیں آپ۔ وہی انوکھا مقابلہ جو ان جدِ اعلیٰ اور باقی تمام اجدادِ والا تبار کے مابین جاری تھا، یعنی زوجات کی تعداد اور قلم کردہ سروں کی تعداد کا مقابلہ۔ ان میں سے ہر ایک کا عزم تھا کہ اس کا حرم دوسرے کے مقابلے میں رنگین تر ہو اور...''

اس نے اپنی آنکھوں پر عینک درست کی۔ کتاب کے ورق پلٹے۔ عینک کے اوپر سے شہزادے

Scanned with CamScanner

کو دیکھا۔ اس کی ایک چوٹی اس کے بائیں پستان پر آ پڑی تھی۔

''اگر آپ چاہیں تو اس میں سے کچھ آپ کو پڑھ کر سناؤں؟''

شہزادے نے اپنا ساغر خالی کیا، ایک پستہ چھیلا اور منھ میں ڈال لیا۔ فخر النساء اب بھی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''کہیے، سناؤں؟''

وہ پڑھنے لگی:

''آج ہمارا مزاج اچھا نہیں تھا۔ ہانکے والوں نے ساری پہاڑیاں چھان لی تھیں۔ نوکر ملتمس ہوئے کہ سوار ہوں۔ ہم نے حکیم ابونواس کو بھی ساتھ آنے کا حکم دیا۔ عرض کیا گیا کہ ریچھ کو دیکھ لیا گیا ہے۔ موسم ٹھنڈا تھا۔ ہم اپنی صدری اور پوستین پہننا بھول گئے تھے پھر بھی ہم نے سفر جاری رکھا۔ علمدار خان میر شکار نے عرض کی کہ ہانکے والوں نے ریچھ کو زمین پر لٹا لیا ہے۔ ہم نے دیکھا کہ حکیم ابونواس ڈر رہا ہے۔ ہم نے فرمایا کہ وہ کمیں گاہ کو لوٹ جائے۔ ہم خود نوکروں کے ہمراہ پہاڑیوں کی طرف بڑھتے رہے۔ میر شکار نے عرض کی کہ گھوڑے سے اتر آنا بہتر ہوگا۔ ہم اتر آئے۔ چڑھائی شروع ہوگئی۔ نوکر پیچھے رہ گئے۔ اس عمر میں بھی ہم کوہ روی میں ان سے بہتر ہیں۔ کم بخت نان و نمک کی حرام خوری کرتے ہیں۔ اوپر پہنچ کر ہم ایک پتھر پر بیٹھ گئے۔ آقا بیک نے عرض کی کہ ریچھ ایک غار میں موجود ہے۔ ہم نے ایک بادام کے درخت کی اوٹ لے لی۔ نوکر بھی آ پہنچے۔ ان کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ آقا بیک نے ایک پٹاخہ غار کے اندر پھینکا۔ غار ہم سے تین ذرع[13] کے فاصلے پر تھا۔ ریچھ باہر آ گیا۔ بہت بڑا تھا۔ ہم نے اب تک اتنا بڑا ریچھ نہیں مارا تھا۔ ہم نے اپنی پندرہ نمبر کی فرانسیسی بندوق سے گولیوں کی ایک باڑھ اس کے سر میں ماری جس سے وہ گر گیا۔ نوکروں نے مبارکباد کا غل مچا دیا۔ آقا بیک نے اسی وقت ایک گھوڑا اور روسی رائفل نذر کی۔ شکار اچھا رہا۔ ہم نے حکم دیا کہ ریچھ کی کھال اتار کر فخر السلطنہ کو بھجوا دی جائے۔ جب ہم واپس شامیانے میں پہنچے تو علمدار خان نے اطلاع دی کہ ریچھ میں ابھی جان باقی تھی اور اس نے ایک نوکر کو زخمی کر دیا۔ شکاریوں نے پینتیس سرخ ہرن، بیس تیس خرگوش اور دو پہاڑی بکرے مارے تھے۔ ایک ہرن پندرہ سال کا تھا۔ مقتدر الملک خود پر

13 ذرع: فاصلے یا طول کی اکائی جو 41 انچ یا 104 سنٹی میٹر کے برابر ہوتی ہے۔

بہت نازاں تھا۔ ہم نے حکم دیا کہ روسی رائفل اسے بخش دی جائے۔ دو پہر کا کھانا ہم نے سائبان تلے تناول کیا۔ حرم سرا سے شور بلند ہو رہا تھا۔ حاجب الدولہ نے آ کر عرض کی کہ بیگمات ریچھ کی کھال کی ملکیت پر جھگڑ رہی ہیں۔

"سہ پہر کو ہماری طبیعت پھر ناساز ہو گئی۔ حکیم ابونواس نے جوشاندہ دیا۔ پدر سوختہ دس برس سے ہمارا نان ونمک کھا رہا ہے اور اب تک کچھ نہیں سمجھتا۔ فخر السلطنہ نے پیغام بھجوایا کہ امشب قدومِ مبارک کی منتظر رہے گی۔ اچھی لڑکی ہے، لیکن اپنے آپ میں کچھ زیادہ گم رہتی ہے۔ ہم نے کہلوا دیا کہ ہمارا انتظار نہ کرے۔ یہ ہم نے حرم کی خاطر سے فرمایا۔ ابراہیم بیک نے اسپند جلا کر ہمارے سر کے گرد دھونی دی۔ بولا، ضرور وجودِ مبارک کو کسی کی نظر لگ گئی ہے۔ ہم بہت ہنسے۔ نوکر اچھا ہے۔"

فخر النسا نے اپنی عینک اتار لی۔ کتاب بند کر دی۔ لیکن اس کی انگلی اب بھی کتاب کے اندر تھی۔

"دیکھا آپ کتنے پیچھے ہیں۔ جدِ اعلیٰ نے یقیناً اُس رات ایک تازہ لڑکی کے ساتھ، وہ بھی گرجستانی..."

شہزادہ بولا، "شکار کی مہمات چنداں قابلِ ذکر نہیں۔ تین ذرع کے فاصلے سے تو کوئی بھی، وہ بھی مشین گن سے..."

فخر النسا ہنسی۔ "اور لڑکیاں؟"

فخری آ کر مہتابی[14] کے در پر کھڑی ہو گئی تھی۔ اس کی آنکھیں پہلے ہی کی طرح پھولدار چادر کے چوکھٹے میں تھیں۔

"خانم، کھانا حاضر ہے۔"

فخر النسا نے کہا، "تو جا۔ ہم ابھی آتے ہیں۔"

فخری لوٹ گئی۔ شہزادہ اس کے کندھوں اور کمر اور کولھوں کے متحرک خطوط کو دیکھنے لگا۔ چادر اس کے پورے بدن پر لپٹی ہوئی تھی۔ فخر النسا نے کہا:

"فخری ہنوز باکرہ ہے۔ اگر چاہیں تو آپ کو پیش کر دوں تاکہ آپ بھی شروع ہو سکیں؟ اگرچہ میں جانتی ہوں کہ اجداد کے مقابلے میں آپ کچھ خاص کارکردگی نہیں دکھا سکیں گے۔"

---

14 مہتابی: بالکونی۔

Scanned with CamScanner

شہزادہ بولا، ''لڑکی حسین ہے۔''

فخر النسا بولی، ''صرف اس کی آنکھیں حسین ہیں۔ اور یہ اسے خود بھی معلوم ہے۔''

اس نے اپنے لیے شراب انڈیلی اور ایک ہی گھونٹ میں ساغر خالی کر دیا۔ کتاب میز کے ایک کنارے پر رکھ دی اور اس پر اپنی عینک بھی رکھ دی۔ شہزادے نے فخر النسا کی آنکھوں کی طرف دیکھا۔ فخر النسا کی آنکھیں بھی سیاہ تھیں۔ لیکن اس کی پلکیں نہیں جھپک رہی تھیں۔ ان کی پتلیاں سفید ہو چکی تھیں۔

''آپ کی آنکھیں بھی حسین ہیں۔''

فخر النسا نے شہزادے کے لیے بھی شراب انڈیلی۔

''یہ باتیں قابلِ ذکر نہیں ہیں۔ یہ گھوڑی سواری کے قابل نہیں۔ نذرانے میں ملی ہوئی گھوڑیاں سواری کے لیے بہتر ہوتی ہیں، وغیرہ۔''

شہزادے نے اپنا ہاتھ فخر النسا کے لمبے سفید ہاتھ پر رکھ لیا جو کتاب پر تھا۔ فخر النسا بولی:

''آپ کو معلوم ہے، اگر آپ مقابلے میں کامیاب ہونا چاہتے ہیں تو ضروری ہے کہ اپنا وقت اس ناز و نوازش میں ضائع نہ کریں۔ حاشیے پر نہ چلیں۔''

اس نے اپنی چوٹی داہنے ہاتھ کی حرکت سے سر کے پیچھے ڈال دی۔ شہزادے نے اس کے پستانوں کے درمیان کی لکیر کو دیکھا اور ان چھوٹے اور گول پستانوں کے مدور خطوط پر نظر ڈالی۔ اس نے فخر النسا کا ہاتھ تھام لیا۔

''اور دادا حضور؟''

''انھوں نے اپنا وقت ضائع کیا۔ ہر روز صرف ایک دو سر قلم کرنے چاہئیں، اور دو تین سے زیادہ ہرن اور پہاڑی بکرے نہیں مارنے چاہئیں، تاکہ جب رات آئے تو آدمی نذرانے میں ملی ہوئی گھوڑیوں پر سواری بھی کر سکے۔ یا اس کے برعکس۔ یہ نہیں چاہیے کہ آدمی ان دونوں میں سے کسی ایک شغل کا ہو کر رہ جائے، صرف ایک کی عادت ڈال لے۔ دادا حضور نے عادت ڈال لی تھی، وہ بھی خون دیکھنے کی۔ خون کا رنگ انھیں بھانے لگا تھا۔ انھوں نے یہ بھی حکم فرمایا تھا کہ ان کی شمشیر کے قبضے پر یاقوت جڑے جائیں، بڑے بڑے یاقوت۔ خون کے دو ایک فوارے شاید آنتوں کو حرکت میں رکھنے

Scanned with CamScanner

کے لیے کافی ہوتے، لیکن اس سے زیادہ کی عادت ڈال لینا، محض ایک قسم کے مقابلے میں برتری پانے پر جٹ جانا، یہ نہیں ہونا چاہیے۔"

شہزادے نے اپنا ساغر خالی کیا اور فخرالنسا کے رخساروں کو دیکھا، جن پر پھول کھل اٹھے تھے۔ فخرالنسا اپنی عینک اور کتاب کی چرمی جلد سے کھیل رہی تھی۔

"لیکن جیسا کہ آپ فرما رہی ہیں، اس سے لگتا ہے کہ دادا حضور نے کم از کم ایک شعبے میں تو..."

"نہیں، ایک میں بھی نہیں۔ وہ دونوں مقابلوں میں پیچھے رہ گئے۔ دیکھیے، ان سے یہیں غلطی ہوئی۔ یا تو دونوں مقابلے جیتنے ہوتے ہیں، یا دونوں ہارنے پڑتے ہیں۔ اگر کسی کا سر قلم کیا ہے تو یہ بھی لازم ہے کہ اس کی بیٹی سے، یا کم از کم اس کی بھتیجی یا اس کے کنبے کی کسی لڑکی سے متعہ کیا جائے، تاکہ کسی بغاوت کا امکان نہ رہے۔ اگر وہ اس قسم کی لڑکی ہے کہ روتی رہتی ہے، سیاہ لباس پہنتی ہے، راضی نہیں ہوتی، بھاگنے کی کوشش کرتی ہے، حتیٰ کہ اپنے چہرے کی زیبائش کو کھرچ ڈالتی ہے یا بال بکھیر لیتی ہے، تو اس پر قابو پانا دشوار نہیں ہوتا۔ دیکھیے، مسئلہ اسی سادگی میں ہے۔ اس لیے کہ وہ لڑکی، اس حال میں بھی، اس خوف سے کانپتی رہتی ہے کہ آدمی چلا کر آواز دے گا: میر غضب![15] یا اس کے بھائی کو، جسے ابھی ابھی خلوت کے غلاموں میں شامل کیا گیا ہے، باندھ کر کوڑے مارے جائیں گے۔ دادا حضور نے خود کو بری طرح تھکا لیا تھا۔ سب کی دشمنی مول لینے کے باوجود وہ محض ایک ولایت کے حاکم تھے جن کو ان کے والد کسی بھی وقت عہدے سے الگ کر سکتے تھے۔ پھر وہ عجلت میں پڑ گئے، چاہا کہ جو کچھ ان اجداد نے بیس یا تیس، بلکہ پچاس سال میں کیا تھا، اسے پندرہ سال میں کر ڈالیں۔ لوگوں کو جتھوں کی صورت میں دعوت پر بلایا اور زہر دے دیا، پورے پورے قبیلے کے سروں پر چھتیں گروا دیں۔ اور رات آنے تک اتنا تھک چکے ہوتے کہ نذر میں آئی ہوئی گھوڑیوں پر سواری کے قابل نہ رہتے۔ اس پر گھوڑیاں سرکش ہو جاتیں اور دولتیاں جھاڑنے لگتیں۔ نتیجتاً انھیں شرمندگی آ لیتی اور وہ ہفتہ ہفتہ بھر شرمندہ رہتے۔"

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

---

15 میر غضب: ظل السلطان کے جلادوں کا سردار۔

''اگر آپ چاہیں تو آپ کو دادا حضور کی شرمندگی کے بارے میں کچھ پڑھ کر سناؤں؟''

''نہیں۔ بلکہ اب آپ مجھے اجازت ہی دیں تو...''

''کچھ بھی دیر نہیں لگے گی۔ اور پھر یہ آپ کی اشتہا کے لیے بھی مفید ہوگا۔ شرمندگی اور پشیمانی کے یہ دورے دادا حضور کے مزاجِ مبارک کے لیے طاقتور جلاب کا کام کرتے تھے، اور وہ تازہ دم ہو کر اپنے کام پر لوٹ جایا کرتے تھے۔''

اس کا سفید پیراہن اس کے پیروں تک پہنچ رہا تھا۔ دونوں چوٹیاں پستانوں پر پڑی تھیں۔ فخر النسا جب اندر کے کمرے کی طرف چلی تو شہزادے کی نگاہ اس کی سفید گردن اور شانوں اور کمر کے خطوط پر سے ہوتی ہوئی ساغر میں بچی ہوئی شراب پر آ گئی اور وہاں سے پھ... کے چہرے پر جو دوبارہ اپنی گھومنے والی کرسی پر آ بیٹھی تھی اور دادا حضور کی یادداشتوں کے ورق الٹ رہی تھی۔ وہ مسکرا نہیں رہی تھی۔

''ابھی تلاش کر لیتی ہوں۔ آپ تھک تو نہیں ...ے؟''

شہزادے نے اپنے واسطے شراب انڈیلی۔ شراب کا رنگ سرخ تھا۔ ساغر بھر کر چھلک گیا اور شراب میز پر کھِند ...ی۔ اس کی لکیر میز کی سطح پر چھوٹی سی ندی کی طرح بہنے لگی۔ شہزادے نے ان سرخ قطروں کو دیکھا جو میز کی کگر ... ٹپک رہے تھے، پھر انڈیلی اور پھر میز پر بہتے ان قطروں کو دیکھنے لگا۔ جب اس نے خالی مینا واپس م... النسا بولی:

''اگر چاہیں تو اور منگوا دوں؟ پورا ایک پیپا رکھا ہوا ہے۔''

شہزادے نے کہا، ''نہیں، میں اس مقابلے میں کچھ کر کے نہیں دکھا سکتا۔''

وہ پینے لگا۔ ہر جرعے کے بعد شرابِ پر نظر ڈا...ر ... گدلاہٹ پر جو اب ساغر کی تہہ میں بیٹھ گئی تھی۔ فخر النسا نے پڑھنا شروع کیا:

''درحقیقت آج کا اصفہان قدیم دور کا بلخ ہے جسے بقعۃ الاسلام کا لقب دیا جاتا تھا۔ آخوندوں، ملاؤں، روضہ خوانوں اور واعظوں کے سوا...''

اس نے شہزادے کی طرف دیکھا۔

''نہیں یہاں نہیں تھا۔ مگر خیر...''

Scanned with CamScanner

وہ ورق پلٹنے لگی۔ اور شہزادہ جان گیا کہ وہ ذکر اس ضخیم مخطوطے میں کہیں نہ ملے گا، کہ دادا حضور منیرہ خاتون کا نام تک بھول گئے ہوں گے۔ اور اس نے منیرہ خاتون کو اپنے تمام زندہ اور گرم گوشت پوست کے ساتھ دوبارہ زندہ ہو جانے دیا۔ منیرہ خاتون نے خسرو کو گود میں اٹھا کر اپنے سینے سے چمٹا لیا۔ اس کے پستان گرم تھے۔ وہ ہنس رہی تھی۔ کہنے لگی:

''خسرو خان، کیوں، اچھا لگ رہا ہے؟''

شہزادے نے اپنے بازو منیرہ خاتون کی گردن کے گرد ڈال دیے۔ منیرہ خاتون کی ہتھیلیاں پسینے سے تر تھیں۔ اس نے شہزادے کے گھٹنے پکڑ لیے اور انھیں اپنے بدن سے رگڑنے لگی۔ بولی:

''اچھا لگ رہا ہے، خسرو خان؟''

اور اَور زور زور سے رگڑنے لگی۔ منیرہ خاتون کا بدن گرم اور پُر گوشت تھا۔ شہزادے کے بازوؤں کا حلقہ اور سخت ہو گیا۔ وہ سر پیچھے کر کے منیرہ خاتون کی آنکھوں کو دیکھنے لگا۔ منیرہ خاتون کے بال اس کے شانوں پر بکھر گئے تھے۔ اس نے دیوار سے پیٹھ لگا لی تھی۔ پھر وہ اپنے ہاتھ سے اسے ملنے لگی۔ شہزادے کو کپکپی چڑھ گئی۔ اسے محسوس ہوا کہ منیرہ خاتون کا بدن برہنہ ہو گیا ہے۔ منیرہ خاتون کی فربہ اور گیلی انگلیاں اب بھی مصروف تھیں۔ اس نے پوچھا:

''اچھا لگ رہا ہے؟ اچھا لگ رہا ہے؟''

شہزادے کو ذرا بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ دوسری طرف کے کمرے سے شیخ الحرم کی آواز آ رہی تھی جو بلند اور کشیدہ آواز میں مصائب کا ذکر کر رہے تھے۔ دادی حضور اور اماں حضور اور دوسری عورتوں کی سِسکیوں کی بھی آوازیں سنائی دے رہی تھیں جو ہفت دری کے فرش پر بیٹھی ذکر سن رہی تھیں۔ دادی حضور نے کہا تھا، ''یہاں سے مت ہلنا۔'' لیکن خسرو خان نکل بھاگا تھا۔ منیرہ خاتون چھوٹے کمرے میں تنہا بیٹھی تھی۔ چادر اوڑھے تھی۔ صرف اس کی سیاہ آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں۔ بولی، ''پھر کھیلنے آئے ہو، خسرو خان؟'' منیرہ خاتون نے اپنی چادر علیحدہ کی، خسرو خان کا ہاتھ پکڑ لیا اور صندوق خانے کی طرف چل دی۔

اوپر دیوار کے روزن سے روشنی آ رہی تھی۔ بولی:

''اچھا لگ رہا ہے؟''

Scanned with CamScanner

وہ بیٹھ گئی۔ شہزادہ منیرہ خاتون کی بڑی بڑی رانوں پر بیٹھا تھا۔ اس کی ٹانگیں گوشت کے دو بڑے تودوں کے بیچ میں دبی ہوئی تھیں۔ منیرہ خاتون اب بھی اسے اپنے ہاتھوں سے مل رہی تھی اور پوچھ رہی تھی:

''اچھا لگ رہا ہے؟''

شہزادے کا سر منیرہ خاتون کے گرم اور پسینے سے تر پستانوں کے درمیان تھا۔ پستان کپکپا رہے تھے۔ منیرہ خاتون زور زور سے سانسیں لے رہی تھی۔ وہ سیدھی لیٹ گئی تھی۔ شہزادے کو گرمی لگ رہی تھی۔ اس نے کہا:

''مجھے جانا ہے۔ مجھے نہیں کھیلنا۔ مجھے برا لگ رہا ہے۔ برا لگ رہا ہے۔''

منیرہ خاتون بولی، ''ننگے گھوڑے پر سواری نہیں کرو گے؟ ہاں؟''

روشنی منیرہ خاتون کی گردن پر پڑی۔ شہزادے کے ہاتھ اس کے پستانوں کے کپکپاتے ہوئے تودوں پر تھے۔ منیرہ خاتون بولی:

''بس ذرا سا اور، بس ذرا سا اور...''

شہزادے نے کہا، ''نہیں، مجھے نہیں کھیلنا... مجھے برا لگ رہا ہے۔'' پھر زور سے پکارا:

''دادی حضور!''

منیرہ خاتون ایک دم اٹھ گئی۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ شہزادے نے اس کے پستانوں کو دیکھا۔ اس کے بال کندھوں پر بکھرے ہوئے تھے۔

''اچھا اچھا، صبر کرو۔ کپڑے تو پہن لوں۔''

اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ دادی حضور نے پوچھا:

''کہاں تھے تم؟''

شہزادہ بیٹھ گیا۔ اماں آگے کو جھک آئیں۔ شیخ الحرم کی آواز آ رہی تھی۔

''منیرہ خاتون کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ سواری سواری...''

دادی حضور بولیں، ''کتیا کہیں کی، پھر وہی حرکت...''

بڑی پھپھی نے پوچھا، ''کیا ہوا، فروغ سلطان؟''

Scanned with CamScanner

''کچھ نہیں۔''

چھوٹی پھپھی نے خسرو کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''میرے پاس آ کر بیٹھو، خسرو۔''

دادی حضور نے اسے اپنی طرف کھینچا۔ ''نہیں، کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔''

شیخ الحرم کی آواز بلند اور مسلسل تھی۔ دادی حضور نے اپنے حقے کی نال منھ میں لے رکھی تھی۔ کمرے میں دور دور تک عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ چھوٹی پھپھی نے پھر خسرو کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔ خسرو نے بھی ہاتھ کھینچا۔ بڑی پھپھی اٹھ کر چلی گئیں۔ عورتیں بھی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ صرف اماں اور دادی حضور بیٹھی رہ گئیں۔ دادی حضور زیرِ لب بولیں:

''آخر چلی گئی۔'' اور یہ کہہ کر منھ سے دھواں نکالا۔ چھوٹی پھپھی قریب کھسک آئیں۔ خسرو سرک کر دادی حضور کے قریب ہو گیا۔ چھوٹی پھپھی بولیں:

''کیا یہ پھر منیرہ خاتون کے پاس گیا تھا، فروغ سلطان؟''

عورتیں رو رہی تھیں۔ دادی حضور جھکیں۔ چھوٹی پھپھی جھکی ہوئی تھیں۔ شہزادے کو صرف شیخ الحرم کی آواز سنائی دے رہی تھی اور پردے پر پڑتی ان کی پرچھائیں نظر آ رہی تھی۔ ان کے حقے کی بھی پرچھائیں تھی۔ ددہ قمر نے جھک کر کہا:

''حضرتِ والا فرماتے ہیں...''

دادی حضور بولیں، ''بس شیخ اپنا ذکر پورا کر لیں... بہ چشم۔''

ددہ قمر نے بیٹھ کر حقہ اٹھا لیا۔ اس کی پلکیں سفید تھیں۔ سفید بالوں کی چند لٹیں اس کی اوڑھنی میں سے باہر نکل آئی تھیں۔ شہزادے کو دادا حضور کی اونچی اور گرہ دار آواز سنائی دی:

''فروغ سلطان!''

فخر النسا ابھی تک کتاب کے ورق پلٹ رہی تھی۔ شہزادہ چلا اٹھا:

''اس کی چیخیں باہر باغ تک سنائی دے رہی تھیں، یقین کرو، درختوں اور پھاٹک تک۔ ضرور اسے داغ رہے ہوں گے۔ لالہ آقا نے یہی بتایا تھا۔''

لیکن فخر النسا محض ایک بے رنگ خاکہ تھی: بالکل ان عورتوں کی طرح جیسی کسی مینیا تور میں بڑے کمرے میں دور دور تک کھنچی ہوتی ہیں، بید مجنوں کے نیچے کھڑی رہتی ہیں یا بال بکھرائے، جام ہاتھ

میں لیے نہر کے کنارے بیٹھی دکھائی جاتی ہیں۔ فخر النسا کے ہاتھ میں کتاب تھی، وہی چرمی جلد والی کتاب۔ وہ پڑھنے لگی:

''واللہ، میری کچھ تقصیر نہ تھی۔ ابا حضور نے حکم جاری کر دیا تھا اور میں اس تہمت سے بچنا چاہتا تھا کہ میری ایلخان سے کوئی ساز باز تھی، چنانچہ میں نے وہ کیا جو مجھے نہیں کرنا چاہیے تھا۔ حکم تھا، ابا حضور کا حکم، اور اولی الامر منکم۔ کئی بار خیال آیا کہ جا کر خود کو ختم کر لوں۔ لیکن پھر یہ سوچ کر رہ گیا کہ شرع مقدس میں قتل نفس کی مناہی آئی ہے۔ اس کی سزا دنیا میں بھی ملتی ہے اور آخرت میں بھی۔ خدا اور رسول خدا شاہد ہیں کہ ایک روز میں نے سید حبیب سے کہا: 'گھوڑا تیار کرو۔' ہم دونوں اکٹھے صحرا میں گئے۔ میں نے پستول اس کے ہاتھ میں دیا اور اس کا دامن پکڑ کر کہا: 'تمھیں تمھاری جدّہ زہرا کا واسطہ دیتا ہوں۔' سید حبیب رونے لگا۔ عرض کی: 'یہ کیا فرما رہے ہیں؟' میں نے کہا: 'کل تمھارے جد کے سامنے کیا جواب دوں گا؟ ان سے کیسے آنکھیں چار کروں گا؟ میں یہاں دنیا میں سزا بھگتنے کو تیار ہوں۔ تم یہ کام کر دو تا کہ خدا میری تقصیر معاف کر دے۔' اس نے عرض کی: 'حجاج بن یوسف تک اپنے تمام کشت وخون کے باوجود کرمِ خداوندی کا امیدوار تھا۔' وہ میرے دست و زانو کو بوسے دینے لگا۔ اور نیچے جانا چاہتا تھا لیکن میں نے جانے نہ دیا۔ میں نے اس کے چہرے کو بوسہ دیا۔ واپسی میں ہم نے دو خرگوش شکار کیے۔ سید حبیب نے بیان کیا: معلوم نہیں کہاں پڑھا تھا کہ ایک روز حجاج نے کسی سائل کو چند درہم دیے اور اس سے کہا، میرے لیے دعا کر۔ سائل ہر رات اس کے لیے دعا کرنے لگا۔ جب حجاج مر گیا تو اس کے بعد ایک رات سائل کے خواب میں آیا اور اس سے پوچھنے لگا، تو دعا کیوں نہیں کرتا؟ سائل نے کہا، میں سمجھا تھا کہ اب تمھارا کام تمام ہوا، اب میری دعا کیا فائدہ کرے گی۔ حجاج نے کہا، تیری دعا سے میرے بہت سے گناہ معاف ہو گئے۔ سائل نے پوچھا، تو کیا اب بھی امید ہے؟ حجاج نے کہا، یقیناً۔ دعا کرتا رہ۔''

فخر النسا بیٹھی ہوئی تھی، اسی جگہ، اپنی کرسی میں، کتاب تھامے ہوئے۔ آنکھوں پر عینک لگی تھی۔ شہزادہ بولا:

''میں نے کہا: لالہ آقا، مجھے اس کو دیکھنا ہے۔ اس نے کہا: سبق یاد کرو۔ میں نے کہا: مجھے دیکھنا ہے۔ بولا: اگر روؤ گے نہیں تو دکھا دوں گا۔ میں نے کہا: نہیں روؤں گا۔ وہ بولا: جب ملا حسین چلا جائے

Scanned with CamScanner

گا، تب۔ مگر بس ایک نظر۔ ٹھیک ہے؟ میں نے کہا: ٹھیک ہے۔ چھوٹے کمرے کا فرش ننگا تھا۔ قالین لپیٹ کر کونے میں رکھ دیا گیا تھا۔ مجھے کراہنے کی بہت کمزور لیکن مسلسل آواز سنائی دی۔ لالہ آقا نے پوچھا: ڈر تو نہیں لگ رہا؟ میں نے کہا: نہیں۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ وہ بہت لمبا تھا۔ آواز کوٹھری کے دروازے کے پیچھے سے آ رہی تھی۔ لالہ آقا نے کوٹھری کی چٹخنی کھولی۔ مجھے فقط روشنی کا ستون اور منیرہ خاتون کے چہرے کی سفیدی دکھائی دی۔ اس کی پلکیں بند تھیں۔ میں نے کہا: لالہ آقا، اس کے بال کیوں کاٹ دیے؟ بولا: بس، دیکھ لیا؟ اس کی قمیص لیر لیر ہو رہی تھی۔ اس کے بڑے بڑے پستان دکھائی دے رہے تھے۔ اس کے ہاتھ دو کھونٹیوں سے بندھے ہوئے تھے۔ پیر شکنجے میں تھے۔ وہ رو رہی تھی۔ لالہ آقا نے کہا: دیکھ لو اور چلو۔ زور سے کہا تھا۔ آنکھیں کھلیں اور منیرہ خاتون نے سر پھیر کر دیکھا۔ اس کے ہاتھوں میں حرکت ہوئی۔ روشنی اس کے ننگے بازوؤں پر پڑی۔ بولی: تم ہو خسرو خان؟ میرے ساتھ کھیلنے آئے ہو؟ یہ کہہ کر ہنسی۔ ہنستے ہوئے اس کے پستان ہل رہے تھے۔ میں نے کہا: لالہ آقا، مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ لالہ آقا نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ منیرہ خاتون نے چیخ کر کہا: کھیلنے آئے ہو خسرو خان؟ ننگے گھوڑے کی سواری کرو گے، ہاں؟ منیرہ خاتون کی، حضرتِ والا کی منکوحہ کی سواری کرو گے؟ ہاں، کرو گے؟ وہ ہنس رہی تھی۔ لالہ آقا نے کوٹھری کا دروازہ بند کر دیا۔ وہ اب تک ہنس رہی تھی، زور زور سے۔ لالہ آقا نے کہا: میں نے کیا کہا تھا؟ پاگل ہو گئی ہے۔ میں نے پوچھا: کیوں؟ بولا: اسے داغ دیا ہے۔ دونوں ہاتھ پکڑ کر سرخ کیے ہوئے لوہے سے داغا ہے۔''

شہزادہ احتجاب نے سر جھکا کر دونوں ہاتھوں میں تھام رکھا تھا۔ میں نے جدِ اعلیٰ کی تصویر کو کیوں جلا دیا؟ دادا حضور نے لکھا تھا: ''سید حبیب صحیح النسب سید ہے۔ اس نے مجھے بہت نصیحت کی۔ رحمتِ الٰہی کے دریا کا ذکر کیا اور بتایا کہ المامور معذور، کہ جو حکم پر عمل کرنے کا پابند ہو اس پر کوئی گناہ نہیں۔'' منیرہ خاتون نے، بے شک، چیخ چیخ کر ان سے کہا تھا، ''رحم کیجیے، شہزادے، مجھ سے خطا ہوئی۔'' دادا حضور بید کے درخت کے نیچے کھڑے تھے... یا نسترن کے درخت کے نیچے؟ وہ دیکھتے رہے۔ انھوں نے نوکروں کو حکم دیا تھا کہ سید حبیب کو ایک شال اور چالیس اشرفیاں عطا کی جائیں۔ انھوں نے لکھا تھا: ''خدا اس کی عمر میں اضافہ کرے۔ سید حبیب بڑا نازنین آدمی ہے۔''

شہزادے نے پوچھا، ''اور فخر النسا خانم، ابا حضور؟''

Scanned with CamScanner

''تمھارے ابا حضور مقابلہ جیت سکتے تھے۔ انھوں نے اپنے اجداد کا برسوں کا کیا ہوا دو ایک گھنٹوں میں بے سکّہ کر دیا۔ محض ایک حکم دے کر لوگوں سے بھری ہوئی پوری سڑک کو ٹینکوں اور بکتر بند گاڑیوں کے پہیوں تلے کچلوا دینا کوئی ہنسی کھیل نہیں۔ تم خود بتایا کرتے تھے۔ حیف کہ وہ بہت جلدی میدان چھوڑ گئے۔''

اور شہزادے نے دیکھا کہ فخر النسا، اپنی تصویر ہی کی طرح، دور اور اجنبی لگ رہی ہے۔ اسے اس کے سیاہ بالوں پر گرد جمی دکھائی دی۔ وہ کھانسنے لگا۔ جب کھانسی سے اس کے کندھے لرزنے لگے، جب اس نے دیکھا کہ اب اس کے بس میں نہیں رہا... تو وہ سمجھ گیا کہ اسے پھر سے شروع کرنا ہوگا، کہ اس کا انجام خواہ کچھ بھی ہو، اسے کرنا ہی ہوگا... اس نے زور سے کہا:

''کہاں سے؟''

اسے پھر کھانسی آئی۔ فخری نے میز پر کھانا لگایا اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔ بتی جلائی اور آئینے کے آگے بیٹھ گئی۔ بالوں میں کنگھی کی، انھیں اکٹھا کیا اور اپنے داہنے کندھے پر ڈال لیا۔ اس نے اپنی مٹھی کئی بار پیشانی پر ماری اور پھر آئینے میں دیکھا۔ اپنے موٹے سرخ ہونٹوں کو دیکھا، پھر بالوں میں دوبارہ کنگھی کی اور انھیں بائیں کندھے پر ڈال لیا۔ پھر اٹھی، آئینے کی طرف پیٹھ کر کے کھڑی ہوگئی اور اپنی گردن کی پشت کو دیکھنے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر چونکہ اس کے کچھ بال اب بھی پیٹھ پر پڑے تھے، اس نے چھوٹا دستی آئینہ اٹھایا، اسے سر کے پیچھے لے گئی اور آئینے کی طرف منھ کر کے دیکھنے لگی۔ بالوں کو داہنے کندھے پر ڈال لیا۔ اس کی گردن سفید اور خوشگوار معلوم ہونے لگی تھی۔ بالکل ویسے ہی نازک خطوط جیسے اس کی خانم کی گردن کے تھے۔ اسے اپنے سیاہ بالوں کے درمیان ایک سفید بال دکھائی دیا۔ اسے اکھاڑنے کی کوشش کی، پہلے ناکام رہی، پھر مٹھی بھر بال ہاتھ میں لے کر اسے نکال پھینکا۔

شہزادہ کھانسا۔ فخری نے ایک دراز باہر کھینچی، اپنی خانم کی آرائش کی چیزوں کو ٹٹولا، خانم کا چھوٹا سا، کھلنے بند ہونے والا آئینہ نکالا، اسے کھولا۔ اس کے ایک جانب اس کی خانم اور شہزادہ احتجاب کی تصویر تھی۔ دونوں ساتھ ساتھ کھڑے تھے۔ شہزادے کے بال چھدرے تھے، خانم کے گھنے اور سیاہ۔ تصویر پر جڑے ہوئے شیشے کو صاف کیا تو اسے خانم کا تل دکھائی دینے لگا، یہاں تک کہ ان کے

دہن کے پاس کی سلوٹیں بھی اور عینک کے پیچھے ان کی کمزور آنکھیں بھی۔ اُس دن جب میں نے عینک لگائی تھی تو شہزادہ کس قدر بگڑ اٹھا تھا۔ کہنے لگا، ''میں نے تجھ سے فخر النسا بننے کو کہا تھا، یہ نہیں کہا تھا کہ اس کی سب ادائیں بھی...'' شہزادے کا منھ شہتوت کی طرح سیاہ ہو گیا تھا۔ اس نے میری عینک کھینچ کر اتار لی اور خانم کی دراز میں ڈال دی۔

اس نے دراز میں ہاتھ ڈالا۔ عینک اپنی ہر رات کی جگہ پر رکھی تھی۔ اس نے اپنی آنکھوں پر لگالی اور آئینے میں دیکھا۔ اس کی آنکھیں اب تک روشن تھیں، فخر النسا کی آنکھوں کے برعکس جو کبھی جھپکتی تک نہ تھیں، ہمیشہ، سرِ شام سے نصف شب تک، کتاب میں گڑی رہتی تھیں۔ دن میں بھی۔ یہاں تک کہ اس وقت بھی جب وہ آئینے کے سامنے بیٹھی ہوتیں اور میں ان کے بالوں میں کنگھی کر رہی ہوتی۔ وہ کہتیں، ''فخری جان، انھیں میرے شانے پر ڈال دے۔ نہیں، یوں نہیں۔'' اور پھر پڑھنے لگتیں۔ صرف ان کے ہونٹ ہل رہے ہوتے۔ میں نے پوچھا، ''خانم جان، اس میں کیا لکھا ہے؟'' بولیں، ''تجھے پڑھ کر سناؤں؟'' میں نے کہا، ''جی۔'' انھوں نے قلعۂ سنگ بار کا قصہ [16] پڑھ کر سنایا۔ میں نے کہا، ''خانم، یہ سب تو جھوٹ ہے۔'' انھوں نے کہا، ''جانتی ہوں۔ لیکن میں دیکھنا چاہتی تھی کہ اُن اجدادِ والا تبار کو اس قسم کی چیزوں سے کیونکر نیند آتی تھی۔''

خانم نے تصویر کو فخری کے دامن سے صاف کیا۔ وہ ہنس رہی تھیں۔ شہزادے کا چہرہ تنا ہوا تھا۔ وہی ہمیشہ کا قصہ۔ مگر اُس رات کتنے زور زور سے ہنس رہا تھا! کیسا دل پایا ہے! وہ بھی نعش کے سامنے۔ مجھے کتنا ڈر لگ رہا تھا۔

وہ تصویر کو آئینے کے سامنے لا کر خود پر نظر ڈالنے لگی۔ کاش میرا چہرہ ذرا پتلا ہوتا۔ اگر شہزادہ اجازت دے تو میں یہ عینک لگا لیا کروں۔ ہمیشہ یہی کہتا ہے، ''تیری نظر ابھی کمزور نہیں ہوئی ہے۔'' قلم کو میری انگلیوں کے بیچ میں رکھ کر دبا تا تھا۔ کہتا تھا، ''میں تیرا معلم خانہ ہوں۔'' اس کے بچہ کیوں نہیں ہوتا؟ فخر النسا سے بھی نہیں ہوا تھا۔

اس نے اپنا چہرہ آگے کو کر کے تصویر کی گردن کو دیکھا اور پھر اپنی گردن کو۔ شہزادہ کہتا ہے،

---

16 قلعۂ سنگ بار کا قصہ: انیسویں صدی کے آخر میں ناصر الدین شاہ قاچار کے درباری داستان گو نقیب الممالک کا ایک مشہور قصہ۔

''تیری گردن بالکل فخرالنسا جیسی ہوگئی ہے، بس اگر ذرا سی... ''مگر یہ میرے ہاتھ میں تو ہے نہیں۔ اسے تو بس پستانوں کے درمیان سر رکھنا اچھا لگتا ہے، اور پھر جلدی ہی سو جاتا ہے۔ کتنا ہی کہتی ہوں، ''شہزادہ جان، میرا دم گھٹ رہا ہے، اب بس!'' مگر اس پر ذرا بھی اثر نہیں ہوتا۔ کہتا ہے، ''دادا حضور ہر رات ایک باکرہ لڑکی کے ساتھ سوتے تھے۔'' کہتا ہے، ''میں تو اب مرد نہیں رہا۔ اگر ہوتا تو صرف تجھ پر گزارا کرنے پر مجبور نہ ہوتا۔'' مرد نہیں رہا، پھر بھی ہر رات وہی چاہتا ہے۔ بس میرے پستانوں میں منھ دے کر سو جاتا ہے۔ میں کہتی ہوں، ''شہزادہ جان، مجھے بھی سونا ہے۔'' اس پر میں اکیلی اور سارے گھر کا کام۔ اگر میں صبح جلدی اٹھ کر کام شروع کرنا چاہوں تو کہتا ہے، ''فخرالنسا تو دوپہر تک سویا کرتی تھی۔'' بہت اچھا، میں خود بھی دیر تک سونا چاہتی ہوں۔ مگر پھر یہ سارا کام کون کرے گا؟ آخر ایک شہزادہ کیسے میرے پلے پڑ گیا؟ کتنا ہی اس سے کہتی ہوں، ''شہزادے، مجھ سے شادی کر لیجیے۔ اگر بچہ ہو گیا تو سر پر کیسی خاک پڑے گی!'' کہتا ہے، ''فخرالنسا، ایسی باتیں تمھیں زیب نہیں دیتیں۔'' مگر میں تو فخرالنسا نہیں ہوں۔ میں فخری ہوں۔ خدا کا شکر ہے اس کے بچہ نہیں ہوتا۔ اگر ہوتا تو اس حرام کے تخم کا کیا کرتی؟ مگر یہ باتیں اس کے سر میں نہیں سماتیں۔

اس نے تصویر کو دیکھا اور پھر خود کو، اور دہن کے بالکل پاس بائیں طرف تل بنایا۔ شہزادے نے کہا تھا، ''تل اپنے ہونٹوں کے بائیں طرف لگا، اپنے گنوار و منھ پر نہیں۔'' یہ کہہ کر مجھے تھپڑ مارا۔

اس نے تل کو گہرا کیا۔ تصویر جیسی مسکراہٹ چہرے پر لائی اور دیکھا کہ اس کے دہن کے پاس پڑنے والی سلوٹ تل پر سے گزر گئی۔ تصویر پر نظر جمائے جمائے وہ بالوں میں کنگھی کرنے لگی۔ پھر جھک کر دیکھا۔ اگر اس نے ایک بھی سفید بال دیکھ پایا...

اسے ایک بھی سفید بال دکھائی نہ دیا۔ اس نے تصویر کو قدِ آدم آئینے کے ساتھ ٹکا کر رکھ دیا۔ پیش بند کھولا اور اپنے پیراہن کی جیب میں رکھ لیا۔ اس کا سر کا رومال پیش بند کی جیب میں تھا۔ کاش میری کمر ذرا سی پتلی ہوتی... میں کتنی بھی کوشش کروں، نہیں ہوتی۔ یہ میری آنکھیں... کاش میرا تل کبھی نہ مٹتا۔ خانم کتاب پڑھتے پڑھتے زور زور سے ہنسنے لگی تھیں۔ شہزادے نے کہا، ''پڑھو۔'' میں نے کہا، ''مجھے پڑھنا لکھنا نہیں آتا۔'' بولا، ''میں سکھا دوں گا۔''

وہ اٹھی اور کپڑوں کی الماری کے پاس گئی۔ اس نے پیراہنوں کو ہاتھ سے چھوا۔ وہ سارے سفید

جالی دار کپڑے کے تھے۔ آخر یہ مجھے کوئی اور لباس کیوں نہیں خرید کر دیتا؟ میں ان پیراہنوں سے اکتا چکی ہوں۔

اس نے ان میں سے ایک پیراہن نکالا اور آئینے کے سامنے گئی، اسے سامنے سینے پر رکھ کر دیکھا۔ جھکی، تصویر پر بھی نگاہ ڈالی۔ ان سب کے گلے نیچے تک کھلے ہوئے ہیں، بالکل خانم کے پیراہن کی طرح، وہی والا جسے وہ... خون ان کے منھ کے کنارے سے ٹپک ٹپک کر بستر کی نفیس چادر پر گر رہا تھا اور اس پر پڑا ہوا دھبا پھیلتا جا رہا تھا۔ میں نے کہا، ''شہزادہ جان، نہیں، نعش کے سامنے ٹھیک نہیں۔'' شہزادے نے میرا چہرہ اپنی طرف گھما لیا اور میرا ہونٹ چوسنے لگا۔ میں نے پھر سر دوسری طرف پھیر لیا۔ خانم کا بدن چادر کے نیچے ہل رہا تھا۔ کتنا دبلا بدن تھا! میں نے چیخ ماری۔ شہزادے نے کہا، ''ہاں، یہ اچھا ہے!'' کیسا دل پایا ہے شہزادے نے!

اس نے سفید جالی دار پیراہن کو کرسی کے ہتھے پر ڈال دیا اور اپنا لباس اتارا۔ اس کے برہنہ بازو گداز اور سفید تھے۔ پھر وہ جھکی، اپنے کپڑے تہہ کیے اور جا کر کونے میں رکھے لوہے کے صندوق میں رکھ دیے۔ اس کی چٹخنی لگا دی۔ صبح سے رات تک جھاڑو لگانی پڑتی ہے، اب تھک چکی ہوں۔

اس نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے بازوؤں پر نگاہ ڈالی، اور اپنے سینے پر اور پستانوں کے بیچ کی لکیر پر اور دہن کے کنارے پر لگے تل پر اور سیاہ بالوں کے ڈھیر پر جو اس کے کندھوں پر پڑا ہوا تھا۔ ہمیشہ میرے سینے پر سر ڈال دیتا ہے۔ فخرالنسا کے ساتھ ایسا کبھی نہیں کرتا تھا۔ یہ کیوں کہتا تھا؟ ''ہاں، یہ اچھا ہے۔ چیخ مار، چیخ مار!''

اس نے کپڑے پہنے اور آنکھوں پر عینک درست کی۔ پیراہن اب اس کے بدن پر بالکل ٹھیک آتا تھا۔ صرف کندھوں پر سے ذرا تنگ تھا اور پستان دبتے تھے۔ اس نے اسے گلے پر سے درست کیا اور بالوں کو بائیں کندھے اور پستان پر ڈال لیا۔ خانم کیونکر ایسا کرتی تھیں کہ ان کے بال ہمیشہ بائیں پستان پر پڑتے تھے؟ بیٹھی پڑھا کرتی تھیں۔ میں نے کہا، ''شہزادے، میں بھی کتاب پڑھنا چاہتی ہوں۔'' بولا، ''ٹھیک ہے، میں خود تیرا معلمِ خانہ بنوں گا۔'' ان کتابوں میں سب کچھ جدِاعلیٰ یا پتا نہیں کس کے بارے میں تھا۔

اس نے کمر بند کو ہاتھ میں پکڑ لیا: یہ لعنتی کمر!

کمر بند باندھا اور کرسی پر بیٹھ گئی۔ گردن جھکائی۔ پھر چھوٹا آئینہ نکالا اور اس میں خود کو دیکھا اور پھر کنکھیوں سے اپنی خانم کی طرف جو اَب شہزادے کے ساتھ سر کے بل کھڑی دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے ہاتھ پھیر کر اپنے بال سنوارے، لیکن دیکھا کہ وہ پھر بکھر گئے ہیں اور ان میں دوبارہ کنگھی کرنے لگی۔ اس مسہری پر آدمی آرام سے پیر پھیلا کر سو سکتا ہے اور چھت کو تک سکتا ہے۔ اوپر چونے کے بنے نقش و نگار دیکھ سکتا ہے، اس ننھے فرشتے کو جو گل اطلسی[17] میں سے باہر نکل رہا ہے، اور ان سب چھوٹے چھوٹے آئینوں کو جو چھت پر جڑے ہوئے ہیں۔ اس کا ایک پر ٹوٹا ہوا کیوں ہے؟

اس نے اپنے تل کو غور سے دیکھا۔ خانم کہا کرتی تھیں، ''مجھے یقین نہیں ہے۔ یہ باتیں بے سروپا لوگوں کے لیے ہیں جو صبح سے رات تک جان مارتے ہیں اور رات کو ان کے پاس سونے کے لیے جگہ تک نہیں ہوتی۔'' خدا کرے شہزادہ اب اٹھ کر میز پر آ جائے۔ کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ شہزادہ میز کے اُس طرف اور میں اِس طرف۔ اس کے بچے کیوں نہیں ہوتے؟ میرا تو دل چاہتا تھا دس بچے ہوتے، لڑکے اور لڑکیاں، سب کے سب خوبصورت، جیسے...

اس کی گردن ابھی تک ٹیڑھی تھی۔ اس کے ریشمی بال آئینے میں چمک رہے تھے۔ ایسی جگہوں پر سر کا رومال ٹھیک رہتا ہے، ورنہ بالوں پر گرد بیٹھ جاتی ہے۔ ''نہیں،'' شہزادے نے کہا، ''فخری کو جان مارنے دو۔ تم نہیں۔'' ٹھیک ہے، بعض لوگوں کا نصیب ہی خراب ہوتا ہے۔ مگر اس نے کتابیں کیوں جلوائیں؟

اس کی نگاہ کمزور ہو گئی تھی اور دھندلکے میں چیزوں کو ایک دوسرے سے الگ شناخت کرنے میں مشکل ہوتی تھی۔ لیکن پستانوں کے درمیان کی لکیر اور تل دیکھ سکتی تھی۔ یہ اٹھ کیوں نہیں جاتا؟ آج اسے کیا موت آ گئی؟ خدا نہ کرے...

جب وہ ہنسی تو اس نے اپنے دہن کے کناروں پر سلوٹیں گہری ہوتی دیکھیں۔ بہت غور سے دیکھنے پر بھی اسے ان سلوٹوں میں تل کہیں نظر نہ آیا۔ اس کے چہرے کے نقوش دھندلا رہے تھے۔ بال گویا ایک سیاہ اور سیال تودہ تھے جو بائیں پستان تک بہہ کر آ رہا تھا۔ آنکھیں عینک کے موٹے شیشوں کے پیچھے جھپک نہیں رہی تھیں اور اب وہ وہاں، آئینے میں، ان دھندلاتے، کپکپاتے، سیال

---

17 گل اطلسی: Petunia

خطوط کے درمیان اپنی خانم فخر النسا کو دیکھ پا رہی تھی۔ کاش میرے بچہ ہو جاتا! میں نے کتنا ہی کہا، ''کم از کم گھر کا کام کرنے کے لیے کوئی نوکرانی ہی رکھ لیجیے۔'' وہ کہتا ہے، ''فکر مت کرو، فخری سب کر لے گی۔'' میں نے پوچھا، ''اکیلے؟'' کہنے لگا، ''کر لے گی، میں جانتا ہوں وہ کر لے گی۔'' میرے بالوں سے کھیلنے لگا۔ بولا، ''فخر النسا، تم بہت ناز دکھانے لگی ہو۔''

اس کی گردن تنی ہوئی تھی اور پستان زیادہ بھاری ہو گئے تھے۔ کاش وہ کوئی نوکرانی رکھ لیتا... یہ سارے برتن... اور میں اکیلی...

اس نے چھوٹا آئینہ بند کر کے دراز میں واپس رکھ دیا اور دراز بند کر دی۔ دونوں بازو کرسی کے ہتھوں پر رکھ کر پیچھے ٹیک لگا لی۔ کاش وہ اب نیچے اتر آئے۔ اس گھر میں بھلا کیسے کوئی نوکرانی رہ سکتی ہے! اتنا سارا کام اور یہ شخص جو بہانے ڈھونڈا کرتا ہے۔ باورچی خانے میں یا دروازے کے پیچھے تاک میں کھڑا رہتا ہے اور جب فخری کھانے کی سینی ہاتھوں میں لیے باہر نکلتی ہے تو یا اس کے کولھے کو نوچ لیتا ہے یا اس کے سینے پر ہاتھ ڈال دیتا ہے...

وہ زور سے بولی، ''شہزادے، کیسی شرم کی بات ہے! یہ عمر اور ایسی حرکت!''

شہزادے نے کہا، ''دادا حضور کی سو منکوحہ اور ممتوعہ بیویاں تھیں، پوری سو، اور ہر رات ایک نئی لڑکی۔ ذرا سوچو، فخر النسا، اور مطربائیں الگ۔ اور یہاں میرے حصے میں فقط تم آئی ہو...''

شہزادہ کھانسا اور اسے کھڑکیوں میں جڑے شیشوں کے لرزنے کی جھنجھناہٹ سنائی دی۔

فخر النسا بولی، ''خوب، تو اس کا اِس زمانے سے کیا تعلق؟ اور وہ بھی ایک ملازمہ کے ساتھ؟ آخر لوگ تمھیں شہزادہ اور اسے گھر کی خادمہ کہتے ہیں۔ اگر لوگوں کو پتا چل جائے، اگر تمھارے سگے سوتیلے عم زادوں اور سگی سوتیلی عم زادیوں کو پتا چل جائے تو؟''

شہزادہ بولا، ''جہنم میں جائیں وہ سب!''

شہزادے نے کہا، ''پتا ہے، فخر النسا، دادا حضور نے حکم دیا تھا کہ منیرہ خاتون کو داغ دیا جائے۔ لوہے کو تپا کر سرخ کیا گیا اور اسے اُس جگہ...''

فخری بولی، ''مجھے کہاں سے پتا چلتا؟ ان کتابوں میں تو اس بارے میں کچھ لکھا ہوا نہیں۔ اور پھر مجھے لکھنا پڑھنا بھی...''

Scanned with CamScanner

شہزادہ بولا، ''اس کی چیخیں مجھے اب بھی سنائی دیتی ہیں۔ سرخ کیے ہوے لوہے سے، فخر النسا! یقیناً دادا حضور نے کہا ہوگا: اب باقی سب کو عبرت ہوگی!''

اور وہ کھانسنے لگا۔ فخری اب بھی آئینے کے سامنے بیٹھی سوچ رہی تھی: اس وقت خانم ایسا ظاہر کرتیں جیسے ان کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا ہو۔ بس اپنی عینک کے پیچھے سے مجھے دیکھا کرتیں۔

اس نے آنکھیں ذرا میچ کر دیکھا۔ اس کی خانم آئینے میں بیٹھی تھی، عینک کے گوشے سے جھانکتی اپنی انھیں آنکھوں سے اس پر نگاہ جمائے ہوے۔ اس نے اپنے سفید رومال سے آئینے کو صاف کیا۔ اس کے بدن کے خطوط بگڑنے لگے۔ میں نے کہا، ''شہزادے، ایک دن جب میں چائے کی سینی ہاتھ میں لے کر اوپر گئی تو خانم بولیں...''

شہزادہ بولا، ''تمھاری نوکرانی۔''

میں نے کہا، ''بولیں: فخری، تجھے بھی مزہ آتا ہے؟ میں نے کہا: نہیں، خانم۔ بولیں: پھر اتنے زور زور سے ہنستی کیوں ہے؟ میں نے کہا: کیونکہ وہ میرے سینے میں ہاتھ ڈال دیتا ہے۔ پوچھنے لگیں: ابھی تک اس کے ساتھ سوئی ہو؟ میں نے کہا: نہیں، خانم۔''

آئینے میں دیکھا۔ ان کی پلکیں نہیں جھپک رہی تھیں اور وہ نظر جمائے دیکھ رہی تھیں۔ اسے ان کی پیشانی پر دو ایک نرم سلوٹیں دکھائی دیں۔ بولیں:

''شرم کی بات ہے، فخری۔ کم از کم...''

زور سے کہا تھا۔ انھوں نے ہاتھ بڑھا کر نقرئی سینی پر سے پیالہ اٹھانا چاہا۔ میرا کیا قصور تھا؟ اگر شہزادے کو خواہش ہوتی تھی اور خانم ہمیشہ اسی طرح بیٹھی رہتی تھیں... اس قدر دبلی کیوں تھیں؟ بازو بالکل دو لکڑیوں جیسے، سوکھے ہوے۔ اور سفید۔

ہاتھ ہوا میں اٹھا رہ گیا تھا۔ چائے کی سینی فخری کے ہاتھوں میں تھی جو پیش بند اور سر پر رومال باندھے، اُس طرف، اندھیرے میں، کھڑی تھی۔ ہاتھ بڑھا کر آویزوں کی جوڑی اٹھائی اور کانوں میں پہن لی۔ آویزے دمک رہے تھے۔ پھر انھوں نے سر گھمایا۔ اس نے بائیں کان کے آویزے کو کنکھیوں سے دیکھا۔ مجھ پر بھی اچھے لگیں گے!

اس نے اپنے بالوں میں انگلیاں پھیریں اور انھیں دونوں پستانوں کے بیچ کی لکیر پر ڈال لیا۔

Scanned with CamScanner

اس نے ہار بھی نکال لیا۔ بھاری تھا۔ کاش یہ کسی کو رکھ لے جو یہ سب کام... مجھ سے نہیں ہوتا۔ اور پھر خود کو کتنا ہی دھوؤں پونچھوں۔ خانم کی رنگت کس قدر سفید تھی! بس ہڈیوں پر کھال منڈھی ہوئی۔ ان کے پستان چھوٹے، سفید اور گول تھے۔ اور پیٹ...

ہار اس کے گلے میں وہاں تک آ رہا تھا جہاں دونوں پستانوں کے بیچ کی لکیر تھی۔ بالوں کے اوپر پڑا ہوا تھا۔ اس نے اپنی انگلی سے ایک ایک موتی کو چھوا۔ خانم کو یہ بالکل پسند نہ تھا۔ اتنے سارے زیور تھے ان کے پاس، صدف کے بنے ڈبے میں بھرے ہوے۔ آئینے کے سامنے بیٹھ جاتیں اور ایک ایک کو گلے میں ڈالتی جاتیں۔ کہتیں، ''فخری جان، ذرا دیکھ تو، کون سا مجھ پر اچھا لگتا ہے۔''

وہ زور سے بولی، ''مجھ پر بھی اچھا لگتا ہے۔ کتنا اچھا!''

کہتی تھیں، ''فخری جان، بہتر ہے تو جا کر سو جا۔ میں انتظار کروں گی۔ شاید کسی جوئے خانے میں رہ گیا ہوگا۔'' میں کہتی، ''خانم، میں بھی جاگتی رہوں گی۔''

اس نے کنکھیوں سے کمرے کے کونے میں آتشدان کی طرف دیکھا، جو آدھا آئینے میں دکھائی دے رہا تھا، اور بولی:

''صبح تک جاگتی رہوں گی، شہزادے۔''

پھر اس نے چوڑیاں نکالیں اور ایک ایک کر کے پہننے لگی۔ اب بھی بہت تنگ ہیں۔ یہ میری انگلیاں! خانم کی انگلیاں لمبی اور سفید تھیں۔ اور ناخن... لیکن اگر آدمی کو صبح سے رات تک... اور اتنے سارے برتن...

بولی، ''کاش اس نے کسی کو کام کے لیے رکھ لیا ہوتا۔''

چوڑیوں کی چمک کو آئینے میں دیکھنے لگی جہاں آتشدان کے پاس کی جگہ میں فخری اب تک اپنی خانم کے سر کی پشت پر کھڑی تھی۔ شہزادہ اندھیرے میں کھڑا تھا۔ اپنے ٹھنڈے ہاتھ فخری کے ننگے بدن پر پھیر رہا تھا۔ میں بہت آہستگی سے اس کے پاس گئی، اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا، ''شہزادے، شرم کی بات ہے! کم از کم اپنے دادا حضور کی طرح نکاح ہی کر لو۔'' شہزادے نے منھ نہیں پھیرا، فخری کی گردن کو چومتا رہا۔ اپنا بازو میری کمر میں، فخری کی کمر میں، ڈالے ہوے تھا۔ بولا، ''میرے بچے نہیں ہوتا، فخر النسا۔'' میں نے کہا، ''اچھا، تو کم از کم اسے بستر پر ہی لے جاؤ۔ یہ کون سی جگہ

Scanned with CamScanner

ہے؟" شہزادہ بولا، "ٹھیک ہے۔ تم ذرا صبر کرو۔" میں کمرے سے باہر نکل گئی۔ وہ دونوں اسی طرح، اندھیرے کونے میں، ایک دوسرے سے لپٹے کھڑے رہے۔

بولی، "مجھے اس سے کیا، میں تو..."

اور نظر جما کر دیکھتی رہی۔ گردن بالکل سیدھی کر رکھی تھی۔ جب لپ اسٹک نہ لگائے ہوئے ہوں تو خانم کے ہونٹ کس قدر سفید لگتے تھے! ان کے دانت بھی بہت سفید تھے۔ اور چھوٹے چھوٹے۔

اس نے گلابی لپ اسٹک نکالی اور ہونٹوں پر لگائی۔ مجھے انتظار کرنا ہوگا، چاہے وہ صبح تک نہ آئے۔ اگر اس نے کتابیں جلوا نہ دی ہوتیں تو میں بھی خانم کی طرح... شہزادے نے کہا، "فخر النسا، تم نے اچھی پیشرفت کی ہے۔ اب تم جدِ اعلیٰ کی یادداشتیں..." خانم جب تھکی ہوئی ہوتیں تو کھڑکی کے پاس چلی جاتیں، اس کی چوکھٹ پر کہنیاں ٹکا کر باہر دیکھنے لگتیں۔ باہر اندھیرا تھا۔ باغ میں سے کاج اور یاسمین کے پھولوں کی خوشبو آ رہی تھی۔

زور سے بولیں، "فخری جان، تو جا، جا کر سو جا۔"

فخری پیچھے، کونے میں کھڑی تھی۔ اپنے ہاتھ پیش بند کی جیبوں میں ڈال رکھے تھے اور خانم کے، فخر النسا کے، دبلے کندھوں کو دیکھ رہی تھی۔ وہ حمام میں مجھے اس طرح کیوں دیکھا کرتی تھی؟ میرے بازوؤں کو، ٹانگوں کو؟ وہ میرے چھوٹے، گول پستانوں کو دیکھتی رہتی تھی۔ میرے بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے کہتی، "خانم، آپ کے بال کتنے نرم ہیں!" میں کہتی، "فخری، ذرا احتیاط سے، کہیں ان کو اکھاڑ نہ دینا۔"

اس نے ہاتھ بڑھا کر اپنے بالوں کو چھوا۔ نرم تھے۔ اٹھی۔ اب نہ کاج کی خوشبو آ رہی تھی نہ یاسمین کے پھولوں کی۔ ہر طرف جنگلی جڑی بوٹیاں پھیلی تھیں۔ اس نے وہ مکان کیوں بیچ ڈالا؟ حیدر علی باغبان سے، میرے بابا سے، بولا، "دفع ہو جا۔ میں نہیں چاہتا کہ آئندہ سے تو ان شمعدانیوں[18] کو..." وہ دیر سے گھر لوٹتا۔ مجھے اس وقت تک انتظار کرنا ہوتا تھا جب تک وہ نشے میں چور واپس نہ لوٹ آتا۔ ہمیشہ گاڑی کا ہارن بجاتا تھا۔ حیدر علی باغبان اور اس کی بیوی دونوں سو رہے ہوتے۔ میں جا کر دروازہ کھولتی۔ شہزادہ گاڑی کی کھڑکی میں سے سر نکال کر کہتا، "فخر النسا جان، اب تک جاگ رہی

18 گل شمعدانی: Geranium

Scanned with CamScanner

ہو؟ کتاب پڑھتی رہی ہوگی۔ ادھر میں نے آج جوئے میں سارو تقی گاؤں کا آخری چھٹا حصہ بھی ہار دیا ہے۔'' پھر ہنستا اور کہتا، ''ارے، یہ تو ہے، فخری! تیری خانم کہاں ہیں؟'' مجھے ہمیشہ فخر النسا کیوں کہتا ہے؟ فخر النسا کھڑکی کے پاس بیٹھی کاج اور یاسمین کے پھولوں کی خوشبو میں سانس لے رہی تھی۔ شہزادہ گاڑی سے اترتا تو وہ بغلوں میں ہاتھ دے کر اسے سہارا دیتی۔ وہ اپنا سر فخری کے کندھے پر رکھ لیتا۔ وہ اپنا بازو میری کمر میں، فخری کی کمر میں، ڈال لیتا۔ اس کے منھ سے کیسی بو آ رہی ہوتی! سر جل رہا ہوتا۔ میں اس کی جلتی ہوئی پیشانی سے پسینہ پونچھتی۔ زینے پر مراد خان شہزادے کو سنبھال لیتا اور سہارا دے کر اوپر لے جاتا۔ ان دونوں کا سایہ سیڑھیوں پر پڑ رہا ہوتا۔ شہزادہ گرا پڑ رہا ہوتا۔ مراد کہتا، ''شہزادے، یہ گھوڑے... یہ بگھیاں...'' شہزادہ کہتا، ''جہنم میں جائیں... جہنم میں جائیں...'' شہزادہ کہتا، ''مراد خان، اور کوئی مرا ہے کیا؟'' کاش میں ایک بار پھر کھڑکی کے باہر دیکھوں اور مجھے کاج اور یاسمین کی خوشبو محسوس ہو۔ اب تو یہاں صرف شمعدانی کے دو گملے ہیں اور ایک بید کا درخت، اور وہ بھی اس اونچی دیواروں والے مکان کے اندر۔ شہزادے نے وہ مکان کیوں بیچ ڈالا؟ مجھ سے اکیلے یہ سب نہیں سنبھالا جاتا۔ حیدر علی باغبان کو اس نے بیوی اور دو بچوں سمیت نکال باہر کیا۔ کہنے لگا، ''اس مکان کو باغبان کی ضرورت نہیں۔'' حیدر علی نے کہا، ''شہزادے، میں نے چالیس برس اس گھرانے کی نوکری کی ہے۔ اب میں کہاں جاؤں گا؟'' شہزادہ بولا، ''قبرستان۔'' حیدر علی نے کہا، ''اور میری بیٹی، شہزادے؟'' شہزادے نے کہا، ''فخری مر گئی، حیدر علی، فخری مر گئی۔'' اب باغیچہ خودرو جڑی بوٹیوں سے بھر گیا ہے۔ وہ بید کے درخت کی کمر تک پہنچ گئی ہیں۔ مجال ہے جو گل میخک کی ایک بھی شاخ دکھائی دے جائے! سوائے ان چھوٹے زرد پھولوں کے کچھ بھی نہیں۔ بس دو نیلوفر اور یہ ایک بیل جو بید کے درخت پر چڑھی ہوئی ہے۔ مجھے حوض کے پانی تک کو تازہ نہیں کرنے دیتا۔ کہتا ہے، ''میں چاہتا ہوں پانی ہمیشہ اسی طرح سبز رہے۔'' مچھلیاں ایک ایک کر کے مر رہی ہیں۔ ہر روز کوا ایک کو اٹھا لے جاتا ہے۔ جب میں کسی مچھلی کو سفید پیٹ اوپر کیے حوض میں تیرتے اور دوسری مچھلیوں کو اس کے ارد گرد چکر لگاتے دیکھتی ہوں تو مجھے رونا آ جاتا ہے۔ ایک روز میں صبح جلدی اٹھ بیٹھی تاکہ حوض کا پانی تازہ کر دوں۔ وہ سارا پانی۔ سوراخ کا ڈھکن تختی سے بند ہو چکا تھا۔ اور میں اکیلی عورت! میں نے بالٹیاں بھر بھر کر پانی باغیچے میں ڈالا۔ مچھلیوں کو ایک لگن میں جمع کیا۔ کتنی ساری مچھلیاں

تھیں! شہزادہ کھڑکی میں سے چلایا، ''میں نے کہا نہیں تھا کہ مجھے پانی نہیں بدلوانا؟'' اس نے پمپ چلا کر پانی دوبارہ حوض میں بھر دیا۔ باہر جاتے وقت پھاٹک میں تالا ڈال دیتا ہے۔ کسی اور کو کام پر ہی رکھ لے کہ کم سے کم مجھ سے بات کرنے والا تو کوئی ہو! اگر فخری ہوتی...

وہ اٹھی۔ اپنے کمرے کا دروازہ بند کیا اور زینے سے اوپر گئی۔ یہ کیوں کہتا ہے، ''مراد خان، اور کوئی مرا ہے کیا؟'' اب تو شہزادے کا کوئی بھی نہیں رہا۔ سوائے اکادکا سگے سوتیلے عم زادوں یا عم زادیوں کے۔ اور برسوں سے اس نے کسی کی شکل نہیں دیکھی۔ اور مجھے ایک بار جو کہیں باہر لے کر گیا ہو۔ اور ہنستا کیسے تھا! میرا حلق جلنے لگا۔ کڑواہٹ محسوس ہوئی۔ میں نے کہا، ''شہزادے، مجھے نہیں پینا۔'' کہنے لگا، ''فخر النسا، تمھیں پینا ہوگا۔'' یہ کہہ کر مجھے مارا۔ ہمیشہ الٹے ہاتھ کا تھپڑ مارتا تھا، چہرے پر، اس طرف۔ پہلے میرا ماتھا جلنے لگا، پھر ہاتھ جلنے لگے۔ شہزادہ بولا، ''اور پیو، فخر النسا۔'' میں نے کہا، ''میرا دل نہیں چاہتا۔'' اس نے مجھے گھور کر دیکھا۔ میں ڈر گئی۔ یہ اتنا دبلا کیوں ہو گیا ہے؟ بالکل سرکنڈے کی طرح۔ میں نے پی۔ حلق پھر جلنے لگا۔ شہزادے کا سر بار بار ہل رہا تھا۔ وہ میز کے دوسری طرف گیا، کرسی پر بیٹھا اور کہنے لگا، ''ایک ایک گھونٹ کر کے پیو۔'' خود بھی پینے لگا۔ میں بھی پینے لگی۔ شہزادہ کتنی دور تھا! تینوں فانوس نیچے کو گر رہے تھے، ڈول رہے تھے۔ بولا، ''فخر النسا، میں نے کہا ہے، پیو۔'' اب واقعی پینے کو میرا دل چاہ رہا تھا اور میرا ہاتھ خود بخود لمبے پائے والے ساغر کی طرف بڑھا جو اب تک آدھا بھرا ہوا تھا۔ میرا ہاتھ اس کے برابر سے نکل گیا، پھر واپس آیا۔ میں نے ساغر اٹھایا۔ شراب ٹھنڈی تھی۔ اور تلخ۔ بدن میں گرمی دوڑا دیتی تھی۔ شہزادہ بہت دور تھا۔ میں گویا اسے حوض کے پانی کے اُس پار دیکھ رہی تھی۔ پانی میں لہریں اٹھ رہی تھیں۔

وہ منڈیر پر ہاتھ رکھ کر اوپر کو اٹھا۔ کیسا ہنس رہا تھا! میں رونے لگی۔ بولا، ''فخر النسا، تمھارے لیے اچھا ہے... روؤ، اور روؤ! لیکن جو بچی ہے اسے بھی پینا ہوگا۔'' میں نے کہا، ''میرا دل نہیں چاہ رہا۔ میرے سر میں...'' چیخ کر بولا، ''پینا ہوگا!'' میں نے کہا، ''نہیں، نہیں پیوں گی۔'' وہ اٹھا۔ ٹھگنا تھا۔ اس نے اپنے بازو کو حرکت دی۔ اس کا چہرہ نزدیک، اور نزدیک آ گیا۔ حوض کا پانی زور زور سے لہریں لینے لگا۔ اس نے میرا سر پکڑ کر میرے منھ میں انڈیل دی، مگر چھلک کر میرے پستانوں پر گری اور میرا پیراہن تر ہو گیا۔ میں نے کہا، ''شہزادہ جان، میرا پیراہن!'' بولا، ''جہنم میں جائے! ایک اور...''

Scanned with CamScanner

میں نے کہا، ''مجھے یہ پیراہن اچھے نہیں لگتے۔ کم از کم ایک اور پیراہن، دوسری طرح کا مجھے خرید دو۔'' بولا، ''چاہو تو فخری کے کپڑے پہن لو اور سر پر اس کا رومال باندھ لو!'' میں نے کہا، ''نہیں، میں ایسا نہیں کر سکتی۔ میرے ہاتھوں میں وہ سب کام کرنے کی طاقت نہیں ہے۔''

شہزادہ اپنی آرام کرسی میں بیٹھا تھا۔ سر کو ہاتھوں میں تھامے ہوئے تھا۔ جانتا تھا کہ اس وقت فخر النساء دروازے کے پیچھے کان لگائے کھڑی ہے، اور وہ کھانسا۔ دروازہ کھلا اور فخر النسا نے بتی جلائی۔ یہ ہمیشہ اس کمرے میں کیوں بیٹھا رہتا ہے؟

شہزادے نے فرش پر پیر پٹکا۔ ''کیا میں نے تجھے اوپر آنے سے منع نہیں کیا تھا، فخری؟''

سر اس نے اب تک ہاتھوں میں تھام رکھا تھا۔ فخری اس کے پیر پٹکنے سے اٹھنے والی گرد تک کو سونگھ سکتی تھی۔ اس کمرے میں کیا کرتا رہتا ہے؟

اس نے بتی بجھادی۔ کمرہ پھر تاریک ہو گیا۔ اس نے یہ تصویریں دیوار پر کیوں ٹانگ دیں؟ فخر النسا نے گل میخک اپنے دہن کے کونے میں دبا رکھا تھا۔ یہ باغیچہ تمام خودرو جڑی بوٹیوں سے بھر گیا ہے۔ اور ان چھوٹے زرد پھولوں سے۔ مجھے اپنے ہونٹوں کے کونے میں نیلوفر کا پھول دبا لینا چاہیے۔

اس نے دروازہ بند کر دیا تھا اور اب زینے کے سرے پر کھڑی تھی۔ آج اسے کیا چیز کھائے جا رہی ہے؟ اس کے منھ سے تو کوئی بو نہیں آ رہی تھی۔ اب تو بہت دنوں سے اس نے عرق پینا چھوڑ دیا ہے۔ عرق آدمی کو گرم کر دیتا ہے اور پھر فخر النسا بننے میں کچھ بھی کوشش نہیں کرنی پڑتی۔

وہ دو دو سیڑھیاں اترتی ہوئی نیچے آ گئی۔ کھانے کے کمرے میں گئی۔ یہ اچھا ہے کہ اس نے کم از کم ان فانوسوں اور قالینوں کو نہیں بیچ ڈالا۔ پرندوں کے نقوش والے کتنے سارے چینی کے برتن تھے! الماری کے خانوں میں کتنی رکابیاں، قابیں اور گلدان رکھے تھے۔ وہ آئینے والی قاب جس کے بیچ میں ایک بڑا سا روشن نقش تھا۔ وہ نقرئی جھالر والی مرصع دوات۔ فخر النسا کہتی تھی، ''اس پر فیروزے جڑے ہیں۔'' یہودی نے کہا، ''شہزادے، فانوسوں کے لیے بھی میرے پاس ایک اچھا خریدار ہے۔''

وہ زور سے بولی، ''قبر میں جائے وہ!''

وہ میز کے پاس بیٹھ گئی۔ اس کے مقابل، میز کے دوسری طرف، شہزادے کی کرسی خالی تھی۔ مجھے کچھ نہ کچھ کھا لینا چاہیے۔ میں اکیلے یہ سب کام نہیں کر سکتی، اور وہ بھی خالی پیٹ!

Scanned with CamScanner

اس نے اپنے لیے کھانا نکالا۔ اتنا سارا کھانا، یہ ہمیں کس لیے چاہیے؟ وہ ہمیشہ کہا کرتا ہے، ''تجھ سے کوئی مطلب نہیں۔'' اگر وہ گھر آ جاتا تو میں اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھتی۔ نہ آتا تو... باورچی خانے میں تو مجھ سے کچھ نگلا نہیں جاتا۔

اس نے زانو پر رومال پھیلا لیا۔ خانم کیسے اچھے انداز سے کھانا کھاتی تھیں! آہستہ آہستہ۔ اپنی لمبی سفید انگلیوں سے چمچ اور کانٹا پکڑتیں اور ہر کھانے میں سے ذرا ذرا سا نکالتیں۔ ایک ایک گھونٹ پیتیں اور لمبے پائے والے ساغر کو خالی کر دیتیں۔ میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ انھیں چڑھ گئی ہو۔ وہ کہا کرتی تھیں، ''شہزادے، اپنے بڑھاپے کی کچھ فکر کر لو۔ میں تو چلی جاؤں گی۔'' شہزادے نے کہا، ''جدِاعلیٰ بہت املاک اور جاگیر والے تھے۔ دادا حضور اور ابا حضور اپنی تمام کوششوں کے باوجود اس کو ٹھکانے نہ لگا سکے۔'' فخرالنسا بولی، ''تو تمھارا خیال ہے کہ...؟'' شہزادے نے کہا، ''ہاں۔'' فخرالنسا نے پوچھا، ''جوئے کی میز پر؟'' شہزادے نے کہا، ''یہی واحد راستہ ہے۔'' فخرالنسا بولی، ''تو پھر کم از کم چند باکرہ لڑکیاں ہی...'' شہزادے نے کہا، ''میں اس کا اہل نہیں۔'' میں بولی، ''تو صفائی ستھرائی کے لیے ایک نوکرانی ہی رکھ لو۔'' شہزادے نے کہا، ''تو پھر فخری کس کام کے لیے ہے؟ اور ہم ہیں ہی کتنے نفر؟'' میں نے کہا، ''مگر، وہ اکیلی...'' شہزادہ بولا، ''سنبھال لے گی۔ تم اس کی فکر مت کرو۔ اپنی شراب پیو۔'' میں نے کہا، ''اور قیامت کے دن...'' شہزادے نے چیخ کر کہا، ''وہ سب بکواس ہے۔ تم اپنی شراب پیو، فخرالنسا!''

اس نے شراب کا ایک گھونٹ لیا۔ اس کا ذائقہ اب بہتر ہو گیا تھا۔ اب میں ایک شام بھی پیے بغیر نہ رہ سکتی تھی۔

اس نے پھر ایک گھونٹ لیا۔ شہزادہ بولا، ''تھوڑی تھوڑی کر کے پیو، تاکہ اثر کرے۔''

اس نے ایک اور گھونٹ لیا۔ میں نہیں کر سکتی۔ وہ خود تو تیز تیز پیتا ہے اور مجھے آہستہ آہستہ... اگر یہ کسی باغبان کو رکھ لے تو حوض کا پانی تو...

شہزادہ احتجاب نے ساغر ہاتھ میں اٹھا رکھا تھا۔ شراب گہرے سرخ رنگ کی تھی اور اس کی گدلاہٹ تہ میں بیٹھ گئی تھی۔ فانوس اتنے نیچے آ گئے تھے کہ گویا میز پر دھرے ہوں۔ اور فخری — نہیں، فخرالنسا — کانچ کے ان رنگ برنگے ٹکڑوں میں ہزاروں ٹکڑوں میں بٹی ہوئی دکھائی دے رہی

Scanned with CamScanner

تھی۔ صرف اس کی آنکھیں سالم نظر آتی تھیں۔ وہی آنکھیں جو اس کی پھولدار چادر کے چوکھٹے میں تھیں۔ سیاہ اور زندہ۔

لمبے پائے والا ساغر خالی ہو چکا تھا۔ اس نے اور انڈیلی۔ میں نے بہت کہا، ''فخری جان، جب شہزادہ تجھ سے چھیڑ چھاڑ کرے تو تو اتنے زور زور سے مت ہنسا کر۔'' لیکن لڑکی کو کچھ خیال ہی نہیں۔ کیسی موٹی کمر ہے اور کتنے بھاری چوتڑ۔ وہ ہنسے جاتی۔ آدھی رات کو جب شہزادہ لوٹتا تو سیدھا فخری کے کمرے میں جاتا، اسی پرانے پلنگ پر۔ فخری کو لپٹا لیتا۔ فخری کے بازو اپنی گردن میں ڈال لیتا اور اپنا سر اس کے بالوں میں دے لیتا۔ کہتا، ''فخری، اتنے زور زور سے ہنس کہ مجھے فخر النسا کے کھانسنے کی آواز نہ سنائی دے۔ زور زور سے!'' فخری ہنستی۔ کہتی تھی، ''فخر النسا خانم، آپ اتنی دبلی کیوں ہیں؟ کہتیں کیوں نہیں کہ ڈاکٹر ابونواس کو بلا کر آپ کا معائنہ کرائیں؟ کم از کم اتنی شراب تو نہ پیا کریں۔'' میں نے کہا، ''کیا فائدہ؟ یہ موروثی سل ہے۔ دادا حضور، شہزادے کی دادی، اس کی اماں، سب کو تھی۔ بس پھیپھیاں... میرے بابا اتنی شراب پیتے تھے، اتنی افیون کھاتے تھے کہ ہڈیوں کا ڈھانچہ ہو گئے تھے۔ چالیس سال سے بھی کم عمر میں ان کے سارے بال سفید ہو گئے تھے۔''

اس نے ایک اور گھونٹ لیا۔ شہزادہ وہیں بیٹھا ہوا تھا، سر جھکائے۔

''شہزادے، میں کچھ نہیں جانتی۔ لیکن ایسا لگتا ہے کہ تمھارے پاس اب کچھ بھی نہیں بچا ہے۔''

پھر پینے لگی۔ فخر النسا کس قدر بے رحم تھی! کہتی تھی، ''شہزادے، کم از کم یہ ہار اور یہ چوڑیاں تو...'' بولا، ''ٹھیک ہے۔ یہ سب تمھارا مال ہے۔''

لمبے پائے والا ساغر خالی ہو چکا تھا۔ فخر النسا اٹھی۔ وہ بالکل ہلکی ہو چکی تھی۔ سفید جالی کا پیراہن اس کے بدن پر ڈھیلا تھا، یہاں تک کہ کندھوں پر بھی۔ بولی:

''شہزادے، کسی نوکرانی کو ضرور رکھ لو۔''

شہزادے نے کہا، ''ایک لڑکی دیکھی ہے۔ فخری نام ہے۔ اسی باغبان کی بیٹی ہے جسے میں نے نکال دیا تھا۔ کیا خیال ہے؟''

کہنے لگی، ''ٹھیک ہے۔ تو پھر اس سے کہو میز صاف کر دے۔''

شہزادے نے کہا، ''ٹھیک ہے۔ تم جا کر سو جاؤ، فخر النسا۔''

Scanned with CamScanner

فخرالنسادروازے کی طرف جاتے ہوئے بولی، ''فخری جان، کام ختم کر کے اوپر آجانا۔''
وہ بڑے کمرے میں گئی اور وہاں سے زینہ چڑھ کر اوپر چلی گئی۔ شہزادے کو گھر لوٹنے میں پھر دیر ہو گئی تھی۔ لیکن میں انتظار کروں گی، چاہے کچھ بھی وقت ہو جائے۔ اس نے کتابیں کیوں جلوا دیں؟ ابھی تو میں نے غلطی کیے بغیر پڑھنا سیکھا تھا۔ جب اسے لوٹنے میں دیر ہو جاتی تو میں کھڑکی کے پاس بیٹھ کر پڑھنے لگتی۔

''سپاہی اس پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ اس کے کپڑے پھاڑ دیتے ہیں۔ قلم تراش سے اس کا گوشت کاٹ لیتے ہیں اور زخموں میں موم بتیاں لگا دیتے ہیں۔ الغوزہ بجایا جا رہا ہے۔ یقیناً لوگ جمع ہو گئے ہوں گے اور اس کے منھ پر تھوک رہے ہوں گے۔ وہ موم بتیاں جلاتے ہیں۔ دو سپاہی اس کی بغلوں میں ہاتھ دے کر اسے لے چلتے ہیں۔ لوگ تالیاں بجا رہے ہیں۔ دادا حضور اوپر محل کے بالا خانے پر سے دوربین لگا کر دیکھ رہے ہیں۔ موم بتیاں جل رہی ہیں اور لوگ... موم بتیوں سے جلتا ہوا موم ٹپک ٹپک کر ضرور اس کی کھال پر گر رہا ہوگا۔ کون تھا؟ مدرسے کے طلبا بھی اس پر تھوکتے ہوئے کہہ رہے ہوں گے: ملعون خبیث!''

وہ خواب گاہ میں چلی گئی۔ جانتی ہوں کیا چیز کہاں ہے، مجھے روشنی کی ضرورت نہیں۔
جا کر بستر پر بیٹھ گئی۔ جوتے اتار دیے اور ٹانگ پر ٹانگ رکھ لی۔ اس کے پیر جل رہے تھے۔ میں نے کہا، ''فخری جان، شہزادہ ابھی تک نہیں لوٹا؟'' بولی، ''نہیں۔'' میں نے کہا، ''تو فون کر کے ڈاکٹر ابونواس کو بلا لے۔'' بولی، ''شہزادے نے فون کٹوا دیا ہے۔'' پھاٹک پر تالا بھی ڈال دیا تھا۔ یہ سب کیوں کر رہا تھا؟ صبح چلا جاتا اور آدھی رات کو لوٹتا۔ سیدھا میرے کمرے میں، فخری کے کمرے میں۔ کہتا، ''ہنس، زور زور سے ہنس، فخری!'' اگر میں نہ ہنستی تو میرے تلووں میں یا بغلوں میں گدگدی کرتا۔ سر میرے پستانوں کے درمیان دبا لیتا اور کانوں پر ہاتھ رکھ لیتا۔ اس وقت میں اور فخری، نہیں، میں اور فخرالنسا، دو اکیلی عورتیں، دن بھر اس اونچی دیواروں والے مکان میں بند۔ فخرالنسا میری طرف دیکھتی، کنکھیوں سے، اپنی اس عینک کے شیشوں کے پیچھے سے۔ میں کہتی، ''خانم، میری کچھ خطا نہیں۔'' کہتی، ''میں جانتی ہوں، تو اچھی ہے۔'' اور پھر کھانسنے لگتیں۔

وہ بستر پر سیدھی لیٹ گئی۔ کاش میں نے بتی جلا لی ہوتی۔ اگر شہزادہ آتا ہے تو خود ہی جلا لیتا

Scanned with CamScanner

ہے۔ کہتا ہے، ''فخر النسا، سوگئیں؟'' میں سوتی بن جاتی ہوں۔ آ کر میرے برابر میں لیٹ جاتا ہے۔ اسے کیوں ہمیشہ یہی خواہش رہتی ہے...؟ میری انگلیاں تک چومتا ہے۔ اس رات کیسا ہنگامہ کیا تھا! میں نے کہا، ''کیا کروں؟ اکیلے اتنا سارا کام...'' بولا، ''اس کام سے تمھیں کیا مطلب؟ میں پیسے دیتا ہوں تا کہ فخری گھر کا سب کام کرے اور تم بیٹھی سجا سنورا کرو یا کتاب پڑھا کرو۔ پانچ سال سے صبح سے رات تک کوشش کر رہا ہوں کہ تمھارے سر میں کوئی بات گھسے۔'' اس وقت میں آدھی رات کو اٹھی اور خود کو دھویا۔ کتنا ہی خود پر عطر ملا، بالوں پر، سینے پر، ہاتھوں پر۔ مگر اس کی بو کہیں جاتی تھی! وہ آتشدان کے پاس بیٹھا تھا اور کتابوں کو آگ میں پھینک رہا تھا۔ کہہ رہا تھا، ''فخر النسا، انگاروں کو کریدو تا کہ سب کچھ اچھی طرح جل جائے۔ میں نہیں چاہتا کہ تم بھی...'' میں نے کہا، ''شہزادے، یہ بہت قیمتی ہیں۔'' بولا، ''انگاروں کو کریدو، فخر النسا!'' اس نے تصویر میرے منھ کے سامنے کر دی۔ ''جدِ اعلیٰ کو دیکھو۔'' اس کے جدِ اعلیٰ دوزانو بیٹھے تھے اور دونوں ہاتھ اپنی فربہ رانوں میں دیے ہوئے تھے۔ کمر کے پیچھے دو یا شاید تین تکیے رکھے تھے۔ مرصع تخت پر بیٹھے تھے، شہزادے نے بتایا۔ تلوار ان کی ٹانگ کے پاس رکھی تھی۔ ان کی مونچھیں گھنی تھیں اور ان کی نوکیں چمک رہی تھیں۔ آنکھیں گھنی بھنوؤں میں دکھائی نہ دیتی تھیں۔ ہنس رہے تھے۔ اتنے زور زور سے ہنس رہے تھے کہ مجھے ڈر لگنے لگا۔ اس نے کتاب بند کر کے آگ میں ڈال دی جو بھڑک اٹھی تھی۔ مجھے گرمی لگ رہی تھی۔ اس نے سرِ شام یہ سلسلہ شروع کیا تھا۔ پیے ہوئے نہیں تھا۔ ساری کتابیں! اور کیسی جل رہی تھیں! میں انگاروں کو اوپر نیچے کر رہی تھی۔ آگ بھڑک رہی تھی۔ میرے ہاتھ جلنے لگے تھے۔ چہرہ جھلس گیا تھا۔ خود وہ کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ کتابیں اس کے اردگرد ڈھیر ہوئی رکھی تھیں، جیسے اینٹیں چنی ہوئی ہوتی ہیں۔ ایک ایک کو اٹھاتا اور آگ میں پھینک دیتا۔ کہتا، ''فخر النسا، انگاروں کو کریدو!'' کیا یہ سلسلہ کبھی ختم ہوگا؟ کتابیں صرف باہر باہر سے جل رہی تھیں۔ اندر کا حصہ ویسے کا ویسا سفید تھا۔ میں انھیں اوپر نیچے کر رہی تھی۔ کاغذ سرخ ہوتے، سکڑتے، کالے پڑ جاتے اور بھڑک کر جلنے لگتے۔ مجھے گرمی لگ رہی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا، ''انگاروں کو کریدو، فخر النسا!'' جدِ اعلیٰ کی یادداشتوں کی کتاب تھی۔ اس کی چرمی جلد ذرا بھی نہیں جلی۔ شہزادے نے کہا، ''وہ یقیناً یہ لکھنا بھول گئے ہوں گے کہ انھوں نے ان لوگوں کو زندہ چونے میں چنوانے کا حکم دیا تھا۔ یہ بھی لکھنا بھول گئے ہوں گے کہ کس طرح اُس لڑکے کا گلا ایک کان سے

دوسرے کان تک کٹوا دیا تھا۔ واقعی فخر النسا، تمھیں نہیں معلوم کہ دادا حضور نے اپنی ماں کو کیوں قتل کیا، اور وہ بھی آقا کے گھر کے اندر؟'' مجھ سے کیوں پوچھتا ہے؟ فخر النسا خانم کو خود نہیں معلوم تھا۔ مگر کہتی تھیں، ''شاید باغبان کے ساتھ سوئی ہوگی، یا...'' ماں اپنے بیٹے کا ہاتھ پکڑ کر جدِ اعلیٰ کے حضور میں لاتی ہے۔ کہتی ہے، ''حضور، معلوم نہیں کیا خرابی ہے، میری بات ہی نہیں سنتا، ہر وقت اپنے کبوتروں میں لگا رہتا ہے، مکتب سے بھاگتا ہے۔ ذرا سپاہیوں کو بلوا کر...'' جدِ اعلیٰ چیخ کر بولے، ''میر غضب حاضر ہو!'' اس نے تصویر میری آنکھوں کے سامنے کر دی۔ دراز قد تھا، گھنی مونچھیں، لمبا چغہ، پیروں میں بوٹ۔ شہزادہ بولا، ''اس کا لباس سرخ تھا۔[19] تصویر میں پتا نہیں چلتا۔'' ہاتھ سینے پر رکھے کھڑا تھا۔ میر غضب حاضر ہوا۔ بچے کو زمین پر بٹھا دیا۔ جدِ اعلیٰ کہتے ہیں، ''وعدہ کر، بچے، کہ اب کبوتر نہیں اڑائے گا۔'' یہ کہہ کر وہ زور زور سے پیر مار کر ٹہلنے اور اپنے لمبے بوٹوں پر بار بار چابک مارنے لگتے ہیں۔ میر غضب اپنے بائیں ہاتھ کی دو انگلیاں لڑکے کی ناک میں گھسیڑ کر اس کا سر اوپر اٹھاتا ہے اور داہنے ہاتھ سے خنجر کا تیغہ اس کے گلے پر رکھ لیتا ہے۔ جدِ اعلیٰ زور زور سے پیر مار کر ٹہلتے جاتے ہیں اور اونچی آواز میں کہتے ہیں، ''لڑکے! وعدہ کر کہ مکتب پابندی سے جائے گا، ہاں؟'' یہ کہہ کر وہ چابک کو زور سے اپنے بوٹ پر مارتے ہیں۔ میر غضب زمین پر دو زانو بیٹھے لڑکے کی رانوں پر اپنا پیر رکھ کر اسے دبا لیتا ہے۔ لڑکا میر غضب کے بازو سے چمٹا ہوا ہے۔ اس کے منھ سے کوئی آواز نہیں نکلتی۔ اس کا منھ ضرور کھلا ہوا ہوگا۔ ورنہ وہ سانس کیسے لیتا؟ شاید وہ خرخرایا ہو یا کچھ بولا ہو جو کسی کو سنائی نہ دیا ہو۔ جدِ اعلیٰ کہتے ہیں، ''وعدہ کر کہ آئندہ سے اپنی ماں کا کہنا مانے گا!'' یہ کہہ کر چابک پھر اپنے بوٹ پر مارتے ہیں۔ شہزادے نے بھی یہی کیا۔ لڑکے کی ماں، یہ دیکھ کر کہ اس کا بیٹا فقط خرخرا رہا ہے، کہتی ہے، ''نہ جانے کیا بات ہے، حضور، اب اسے چھوڑ دیجیے۔ اپنے اقبال سے کام لے کر اسے بخش دیجیے۔'' جدِ اعلیٰ چیخ کر کہتے ہیں، ''میر غضب، اپنا ہاتھ روک لے!'' لیکن میر غضب خنجر ایک کان سے دوسرے کان تک پھیر دیتا ہے اور سر کاٹ کر جدِ اعلیٰ کے قدموں میں ڈال دیتا ہے۔ شہزادہ بولا، ''اس روز تک کسی میر غضب نے ایسا حکم نہ سنا تھا: اپنا ہاتھ روک لے!... انگاروں کو کریدو، فخر النسا!'' میں کریدنے

---

19 قاجار دور کے ایران میں کوئی شخص سرخ لباس نہیں پہنتا تھا سوائے جلادوں اور کربلا کے واقعات پر مبنی ناٹک (تعزیہ) کے بدکرداروں کے۔

Scanned with CamScanner

لگی۔ کتنی ساری کتابیں تھیں! میں صبح تک آگ کے پاس بیٹھی رہی۔ شہزادہ بولا، ''فخر النسا، یہ جدِ اعلیٰ کی توصیف ہے۔ اور یہ سفرنامۂ خراسان۔'' اس کے بعد تین تین کتابیں اٹھا اٹھا کر آگ میں پھینکنے لگا اور چیخ کر کہنے لگا، ''انگاروں کو کریدو، فخر النسا!'' آتشدان میں اتنی ساری راکھ جمع ہو گئی تھی۔ شہزادہ اسی طرح بیٹھا تھا، اسی کمرے میں، اسی کرسی پر۔ تصویروں کو چوکھٹوں میں جڑوا کر اس نے کمرے کی دیواروں پر ٹنگوا لیا۔ کہنے لگا، ''تم نے کہا کیوں نہیں کہ میں جدِ اعلیٰ کی تصویر نہ جلواتا۔ ان سب تصویروں کے ساتھ وہ کتنی اچھی لگتی۔'' میں نے کہا، ''مجھے کیا معلوم تھا... ''مکان کا دروازہ کبھی نہیں کھولنے دیتا۔ اتنی اونچی دیواریں اور بید کا یہ درخت۔ اگر یہ اجازت دے تو کوئی آ کر حوض کا پانی ہی بدل دے... بے چاری مچھلیاں! کہتا ہے، ''تو اس کمرے میں ہرگز مت جانا!'' میں کہتی ہوں، ''مگر شہزادے، تصویروں پر اتنی گرد جم رہی ہے۔''

وہ ہر رات اس کمرے میں چلی جاتی ہیں، بالکل تنہا۔ کتنا کھانستی ہیں! کتاب پر جھکی ہوتی ہیں۔ میں ان کے کندھے پکڑ لیتی ہوں۔ جب کھانسی کا دورہ ختم ہوتا ہے تو وہ اپنے سفید اور چھوٹے ہاتھوں سے میرے ہاتھ پکڑ لیتی ہیں۔ کہتی ہیں، ''تو بہت اچھی ہے، فخری جان!'' اور میں ہوں کہ کیا کیا کرتی تھی، اور ان کی نظروں کے سامنے! کیوں کرتی تھی میں ایسا؟ جب فخر النسا خانم، اوپر، اپنی فکروں میں گم... ان کا رنگ کیسا ہو گیا تھا! وہی جیسا۔ وہ ہمیشہ میری تاک میں رہتا۔ میرے بستر میں گھس آتا۔ میں کہتی، ''شہزادے، یہ اچھی بات نہیں کہ آپ...'' وہ کہتا، ''کیا اچھی بات نہیں... میرے جدِ اعلیٰ... ''ہمیشہ وہی جدِ اعلیٰ کی بات، وہی تصویر میں دوزانو بیٹھے ہوئے، گھنی مونچھوں اور مرصع چغے والے، وہی چغہ جس کے سینے پر مروارید ٹکے ہوئے تھے۔ زندہ لوگوں کو چونے میں کیوں چنوا دیتے تھے؟ فخر النسا خانم ہر وقت یہی سب پڑھا کرتی تھیں اور روز بروز دبلی ہوتی جاتی تھیں۔ اور میں شہزادے کے ساتھ، وہ بھی ان کے سامنے، اور پھر اپنی خانم کی نعش کے سامنے۔ مگر اس میں میری کیا خطا تھی؟ وہ میرے پہلو میں آ جاتا۔ اور میں کبھی نہ نہیں کہہ سکی۔ بولا، ''ہنس، زور زور سے ہنس، میں چاہتا ہوں وہ تیرے ہنسنے کی آواز سنے!'' میں ایسا کیسے کر سکتی تھی؟ فخر النسا خانم اوپر تھیں، اپنے بستر پر۔ خون... میں نے کہا، ''شہزادہ جان، خانم آج سہ پہر چل بسیں۔'' خانم کی آنکھیں بالکل خالی تھیں۔ اس نے مجھے چمٹا لیا۔ اس میں اتنا زور کہاں سے آ گیا؟ مجھے اٹھا کر زینے سے اوپر لے گیا،

ساری سیڑھیاں چڑھتا ہوا۔ دروازہ کھٹکھٹایا۔ بولا، ''اندر آ سکتا ہوں؟'' میں نے کہا، ''شہزادے، میں نے بتایا ہے، ان کی آنکھیں کمرے کی چھت پر جمی ہوئی ہیں۔'' خون ان کے دہن کے کونے سے بہتا ہوا ان کے تل پر آ رہا تھا۔ کیسی آنکھیں! شہزادہ ہنسا اور بولا، ''یہ اور بھی بہتر ہے۔'' اور دروازہ کھول دیا۔ بجلی کا بٹن دبایا۔ فخر النسا خانم اپنے پیلے پڑے رنگ کے ساتھ، بستر پر بالکل سیدھی لیٹی ہوئی تھیں۔ ان کے منھ کے کونے پر خون سوکھ کر جم گیا تھا۔ عینک کے دھندلے شیشوں کے پیچھے ان کی آنکھیں اب تک کھلی ہوئی تھیں، دو سفید پیالوں کی طرح۔ میں نے کہا، ''شہزادے، وہ ختم ہو گئیں۔'' بولا، ''تو چپ رہ!'' شہزادے نے چادر کھینچ کر ان کے چہرے کو ڈھانک دیا۔ پھر ان کے دبلے اور ہلکے بدن کو اٹھا کر کمرے کے کونے میں فرش پر لٹا دیا۔ چادر ہٹ گئی اور خون پھر بہہ کر فخر النسا کے گال پر آنے لگا۔ شہزادے نے ان کی عینک اتار کر ایک طرف اچھال دی۔ کیسی آنکھیں! خون چادر میں سے رس رہا تھا۔ میں خانم کے پاس بیٹھ گئی۔ روئی نہیں۔ اپنا چہرہ پیش بند سے ڈھانپ لیا تاکہ خانم کو نہ دیکھوں، وہاں، اس سفید چادر کے نیچے لیٹے ہوئے... شہزادے نے گردن کے نیچے سے مرا پیراہن پکڑ کر پھاڑ ڈالا۔ میں جھک گئی، خانم کے اوپر۔ بولی، ''کیا کر رہے ہو، شہزادے!'' اس نے مجھے لات ماری۔ میں کمرے کے بیچوں بیچ، چت گر پڑی۔ اس نے میرا پیش بند پھاڑا، پھر پیراہن بھی سامنے سے پھاڑ دیا۔ پھر شمیز بھی پھاڑ ڈالی۔ کیسی آنکھیں! سرخ، دو خون بھرے پیالوں جیسی! وہ بولا، ''جلدی کرو، کپڑے پہنو!'' اس کے ہاتھ میں خانم کا سفید جالی دار عروسی پیراہن تھا۔ اس نے پیراہن میرے بدن پر ڈال دیا۔ میں ننگی تھی۔ میں نے کہا، ''شہزادے، خدا کے لیے ایسا مت کرو!'' اس نے میرا بازو پکڑ کر اٹھایا اور کھڑا کر دیا۔ اس نے مجھے دونوں ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور زور سے پانچوں انگلیوں کا تھپڑ مارا۔ کہنے لگا، ''دیکھو فخر النسا، دیکھو، فخری مر گئی، مر گئی!'' اس نے سر کے پیچھے میرے بال پکڑ رکھے تھے۔ خون رس رہا تھا۔ میں نے کہا، ''رحم کرو، شہزادے! خانم...'' اس کے ہاتھ میں سفید پیراہن تھا۔ خانم کا پیراہن۔ بولا، ''بیٹھ جاؤ!'' میں آئینے کے سامنے بیٹھ گئی۔ آئینے میں اب تک فخری تھی جو رو رہی تھی۔ خانم کی سنگھار کی چیزیں میز پر رکھی تھیں۔ آئینے کے سامنے میں نے اپنے بالوں میں کنگھی کی۔ پھر میں نے تل لگایا۔ اپنے ہاتھ سے نہ لگا سکی۔ میرا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ شہزادے نے کہا، ''تل اپنے ہونٹوں کے بائیں طرف لگاؤ، فخر النسا۔'' اپنے ہاتھ سے نہ لگا سکی۔ اس نے خود لگایا۔

Scanned with CamScanner

شہزادے کے ہاتھ نہیں کانپ رہے تھے۔ وہ آئینے میں مجھے دیکھ رہا تھا۔ مسکرا رہا تھا۔ اپنے انگوٹھے سے اس نے میرے آنسو پونچھے۔ خانم آئینے میں نہیں تھیں۔ فخری تھی۔ رو نہیں رہی تھی۔ کاش میں کھانس رہی ہوتی، اپنی خانم کی طرح۔ اس نے مجھے چمٹا لیا اور بستر کی طرف لے چلا۔ خود بھی میرے پہلو میں لیٹ گیا، ننگا۔ ہنس رہا تھا اور میرے تن بدن پر، ٹانگوں پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ اپنا سر اس نے میرے بالوں میں دے لیا۔ میں نے سر گھما کر دیکھا۔ خانم وہیں تھیں، سیدھی لیٹی ہوئی، اسی سفید چادر کے نیچے، جس میں سے خون رس رہا تھا۔ خانم کی عینک کمرے کے کونے میں، قالین پر پڑی تھی۔ ان کی کتابیں ہر طرف، الماری کے خانوں میں، طاقچوں میں، میز پر، پڑی ہوئی تھیں۔ شہزادے نے میرا چہرہ پکڑ کر واپس پھیرا، مجھے گدگدی کی، بولا، ''ہنسو، فخر النسا، ہنسو!'' میں نے پھر خانم کو دیکھا اور اس خون کو جو ایک بار پھر بہنے لگا تھا۔ خانم کا بدن لمبا اور دبلا تھا۔ شہزادے نے میرے منہ پر تھپڑ مارا اور چیخا، ''فخر النسا، جان، تم ایسی تو نہ تھیں!'' میں نے کہا، ''میں فخر النسا نہیں ہوں۔'' وہ آگے بڑھنا چاہتا تھا۔ میں نہیں چاہتی تھی۔ فقط خانم کی طرف دیکھ رہی تھی اور ان کی عینک کی طرف جو قالین کے بڑے سے نقش کے کونے پر پڑی تھی۔ بولا، ''تم زور زور سے کیوں نہیں ہنستیں، فخر النسا؟'' اس کا ہاتھ میرے بازو پر تھا اور وہ میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اپنے بائیں بازو کو ستون بنائے، اس کی ٹیک لیے ہوئے تھا۔ اب میں خانم کی عینک نہیں دیکھ پا رہی تھی۔ بولا، ''ڈرتی ہو، فخر النسا؟'' اس نے میرے آنسو پونچھے اور اپنی انگلیاں میرے چہرے پر، ہونٹوں پر، ناک پر پھیرنے لگا۔ پھر میرے آنسو پونچھے۔ بولا، ''ڈرتی ہو، ہاں؟'' میں فقط چھت کو گھورتی رہی، اور وہاں چونے سے بنے نقش و نگار کو اور اس فرشتے کو دیکھتی رہی جو گلِ اطلسی میں سے نکل رہا تھا... شہزادہ بولا، ''کاش کوئی بتی بجھا دیتا۔ تمھیں ڈر تو نہیں لگ رہا، فخر النسا؟'' اس نے میری آنکھیں بند کر دیں۔ کاش میں خانم کی طرح کھانس رہی ہوتی۔ کاش مجھے نیند آ جاتی۔ کاش میں مر جاتی۔

شہزادہ احتجاب نے سر جھکا کر دونوں ہاتھوں میں تھام رکھا تھا۔ فخر النسا، کتاب ہاتھ میں لیے، اُس طرف، اپنی گھومنے والی آرام کرسی میں بیٹھی تھی۔ گل میخک اب بھی گلدان میں تھا۔ دادا حضور اپنی کرسی میں بیٹھے تھے۔ شہزادے کو کھانسی کا دورہ پڑا۔ کھڑکیوں کے شیشے لرزنے لگے۔ بولی، ''دیکھو، شہزادے، یہ میں ہوں۔'' وہ انگوٹھا منہ میں لے کر چوس رہی تھی۔ وہ اپنی دادی کی گود میں تھی۔ خانم

Scanned with CamScanner

جان کا ایک ہاتھ اس کی ران پر تھا۔ خانم جان ایک اسٹول پر بیٹھی تھیں۔ گردن بالکل سیدھی تان رکھی تھی۔ فوٹوگرافر باشی تھا۔ اس نے یقیناً کہا ہوگا، ''اِدھر دیکھیے، بڑی خانم، اس طرف!'' اور تصویر کھینچ لی ہوگی۔ فخرالنسا ان کے بائیں پہلو میں تھی۔ ان کے بائیں طرف ایک گلدان تھا جس میں لمبے ڈنٹھلوں والے پھول رکھے تھے۔ پھولوں کے پیچھے صرف فوارے کی سفید اور لمبی دھاریں دکھائی دے رہی تھیں۔ میں نے پوچھا، ''فخرالنسا، کیا خانم جان کے بال ہمیشہ سے سفید تھے؟'' بولی، ''جہاں تک مجھے یاد ہے، ہمیشہ ہی سفید تھے۔'' وہ فقط انگوٹھا چوس رہی تھی۔ چھوٹی پھپھی ددہ قمر کو اپنے سابق شوہر معتمد میرزا کے گھر بھیجا کرتی تھیں، کہ ''بچی ان کو دے دیجیے، تاکہ میں خود اس کی پرورش کر سکوں۔'' بچی اپنے گہوارے میں لیٹی انگوٹھا چوس رہی تھی۔ ددہ قمر نے کہا، ''ہائے بڑی خانم، کتنی پیاری ہے! خدایا، کیسے افسوس کی بات ہوگی اگر ایسی پیاری بچی بن ماں کے بڑی ہو!'' خانم جان بولیں، ''نیرہ خاتون کو یہ بات پہلے سوچنی چاہیے تھی۔ اب بہت دیر ہو چکی۔'' ددہ قمر نے کہا، ''خانم کی کیا خطا ہے! حضرتِ والا نے فرمایا، طلاق لے لو۔ اس نے کہا، جیسا آپ فرمائیں۔''

معتمد میرزا راضی نہ ہوا۔ جب وہ محل سے باہر نکلتا ہے، بگھی پر سوار، اور دریا کے قریب پہنچتا ہے تو دیکھتا ہے کہ لوگ جمع ہیں۔ محل کے سوار معتمد میرزا کے ساتھ ہیں، پیادہ سپاہی بھی ہیں۔ وہ ان سے کہتا ہے، ''جا کر دیکھو کیا معاملہ ہے۔'' سپاہی آگے بڑھتے ہیں اور ڈنڈوں سے لوگوں کو پیچھے ہٹاتے ہیں۔ ایک گدھا دریا کے کنارے نیم مردہ پڑا تھا۔ لوگ اس کا خون پی رہے تھے۔ کیا قحط اتنا سخت ہے کہ لوگ گدھے کا خون...؟ اچھا، معلوم ہے؛ گندم تو دادا حضور اور ملاؤں نے ذخیرہ کر رکھی تھی، اپنے گوداموں میں۔ اگر وہ سڑنے لگتی تو رات میں اسے دریا میں پھنکوا دیتے تھے۔ بارش بھی نہیں ہو رہی تھی۔ دریا خشک ہوتا چلا جا رہا تھا۔ معتمد میرزا محل میں واپس آتا ہے۔ وہ بڑے شہزادے کی دی ہوئی خلعت اتار کر قلمدان سمیت نوکروں کے حوالے کرتا ہے کہ وہ شہزادے کو پہنچا دیں اور پھر اپنے گھر جا کر دروازے بند کر لیتا ہے۔ دادا حضور بلانے کو کتنے ہی آدمی بھیجتے ہیں لیکن وہ کہلوا دیتا ہے، ''مجھے اب نوکری نہیں کرنی ہے۔''

اس کے دو بچے مر چکے تھے، ایک وبا کے سال میں جاتا رہا اور دوسرا مردہ ہی پیدا ہوا۔ دادا حضور پیغام بھجواتے ہیں کہ وہ نیرہ خاتون کو طلاق دے دے یا پھر نتائج کا سامنا کرے۔ معتمد میرزا خط کے

حاشیے پر لکھ بھیجتا ہے: ''الامر الاعلیٰ مطاع'' (حکم عالی کی تعمیل ہوگی۔) اس نے یہ بھی لکھا تھا: ''بندے کے پاس جو کچھ ہے وہ حضرتِ والا کی نوکری میں حاصل ہوا ہے اور بندگانِ آستانِ عدل گستر ہی کا مال ہے۔'' اور یہ کہ: ''جس وقت حکم فرمایئے گا، سپرد کر دیا جائے گا۔ اور جہاں تک زوجۂ مکرمہ، بانو نیرہ خاتون، کا تعلق ہے، جو کچھ آقایان حجۃ الاسلام فرمائیں گے اور شرعِ انور کے مطابق ہوگا، اسی پر عمل کیا جائے گا۔'' سپاہی جاتے ہیں اور حکم کے بموجب معتمد میرزا کو لاٹھیوں سے مارتے اور نیرہ خاتون کو اپنے ساتھ لے آتے ہیں۔ وہ حاملہ تھی یا نہیں، مجھے نہیں معلوم۔ فخر النسا کو بھی نہیں معلوم تھا۔ مگر کہتی تھی، ''شاید ہوگی۔'' بعد میں فخر النسا کو معتمد میرزا کے گھر بھجوا دیا جاتا ہے۔ چھوٹی پھپھی کو امام جمعہ کی موجودگی میں تین طلاقیں دلوائی جاتی ہیں۔ منصوبہ یہ تھا کہ نیرہ خاتون کو وزیرِ اعظم سے بیاہ دیا جائے تاکہ دادا حضور کا پایہ مضبوط ہو سکے۔ لیکن وزیرِ اعظم معتوب ہو جاتا ہے اور دادا حضور یہ منصوبہ ترک کر دیتے ہیں۔

ددہ قمر کہتی ہے، ''بڑی خانم، بچی کو مجھے دے دیجیے۔ نیرہ خاتون اس کے لیے بہت تڑپتی ہے۔ بچے کو بھی آخر ماں کی ضرورت ہوتی ہے۔'' خانم جان کہتی ہیں، ''تو ماں کے پاس کیا ہے، ہیں؟'' ددہ قمر کہتی ہے... پتا نہیں، کچھ کہا ہوگا جبھی خانم جان نے جیب میں ہاتھ ڈال کر یہ بڑا سا رومال نکالا۔ رومال میں بہت سی گرہیں پڑی ہوئی تھیں۔ فخر النسا نے کہا، ''خانم جان ایک بڑا رومال لے کر اس کے کونوں میں اور پہلوؤں پر شکر کی ڈلیاں ڈال کر دھاگے سے گرہیں بناتی جاتی ہیں۔ کہتی ہیں: دیکھو، بالکل پستانوں کی طرح بن گئے، ان سے پال کر بچی کو بڑا کر لوں گی۔''

دادا حضور سپاہی بھیجتے ہیں۔ معتمد میرزا کو قلعے میں لے جا کر زندان میں ڈال دیا جاتا ہے۔ لیکن گھر بھر کی تلاشی لینے پر بھی نہ خانم جان کا کوئی سراغ ملتا ہے اور نہ فخر النسا کا۔ وہ تمام قیمتی چیزیں لوٹ کر مکان کو سر بمہر کر دیتے ہیں۔ دادا حضور کو اس میں ذرا بھی شبہ نہیں تھا کہ خانم جان اپنا مقدمہ پایۂ تخت لے کر جائیں گی۔ وہ شہر کے دروازے پر آدمی متعین کر دیتے ہیں۔ لیکن خانم جان کرائے کے گدھے پر سوار، صرف ایک نوکر کو ساتھ لیے، ریگستان میں سے ہو کر پایۂ تخت پہنچ جاتی ہیں۔ فخر النسا ان کی گود میں ہے۔ نوکر گدھے کی لگام پکڑے آگے آگے چل رہا ہے۔ خانم جان حرم کی خانموں میں سے ایک، انیس خانم یا کسی اور، کے گھر جا کر پناہ طلب کرتی ہیں۔ انیس خانم مداخلت کر کے کوشش

Scanned with CamScanner

کرتی ہیں کہ دادا حضور معتمد میرزا کی جان بخش دیں۔ معتمد میرزا محض ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا تھا۔ اس کی کلائیوں اور ٹخنوں میں زنجیروں کے زخم پڑ گئے تھے۔ اس نے لکھ کر دے دیا تھا: ''میں اپنا تمام مال اسباب اور نقد بہ رضا و رغبت حضرتِ والا کے سپرد کرتا ہوں۔'' دادا حضور مال اسباب واپس نہیں کرتے، صرف مکان واپس دیتے ہیں، اور گزارے کے لیے ایک وظیفہ، جدِاعلیٰ کی طرف سے، معتمد میرزا کے لیے منظور ہوتا ہے۔

چھوٹی پھپھی کو بعد میں امام جمعہ سے بیاہ دیا جاتا ہے۔ یہ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ دو برس بھی نہ گزرے تھے کہ وہ گھر لوٹ آئیں۔ کبھی کبھار نوکروں کے ساتھ جا کر فخرالنسا کو دیکھ آتیں۔ فخرالنسا کو صرف دو سیاہ آنکھیں یاد تھیں جو دروازے کی جھری میں سے جھانکتی تھیں۔ صرف دیکھ کر لوٹ جاتیں۔ فخرالنسا نے کہا، ''خانم جان کہتی تھیں: اگر تم دروازے کے پاس گئیں تو تمھیں بھی پکڑ کر لے جائیں گے اور داغ دیں گے، جیسے تمھارے بابا کے ساتھ کیا تھا۔ دیکھو کس طرح داغا تھا۔'' معتمد میرزا کے ہاتھوں کی پشت کو داغا گیا تھا، دادا حضور کے حکم سے، کیونکہ وہ جاننا چاہتے تھے کہ باقی مال کہاں چھپا رکھا ہے۔ معتمد میرزا اپنی افیون کی انگیٹھی کے پاس بیٹھتے، ایک بار صبح اور ایک بار شام کو۔ اس تمام عرصے میں فخرالنسا کیا کرتی رہی؟ انھیں سفید بالوں والی خانم جان کے ساتھ رہی جنھوں نے اسے تصویر میں گود میں لے رکھا ہے۔ ان کے پاس پھول بھی تھے، جیسا کہ تصویر میں دکھائی دیتے گلدان سے معلوم ہو سکتا ہے۔ حوض بھی تھا۔ فخرالنسا، بے شک، باغیچے میں جا کر کھیلتی اور پھولوں سے باتیں کیا کرتی۔ گلِ میخک توڑ کر اپنے دہن کے کونے میں رکھ لیتی۔ خانم جان اونچے چبوترے پر بیٹھی بنائی کیا کرتی تھیں اور اسے تاکید کرتی تھیں، ''بچی، دروازے کے پاس مت جانا، سمجھیں؟''

فخرالنسا حوض کے کنارے، مچھلیوں کے پاس بھی جاتی تھی۔ اس کے بابا ہمیشہ کراہتے رہتے تھے۔ وہ خود کہتی تھی، ''بابا ہر وقت دائیں کروٹ سے پڑے رہتے اور خانم جان ان کی انگیٹھی میں پھونکیں مارا کرتیں۔'' فخرالنسا بھی، بے شک، آگ کے پاس، بابا کے سامنے بیٹھتی ہوگی۔ شام کے وقت۔ صبح اور سہ پہر کے وقت تو وہ مدرسے میں ہوتی تھی۔ خانم جان اسے مدرسے سے لایا لے جایا کرتیں۔ دادا حضور کا زوال ہو چکا تھا، ورنہ وہ ضرور فخرالنسا کو اپنے قبضے میں کرنے کی کوشش کرتے۔ بس فخرالنسا تھی اور خانم جان اور اپاہج بابا، اور وہ ساری کتابیں، ایک باغیچہ، ایک حوض اور دروازے کی

وہ جھری جس میں سے چھوٹی پھپھی جھانکا کرتیں۔ معتمد میرزا جب کراہتے یا اونگھتے نہ ہوتے تو کہتے، ''پڑھو، جانم!'' فخرالنسا کے بال لمبے ہو گئے تھے۔ اس کے رخسار... رخسار؟ معلوم نہیں، شاید آخر وقت کی طرح سفید ہی ہوں گے... سفید یا سرخ... سفید یا سرخ؟ تصویر تو سیاہ و سفید تھی۔ معتمد میرزا کی مونچھیں یقیناً خاکستری رہی ہوں گی اور بال چھدرے... اور ناک؟... تکیے سے ٹیک لگائے، افیون کا کش لگاتے اور کہتے، ''پڑھو، جانم!''

ان کا وظیفہ قلیل تھا۔ خانم جان کے پاس بہت زیور تھے، جو وہ ایک ایک کر کے فروخت کرتی رہیں۔ کتابیں بھی بک گئیں، یہاں تک کہ قدیم اور نادر چیزیں بھی۔ خانم جان ہی کے بچے کھچے زیور تھے جو فخرالنسا کے حصے میں آئے۔ ایک روز صبح انھوں نے معتمد میرزا کو مردہ پایا۔ بستر پر دراز، کھلے ہوئے منھ کے کنارے پر جھاگ تھا اور کھلی آنکھیں چھت پر جمی ہوئی تھیں۔ فخرالنسا دس سال کی تھی، اس نے خود بتایا۔ وہ دبلی تھی، بے شک۔ ہونٹوں کے پاس دو سلوٹیں پڑتی تھیں اور دہن کے بائیں کنارے پر تل تھا۔ اس کا پیراہن... کون سا پیراہن؟ سفید؟ شاید۔ اور وہ عینک۔ نہیں، عینک یقیناً بعد میں لگی ہوگی۔ ان کے نوکر حیدرعلی نے فخرالنسا کو بتایا، ''یہ، یہ حکیم ابونو اس کا کام ہے!'' کسی کو ٹھیک سے معلوم نہیں، لیکن دادا حضور اس قسم کے کام اکثر کیا کرتے تھے۔ معتمد میرزا کے پاس اب کچھ نہ بچا تھا جس پر دادا حضور ہاتھ ڈال سکتے۔ خانم جان اپنے نوکر حیدرعلی، اس کی بیوی اور فخری کے ساتھ رہ گئیں۔ فخری چھوٹی تھی، سرخ و سفید۔ چھوٹی پھپھی نے، بے شک، آدمی بھیجا کہ بچی کو لے آئے۔ لیکن خانم جان نے بچی حوالے نہ کی۔ فخری کہتی تھی، ''خانم جان سے اب چلا نہ جاتا تھا۔ وہ خود کو فرش پر گھسیٹتی ہوئی چبوترے کے اوپر تک پہنچتیں، یا سیڑھیوں پر بیٹھی دروازے کو تکا کرتیں۔''

دوپہر یا سہ پہر کو فخرالنسا مدرسے سے لوٹتی... فخرالنسا پیش بند پہنتی تھی۔ بستہ ہاتھ میں لیے جب وہ دروازہ کھولتی تو خانم جان کو فوارے کے دوسری طرف چبوترے کی سیڑھیوں پر بیٹھا ہوا دیکھتی۔ کیا ان کے پہلو میں گلدان رکھا ہوتا تھا؟ وہ دوڑتی ہوئی آتی تھی، پورا راستہ دوڑتے ہوئے طے کرتی۔ ہوا اس کے بالوں اور لباس کے دامن کو اڑا رہی ہوتی۔ بستہ لہراتی ہوئی چلتی تھی۔ خانم جان، بے شک، اپنے دونوں بازو پھیلا دیتیں اور اپنی پوتی کو دیکھتیں کہ کس طرح اپنی چھوٹی چھوٹی ٹانگوں سے دوڑتی ہوئی آتی ہے۔ بالوں کو دیکھتیں جنھیں ہوا... پھر اسے لپٹا لیتیں، چہرے کے تل کو چومتیں، اور

Scanned with CamScanner

اپنی بوڑھی کپکپاتی ہوئی انگلی سے بالوں کی بکھری ہوئی لٹوں کو پیچھے کرتیں۔ ایسا ہی ہوتا ہوگا، شاید۔
خانم جان کیا سوچتی تھیں؟ شاید وہ زندہ رہنا چاہتی تھیں کہ خود کو اپنے کمرے سے بڑے کمرے تک اور وہاں سے برآمدے تک اور زینے کے آخری سرے تک گھسیٹ کرلے جاسکیں اور راستہ دیکھ سکیں۔ لیکن ایک دن، یقیناً، وہ ایسا کرنے کے قابل نہ رہیں۔ فخری اور اس کی ماں نے ان کی بغلوں میں ہاتھ دے کر اٹھایا۔ مگر نہیں، فخری بہت چھوٹی تھی، وہ نہیں اٹھاسکتی تھی۔ فخری کی ماں اور حیدر علی نے انھیں بغلوں میں ہاتھ دے کر اٹھایا ہوگا۔ اور اس کے بعد... اس کے بعد کیا ہوا؟ میں نے فخر النسا سے پوچھا کیوں نہیں؟ چھوٹی پھپھی کئی بار مدرسے کے راستے پر پہنچتی ہیں اور اسے اپنی بگھی میں بٹھا لیتی ہیں۔ فخر النسا کہتی تھی، ''پہلے تو میں ڈری کہ مجھے لے جا کر داغ دیں گے۔'' وہ اسے اپنے سامنے بٹھا لیتیں اور تکتی رہتیں۔ فخر النسا، بے شک، بگھی کی کھڑکی سے باہر کا نظارہ کرنا چاہتی ہوگی۔ میں نے اچھا کیا ان کی آنکھیں چھیل ڈالیں۔ فخر النسا کو بھی وہ اچھی نہیں لگتی تھیں۔ بولی، ''پہلے تو وہ بیٹھی مجھے دیکھتی رہتیں۔ پھر کہتیں: تم میری بیٹی ہو، معلوم ہے؟ تمھارا باپ افیونی تھا، میرے قابل نہ تھا۔ تمھیں مجھ سے ڈرنا نہیں چاہیے۔'' ان کا سر یقیناً تنا ہوا ہوتا ہوگا۔ فخر النسا منھ بنا لیتی ہے۔ وہ اپنی انگلی اٹھا کر کہتیں، ''تم میری بیٹی ہو۔ تمھیں مجھ پر فخر کرنا چاہیے۔ پورے دو برس میں امام جمعہ کی بیوی رہی ہوں، سید حسن مجتہد کی بیوی۔ سمجھ میں آیا؟'' پھر ہنسنے لگتیں۔ اچھا، اس کے بعد... اس کے بعد کیا؟ جب خانم جان اوپر چبوترے تک جانے کے قابل نہ رہیں تو نیچے سیڑھیوں کے پاس بیٹھی رہتی تھیں؟
فوارہ اور گلدان اور سفید بالوں والی خانم جان اور انگوٹھا چوستی ہوئی فخر النسا۔ فوٹو گرافر باشی بھی تھا۔ پھر...؟ پھر خانم جان مرجاتی ہیں، سجادے پر، یا بستر میں یا چبوترے پر۔ کیا فرق پڑتا ہے؟ بس مرجاتی ہیں۔ فخر النسا رہ جاتی ہے اور وہ ڈھنڈار مکان اور فخری اور حیدر علی اور فخری کی ماں۔ فخری کی ماں بھی مرجاتی ہے۔ اس کی موت زچگی میں ہوتی ہے۔ پھر حیدر علی میری ہی کوشش سے ایک اور عورت بیاہ لیتا ہے۔ کیسا لیچڑ آدمی تھا! آکر کہتا تھا، ''میں اور میری بیٹی ساتھ ساتھ ہیں۔ جو فخری کو رکھنا چاہے گا اسے مجھ کو بھی رکھنا ہوگا۔'' میں نے اسے باہر نکال دیا۔ ایسا نہیں ہوسکتا۔ اگر میں اس کی مان لیتا تو جب کبھی فخری اس گول سفید داڑھی اور جھریوں پڑے ہاتھوں والے ٹھگنے بڈھے کو دیکھتی تو اسے یاد آجاتا کہ وہ فخری ہے، فخر النسا نہیں۔ میں نے ٹھیک کیا۔ وہ دو برس اور جیا۔ میں اسے پیسے دیتا رہا۔

Scanned with CamScanner

کہتا تھا، ''اگر آپ نے فخری سے شادی نہ کی تو میں جا کر مقدمہ کر دوں گا۔'' میں نے کہہ دیا، ''جاؤ جو چاہو کر لو۔'' میں نے اسے پیسے دیے۔ میں اسے باقاعدگی سے اس کے پیسے بھجواتا۔ میں نے اسے دو کمروں کا مکان کرائے پر لے کر دیا۔ وہ چبوترے کے ایک سرے پر بیٹھا چلم پیتا رہتا۔ بوڑھے لوگ ہمیشہ چبوترے کے سرے پر یا حوض کے کنارے کیوں بیٹھے رہتے ہیں؟

چھوٹی پھپھی نے شادی کی، مگر بہت دن بعد، جب دادا حضور فوت ہو چکے تھے۔ ان کے بچہ نہیں ہوا۔ گلدان اور فوارہ... خانم جان تو مر چکی تھیں... کیا ہی اچھا ہوتا اگر میرے پاس فخر النسا کی اور بھی تصویریں ہوتیں! وہ سب تصویریں میں یہاں، اسی کمرے میں، دیواروں پر آویزاں کرتا۔

وہ نہر کے کنارے کھڑی تھی۔ وہ دبلی اور لمبے قد کی تھی اور سیاہ رنگ کا پیراہن پہنے تھی۔ اس کے بازو ننگے تھے، اور بہت سفید۔ اس نے اپنی دونوں گندھی ہوئی چوٹیاں پیچھے ڈال رکھی تھیں۔ عینک لگائے تھی۔ اس کا پیراہن چنٹوں بھرا تھا، باریک باریک چنٹیں، خاص طور پر کمر کے گرد۔ اس کے دامن پر سفید جالی کی ایک چنٹ دار بیل لگی ہوئی تھی۔ اس کی ٹانگیں دبلی اور سفید تھیں اور وہ لمبی پنڈلیوں والے بوٹ پہنے تھی۔ یوں کھڑی تھی کہ مجھے اس کا نیم رخ دکھائی دے رہا تھا۔ ناک اور ایک آنکھ اور گردن کی تراش۔ میں گھوڑے کی لگام تھامے کھڑا تھا۔ مراد بھی تھا، یا شاید نہیں تھا۔ فخر النسا تھی۔ میں نے اسے دیکھا۔ اس نے مجھے دیکھا، اپنی اسی عینک کے شیشوں کے پیچھے سے۔ اس کی آنکھیں اب بھی سیاہ اور زندہ تھیں۔ اس نے اپنا سر گھمایا۔ مراد تھا؟ بے شک۔ دوبارہ سوار ہونے میں اسی نے میری مدد کی۔ میں نے گھوڑے کو دوڑایا، پھر واپس لایا، پھر دوڑایا۔ اس نے میری طرف نہ دیکھا۔ میں نیچے اتر آیا۔ گھوڑے کو مراد کے حوالے کیا۔ پھر میں پیڑوں میں سے ہوتا ہوا لوٹا جہاں سائے کے درمیان کہیں کہیں پتوں اور شاخوں پر پڑتے دھوپ کے ٹکڑے تھے۔ چڑیوں کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ میں نے درخت سے ایک شاخ توڑی۔ وہ لمبی سبز راہداری کے دوسرے سرے پر دھوپ کی خیرہ کرنے والی روشنی میں کھڑی تھی۔ میرے ہاتھ میں شاخ تھی۔ وہ اب بھی کھڑی میری طرف دیکھ رہی تھی۔ مسکرا رہی تھی، ویسی تلخ مسکراہٹ جسے دیکھ کر آدمی کا دل کرتا ہے کہ اپنا چہرہ کہیں چھپا لے یا جا کر قد آدم آئینے کے سامنے کھڑا ہو جائے اور باریک بینی سے اپنا جائزہ لے۔ میں لوٹ گیا۔ شاخ میرے ہاتھ میں ننگی ہو چکی تھی۔ اس کا ایک ایک پتا میں نے نوچ پھینکا تھا۔ میں نے ایک

Scanned with CamScanner

اور شاخ توڑی اور درختوں کے نیچے سے نکل کر حوض کے کنارے آ گیا جہاں سنگی لڑکیاں تھیں جن کے کھلے دہنوں سے پانی نکل نکل کر حوض میں گر رہا تھا۔ وہ سب ننگی تھیں، چھوٹے پستانوں اور ابھرے ہوئے پیڑو والی۔ میں نے پانی میں جھانک کر دیکھا۔ میرے بال بکھرے ہوئے تھے۔ پھر مڑ کر دیکھا۔ وہ اب بھی درختوں کے اُس پار، بجری کی سڑک پر کھڑی ہوئی تھی۔ میں نے بالوں کو ہاتھ پھیر کر درست کیا اور مڑ کر سڑک پر چلنے لگا۔ اس کے برابر سے نکل کر سڑک کے دوسری طرف نہر کے پاس چلا گیا۔ میں فقط پانی کو دیکھ رہا تھا اور ان پتوں کو جو پانی پر تیرتے ہوئے جا رہے تھے، کہ اچانک اس نے کہا، ”خسرو خان، کہیں تمھیں عشق تو نہیں ہو گیا، ہاں؟“ میں مڑا تو وہ میرے سامنے کھڑی تھی۔ اسی مسکراہٹ، انھیں آنکھوں اور دہن کے دونوں طرف پڑنے والی انھی ننھی سلوٹوں کے ساتھ۔

کاش میں نے یہاں سے شروع کیا ہوتا، نہ کہ خانم جان، گلدان اور فوارے کی اس رنگ اڑی تصویر سے۔ خیر، جو ہوا سو ہوا۔ یہ جانتا ہوں کہ میں کچھ نہ بولا۔ وہ آئی، خود ہی آئی، اور آ کر میری ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھ لیا۔ میرا سر اوپر اٹھایا۔ وہی مسکراہٹ۔ کاش میں کسی طرح یہ مسکراہٹ اس کے چہرے سے پونچھ سکتا۔ فخری کے بس کی بات نہیں، وہ ہرگز اس طرح نہیں مسکرا سکتی۔ میں نے بہت کوشش کی، مگر یہ اس کے بس میں ہی نہیں۔ منھ کھول کر اپنے بڑے بڑے دانت سامنے کر دیتی اور ہنسنے لگتی، وہ بھی زور زور سے۔ احمق! لیکن فخر النسا... اس کے دہن کے اردگرد کی سلوٹوں، اس کی آنکھوں، یہاں تک کہ اس کے گول کیے ہوئے ہونٹوں میں کوئی ایسی چیز تھی جس سے خوف آتا تھا۔ آدمی کو اپنا آپ کس قدر چھوٹا اور حقیر محسوس ہوتا تھا، خواہ وہ حضرتِ والا کا پوتا ہی کیوں نہ ہو۔ کاش میں مر جاتا!

شہزادہ احتجاب کھانستا رہا، دیر تک اور بلند آواز میں، اور اس کے کندھے لرزنے لگے۔

اس کے ہاتھ دبلے اور سفید تھے۔ تن پر سیاہ پیراہن تھا۔ کہنے لگی، ”خسرو خان، تمھارا تو رنگ لال ہو گیا! بڑے تعجب کی بات ہے! اس گھر میں اور ان تمام باعفت مستورات کے درمیان! اور اس قد اور اس صورت کے ساتھ! ضرور...“

وہ کہاں سے جانتی تھی؟ منیرہ خاتون کے ساتھ تو میں فقط...

دادا حضور نے کہا، ”کھیل رہے تھے؟“ وہ اپنے تخت پر دوزانو بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے ان

Scanned with CamScanner

کے سینے کے بالوں کی طرف دیکھا۔ دادا حضور صدری پہنے تھے۔ میرا ہاتھ اماں کے ہاتھ میں تھا۔ اماں کا ہاتھ کپکپا رہا تھا۔ دادا حضور بولے، ''اس کا ہاتھ چھوڑو۔ یہ اب بچہ نہیں ہے۔'' دادی حضور بولیں، ''بچے کی کوئی خطا نہیں۔'' دادا حضور نے ٹھہری ہوئی آواز میں پوچھا، ''اور کس کس کے ساتھ کھیلے ہو، خسرو خان؟ منیرہ خاتون کے علاوہ اور کس کس ننگے گھوڑے پر سواری کی ہے، ہاں؟'' میں نے کہا، ''سواری... '' میں نے کہا نہیں... چاہتا تھا کہوں: نصرت السادات... کہ انھوں نے ہاتھ اٹھایا۔ دادا حضور نے اپنا عصا زور سے میرے ٹخنے پر مارا۔ کیسا چیخ رہی تھی منیرہ خاتون!

منیرہ خاتون اندر زنان خانے میں پانی کی ناند کے پاس کھڑی تھی۔ اس کے بال چھوٹے چھوٹے تھے، لڑکوں کے سے۔ اس نے ایک لمبا، پھولدار پیراہن پہن رکھا تھا۔ ناند کے پانی کو ہاتھ ڈال کر ہلا رہی تھی۔ دبلی ہو گئی تھی۔ چھدرے بالوں میں سے گردن جھلک رہی تھی۔ میں ناند کے پاس گیا۔ اس نے میری طرف نہ دیکھا۔ کچھ بولی بھی نہیں۔ صرف ناند کے پانی پر جھک گئی اور پھر پانی کو ہلانے لگی۔ پانی میں لہریں اٹھیں تو اس میں منیرہ خاتون کا عکس ہلنے لگا۔ اس کے بال بھی پھیل گئے اور لہریں لینے لگے۔ میں پنجوں کے بل اوپر اٹھ گیا تھا۔ پانی پُرسکون ہو گیا۔ کیوں وہ ہمیشہ ناند کے پاس کھڑی پانی کو ہلاتی رہتی تھی؟ وہ پانی پر جھکی اور دیکھنے لگی۔ اپنے ہونٹ اس نے لال کر رکھے تھے۔ کس چیز سے؟ مجھے نہیں معلوم۔ اس کی ٹھوڑی تک لال ہو رہی تھی۔ سرخی نہیں تھی، یقیناً۔ دو دانت آگے کو نکل آئے تھے۔ میں نے پوچھا، ''کیا دیکھنا چاہتی ہو، منیرہ خاتون؟'' بولی، ''تم پھر آ گئے، پھر آ گئے تم، خسرو خان؟'' ہمیشہ وہ یہی بات کہتی اور دیکھتی، پھر پانی کو ہلاتی اور پھر اس میں دیکھنے لگتی۔ اسے کاہے کی تلاش تھی؟ میں ناند کے کنارے تک اٹھا اور اندر جھانکا۔ ناند کا پانی شفاف تھا، اس میں مچھلیاں نہیں تھیں۔ صرف حقّے کا عکس پانی میں پڑ رہا تھا، ناند میں دوسری طرف۔ بولی، ''دیکھ لیا، خسرو خان؟'' میں نے کہا، ''کیا؟ کیا؟'' بولی، ''اب جو پانی ہلے تو دیکھنا۔'' یہ کہہ کر اس نے پانی کو ہلایا۔ میں نے دیکھا۔ کچھ بھی نہ تھا، فقط منیرہ خاتون کا عکس تھا، جو پہلے کھنچا ہوا دکھائی دیتا، پھر اس میں لہریں اٹھتیں، پھر وہ ٹوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا۔ اس کے بعد پھر منیرہ خاتون کا چہرہ دکھائی دینے لگتا، انھیں چھوٹے چھوٹے بالوں اور سرخ ہونٹوں کے ساتھ۔ میں نے کہا، ''صرف تمھارا عکس ہے۔'' بولی، ''تم نہیں دیکھ سکتے۔ حضرتِ والا بھی نہیں دیکھ سکتے۔ صرف میں دیکھ سکتی ہوں۔ صرف میں۔''

Scanned with CamScanner

لالہ آقا نے کہا، ''پاگل ہے، اس کے پاس مت جایا کرو۔'' میں نے کہا، ''میں دیکھنا چاہتا ہوں۔'' بولے، ''کیا؟'' میں نے کہا، ''منیرہ خاتون کو ضرور کچھ دکھائی دیتا ہے، جبھی تو پانی میں جھک جھک کر دیکھا کرتی ہے۔'' لالہ آقا بولے، ''پاگل ہے۔ میں نے عرض تو کیا کہ پاگل ہے۔'' میں نے کہا، ''منیرہ خاتون، کھیلیں؟ سواری کا کھیل؟ میرا دل چاہ رہا ہے۔'' وہ چلائی، ''دیکھ لیا، میں نے دیکھ لیا!'' وہ پانی پر جھکی ہوئی تھی۔ پانی میں لہریں اٹھ رہی تھیں۔ میں نے پوچھا، ''کیا؟'' وہ فقط لہروں کو گھور رہی تھی۔ اسے کیا دکھائی دیتا تھا؟ میں منیرہ خاتون پر کس طرح پہنچ گیا؟ فخر النسا... کاش میرے پاس اس کی تصویر ہوتی۔ گلدان... گل میخک... فخر النسا نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ کیسا ہلکا ہاتھ تھا اس کا! ہم درختوں میں چلے گئے، اسی لمبی سبز راہداری میں جو سایوں میں ختم ہوتی تھی، اور وہاں سے گزر کر کنویں تک پہنچ گئے۔ گائے اور اس چونے کے ستون کے پاس۔ وہ جھکی، کچھ پتھر اٹھائے اور میری ہتھیلی پر رکھ دیے۔ میں نے اس کی طرف دیکھا، وہ مسکرا رہی تھی۔ وہی مسکراہٹ۔ سورج کی تیز روشنی میں کہیں چھپنے کی جگہ نہ تھی۔ بولی، ''پتھر مارو۔'' میں نے کہا، ''کسے؟'' بولی، ''تم واقعی کچھ نہیں سمجھتے، شہزادے۔ تمھارے جدِ اعلیٰ کے دل کو اس وقت تک چین نہ آتا تھا جب تک ہر صبح اپنے جدی دشمنوں کی کھوپڑیوں کو، نادر اور زند[20] کے عالیشان آثار کو نہ کچل لیں، اور ایک تم ہو کہ ایک ایسے آدمی کو پتھر مارتے ہوئے ڈر رہے ہو جو کم از کم بیس سال سے چونے میں گڑا ہوا ہے۔ ڈرو مت، شہزادے۔ جلدی کرو، اپنے دادا حضور کی روح کو خوش کرو۔ آخر یہ نمک حرام نوکر اُس وقت کے وزیرِ اعظم کا خفیہ نویس تھا، میرے بابا کہتے تھے۔ یقین کرو۔ جب دادا حضور کو پتا چلا تو انھوں نے حکم دیا کہ اسے اس جگہ، اونچائی پر، چونے میں گاڑ دیا جائے تا کہ وہ ہر چیز کو ٹھیک ٹھیک دیکھ سکے اور اس کی خبر پہنچا سکے۔''

پتھر میرے ہاتھ میں تھے اور چند سیڑھیاں چڑھ کر، چبوترے پر، چونے کی بنی دھندلی سی انسانی شبیہ تھی۔ اس وقت تک مجھے کیونکر پتا نہ چلا؟ میں نے کہا، ''مجھے پتا ہی نہیں۔ لالہ آقا نے کبھی بتایا

---

20 صفوی خاندان کے زوال کے بعد نادر قلی خان نے اقتدار پر قبضہ کیا اور 1736 میں شاہ کا لقب اختیار کیا۔ اس نے ہندوستان پر حملہ کیا اور دہلی سے تختِ طاؤس لے کر آیا۔ 1746 میں نادر شاہ کے قتل کے بعد زند خاندان اقتدار میں آیا اور شیراز کو پایۂ تخت بنا کر حکمرانی کرتا رہا، یہاں تک کہ 1780 میں قاجار خاندان اسے معزول کر کے اقتدار پر قابض ہوا۔ شہزادہ خسرو احتجاب اسی قاجار خاندان کا افسانوی وارث ہے۔

Scanned with CamScanner

نہیں۔'' بولی، ''اب تو پتا چل گیا، اب کیوں کھڑے ہو؟ جلدی سے اسے سنگسار کرو!''

یہ خفیہ نویس کون تھا؟ اس کا نام؟ یہ فخر النسا کو بھی معلوم نہ تھا۔ بولی، ''ڈیڑھ کروڑ انسانوں میں سے ایک۔ کیا فرق پڑتا ہے؟ کوئی آدمی ہی تھا۔'' میں نے خود حکم دیا تھا کہ اسے مسمار کر دیا جائے۔ میں خود نہیں گیا۔ میں نے کہا کہ اسے اسی جگہ دفن کر دیا جائے۔ کنویں کی منڈیر میں بھی اور لوگ چنے ہوئے تھے اور... اسے پاٹ دیا گیا۔ یہ سب کیوں کیا جاتا تھا؟ ابا حضور اچھے آدمی تھے، مراد کہتا تھا۔ مراد انھیں اچھی طرح جانتا تھا۔ فخر النسا نے کہا، ''انھوں نے بہت لوگوں کو مروایا، لیکن ان میں اچھی بات یہ تھی کہ انھوں نے اس کا نظارہ نہیں کیا، یہ ان کی آنکھوں کے سامنے نہیں ہوا۔ اور یہ ہر روز کا معاملہ نہیں تھا، بس ایک گھنٹے میں سب ختم۔ ایک دم دو سو سے پانچ سو تک لوگ زخمی اور ہلاک ہوئے۔''

فخر النسا بولی، ''اچھا، پھر چلتے ہیں۔ تمھاری رگوں میں تو اپنے اجدادِ کبار کے خون کا ایک قطرہ بھی نہیں۔'' میں نے پتھر پھینک دیے۔ ابا حضور بیچ دری میں تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ ان کی ٹانگوں کے نیچے ایک اور تکیہ تھا اور سامنے انگیٹھی رکھی تھی۔ داہنے اور بائیں ہاتھ بھی تکیے رکھے تھے۔ میرزا نصر اللہ انگاروں پر پھونکیں مار رہا تھا۔ ابا حضور نے کہا، ''تم دونوں کتنی جلدی ایک دوسرے سے واقف ہو گئے ہو!'' ان کی مونچھیں خاکستری ہو گئی تھیں۔ وہ اپنی ناک اور منھ سے دھواں نکال رہے تھے۔ فخر النسا کچھ نہ بولی۔ اس نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔ ہم ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں چلتے جا رہے تھے کہ وہاں آ نکلے۔ ابا بولے، ''اچھا، تو جاؤ اور ایک دوسرے سے اور واقف ہو جاؤ۔''

فخر النسا نے کہا، ''نیرہ خاتون نے یقیناً خط لکھا ہوگا کہ ہم دونوں کی شادی کر دی جائے۔'' یہ اس نے بعد میں کہا۔ اس نے انھیں کبھی 'اماں' نہیں کہا۔ وہ مہتابی میں بیٹھی کتاب پڑھا کرتی۔ جب میں چھت کی منڈیر کے نزدیک اس کے پاس پہنچا تو وہ بولی، ''شہزادے، یہاں بے کار نہ بیٹھے رہو۔ یوں اِدھر اُدھر پھرنا تمھارے لیے اچھا نہیں۔ تمھیں کچھ کرنا چاہیے۔'' میں شکار پر جایا کرتا، جیپ میں۔ اس میں کچھ لطف نہ تھا۔ ہم ہرنوں کا اتنی دور تک پیچھا کرتے کہ وہ تھک کر گر پڑتے۔ ان کی زبانیں باہر نکل آتیں، کیسی لال لال! ان کے پیٹ کانپ رہے ہوتے، اور چھوٹے چھوٹے پیر، اور خوبصورت سیاہ آنکھیں، اور نظروں میں دہشت اور خوف۔ مجھے صرف تاش کھیلنے میں مزہ آتا تھا۔ تین بادشاہ اور دو ملکائیں۔ میں اپنے مخالف کے ہاتھ کپکپاتے یا اسے نظریں جھکاتے دیکھتا یا دیکھتا کہ وہ کس طرح اپنا

سگریٹ راکھ دان میں مسل رہا ہے... یہی سب دیکھنے کے لیے میں کھیلتا تھا۔ مجھے اپنی ساری جائیداد اور املاک کو کسی نہ کسی طرح ٹھکانے تو لگانا ہی تھا۔

فخر النسا کہتی تھی، ''یہ کچھ کرنا تو نہ ہوا۔ یہ تو تم خود کو فریب دے رہے ہو۔ کوئی ایسا کام کرو جو واقعی کام ہو، کچھ ایسا جو تاریخ کے کم از کم ایک ورق کو تو سیاہ کر سکے۔ بندوق اٹھاؤ اور باغ کی باڑ کے پاس جاؤ، اگر کوئی وہاں سے گزرتا دکھائی دے تو اس کا نشانہ لو اور گولی چلا دو۔ پھر وہیں کھڑے ہو کر اس کی جاں کنی کا تماشا دیکھو۔ لیکن اگر تم کسی کو ناپسند کرتے ہو، کہ اس نے کوئی شعر غلط پڑھ دیا یا ناک میں انگلی گھمائی یا جوتوں کے فیتے باندھنے کے لیے تمھارے مکان کی دہلیز پر پاؤں رکھ دیا، تب تمھیں اس کے سر کا نشانہ لینے کا اختیار نہیں۔ نشانہ بننے والے کا انتخاب جتنا بے سبب ہو اتنا ہی بہتر ہے۔ جو کسی کو قتل کرنے کے لیے بہانہ ڈھونڈتا ہے وہ قاتل بھی ہے اور جھوٹا بھی، اور جھوٹا بھی ایسا کہ خود اپنے آپ کو دھوکا دینے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر تمھیں کسی کو قتل کرنا ہے تو اس کے لیے کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ بس اس کے سر یا سینے کا نشانہ لو اور لبلبی دبا دو، اس طرح۔ دیکھو، اپنے اجدادِ والا تبار سے سبق سیکھو۔ جب انھیں شکار نہ ملتا تو انسانوں کو مارتے، بچوں تک کو۔ پھر کھڑے ہو کر دیکھا کرتے کہ کس طرح ہاتھ پیر سکڑتے اور ہلتے ہیں اور آنکھیں کس طرح خیرہ ہو کر آدمی کو دیکھتی رہ جاتی ہیں۔''

وہ ہنستی تھی، بے آواز ہنسی۔ اس کے دہن کے پاس وہی سلوٹیں پڑتیں اور آنکھیں عینک کے شیشوں کے پیچھے بے جھپکے دیکھ رہی ہوتیں۔ میں گھر میں بند ہو کر نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ آدھی رات کو لوٹتا، نشے میں چور، تاکہ یہ سب کچھ نہ دیکھوں۔ اس کے چہرے کے نقوش پرسکون ہو چکے ہوں، عینک اتر چکی ہو اور پلکیں بند ہوں۔ وہ تخت پر سیدھی لیٹی ہو، سفید شمیز پہنے، اور بال تکیے پر بکھرے ہوئے ہوں۔ وہ کہتی، ''بتی بجھا دو، شہزادے۔''

شہزادہ احتجاب نے اونچی آواز میں کہا:

''یہ سب اسی طرح تھا... اور...''

یہ کہہ کر کھانسنے لگا۔

اُس ہموار پیشانی کے پیچھے کیا گزر رہا تھا؟ ان آنکھوں سے، اس عینک کے موٹے شیشوں کے پیچھے سے دیکھنا کیسا ہوتا ہوگا، مجھے اور فخری کو اور ان سب قدیم چیزوں کو دیکھنا، اور کتاب کی سطروں پر

نظر ڈالنا اور اس آئینے پر جو پیشانی پر پڑی ہوئی ان لکیروں کو ہر روز زیادہ گہرا دکھاتا ہے؟

اگر میں اپنے اجدادِ والا تبار کی طرح، نسترن کے درخت کے نیچے، مرصع تخت پر بیٹھتا اور حکم دیتا کہ نوکر اور جلاد قیدی کو میرے سامنے پیش کریں... قیدی کے ہاتھ بندھے ہونے چاہئیں، پشت پر۔ ایک رات، یا ایک ہفتہ، یا ایک مہینہ زندان میں رہا ہو، اس طرح کہ پیر شکنجے میں ہوں اور گردن میں زنجیر۔ روشنی؟ شاید کوٹھری کے روزن سے آنے والی روشنی کافی ہوگی۔ روشنی کا یہ بے رنگ ستون اس اندھیری کوٹھری میں کیا کر سکتا ہے؟ شاید صرف گرد و غبار ہی کوٹھری میں اندھیرے سے روشنی کو الگ کر کے دکھا سکے۔ اسے کوڑے مارے جانے چاہئیں۔ اگر اس موقعے پر خود ہم بھی موجود ہوں تو بے شک اور بھی بہتر ہے۔ سپاہی ہماری طرف دیکھتے ہیں اور زیادہ زور سے کوڑا مارتے ہیں۔ ان کے سامنے اشرفیوں کی ایک تھیلی پھینک دی جانی چاہیے۔ قیدی کی چیخیں جتنی بلند ہوتی ہیں، سپاہی اتنے ہی زیادہ زور سے کوڑا مارتے ہیں، اور جتنے زیادہ زور سے مارتے ہیں اتنی ہی اور بلند چیخوں کا انتظار کرتے ہیں۔ نسترن کے درخت کے ٹھنڈے سائے میں، جبکہ ہوا میں عطر کی خوشبو پھیلی ہوئی ہے۔ اس کے چہرے پر کوئی خراش نہیں پڑنی چاہیے۔ ہم نے صاف تنبیہ کر دی ہے کہ مبادا... آخر اس کا سر ہمیں کرسی نشینِ ایالت یا ممالکِ محروسہ کے پایۂ تخت کو بطورِ ہدیہ بھجوانا ہے اور انعام وصول کرنا ہے۔ سزائے موت کی چٹائی بچھائی جاتی ہے۔ جلاد کا لباس سرخ ہو؟ یقیناً، ایسا ہی ہوگا۔ اس کی مونچھیں بھی کانوں تک چڑھی ہوئی ہونی چاہئیں۔ خنجر کی چمک... خنجر جلاد کی کمر میں بندھے ہوئے پٹکے میں اڑسا ہوا ہے۔ ہم نے حکم دے رکھا ہے کہ تنور شام ہی سے روشن کر دیا جائے۔ اور ہمیں معلوم ہے، دیکھو! راکھ کے نیچے کتنے سرخ انگارے دہک رہے ہیں۔ جلاد ہماری طرف دیکھتا ہے۔ ہم سرِ مبارک کو جنبش دیتے ہیں۔ جلاد نے دو انگلیاں قیدی کے نتھنوں میں گھسیڑ رکھی ہیں۔ کون ہے قیدی؟ جو بھی ہو، کوئی بھی ایسا جس کا سر کچھ قیمت رکھتا ہو۔ اس کی پیشانی کی لکیروں کے پیچھے کچھ ایسا ہے جس کا ہمیں علم نہیں۔ بس یہ معلوم ہے کہ یہ مضر ہے، اور یہ کہ... جلاد قیدی کے گلے پر خنجر پھیرتا ہے اور ہم بیٹھے خون کا فوارہ ابلنے کا انتظار کرتے ہیں اور نسترن کا ایک تنکا دانتوں میں لیے ہوئے ہیں۔ خون کا فوارہ ابلتا ہے۔ قیدی کا بدن ہل رہا تھا یا نہیں؟ میں نے نہیں دیکھا۔ دادا حضور اور جدِ اعلیٰ نے دیکھا تھا اور پھر... پھر قیدی کے خون آلود بال جلاد کے ہاتھ میں ہیں۔ اور میں قیدی کی پھٹی ہوئی آنکھوں کو دیکھتا ہوں۔ اگر طبیعت

Scanned with CamScanner

مالش کر رہی ہو، تب بھی اپنی جبروت کی حفاظت کی خاطر اس خون اور اس سر اور بے سر کے اس دھڑ کو نظر جما کر دیکھنا ضروری ہے جو پشت پر بندھے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ زمین پر پڑا ہے اور اب تک تھوڑا تھوڑا ابل رہا ہے، اور سپاہیوں کو اور جلاد کو دیکھنا جو قیدی کے کو سیخ میں پرو کر تنور سے اٹھتے شعلوں میں سینک رہا ہے تاکہ کھال آسانی سے اتاری جا سکے۔

سر کی کھال کو اتار لینا ضروری ہے ورنہ بو دینے لگتی ہے، خاص طور پر اس لیے کہ راہیں طویل اور بے امن ہیں۔ جب سر کی کھال کو بھس بھر کر ہمارے حضورِ اقدس میں پیش کیا جاتا ہے تب یہ کیسے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ اس پیشانی اور آنکھوں کے بڑے بڑے خالی گڑھوں اور دانتوں سے محروم دہن کے پیچھے کیا گزرا کرتا تھا؟ شاید یہی وجہ تھی کہ اجدادِ والا تبار قیدی کو پہلے زندان میں ڈلواتے تھے۔ اور چونکہ کوٹھری کے روزن یا دروازے کی جھری میں سے جھانکنا ان کے لیے ممکن نہ تھا، شاید اس لیے قیدی پر ایک خفیہ نویس مقرر کر دیتے تھے جو اس کی تمام حرکات اور باتوں کو تحریر کرتا اور ہر رات حضور میں پیش کرتا۔ سپاہی دروازہ کھولتے اور کرسی یا چوکی اس کے بیٹھنے کے لیے لا کر رکھتے۔ خفیہ نویس وہاں بیٹھا قیدی کو دیکھتا رہتا اور سب کچھ تحریر میں لاتا۔ لیکن اگر وہ ملعون خبیث منھ سے کراہ تک نکالنے کو تیار نہ ہو یا سو جائے، تب؟ تب اسے ٹھوکریں مار مار کر جگایا جاتا۔ اس کے پاس پانی کا پیالہ رکھا ہوتا اور روٹی کا ایک ٹکڑا۔

اگر قیدی کو معلوم ہو جاتا کہ وہاں، اندھیرے میں، کرسی یا چوکی پر بیٹھا کوئی شخص اس کی حرکات کو غور سے دیکھ دیکھ کر لکھتا جا رہا ہے، تو وہ بے شک خود کو اپنی کھال میں (اسی کھال میں جسے آسانی سے اتار کر اس میں بھس بھرا جا سکتا ہے) چھپا لیتا، یا شاید نہ چھپاتا۔ شاید اپنے دل کا حال صاف کہہ ڈالتا یا قلم تراش کی مدد سے زبان کو آزاد کر لیتا۔ یا اگر قیدی ڈر جاتا، یا منت سماجت کرنے لگتا، تو کیا اس کے لیے اس جیسا کوئی ساتھی نہیں ڈھونڈا جا سکتا تھا؟ آخر ایسوں کا کوئی کال تو ہوتا نہیں۔ کوئی ایسا جو اس قیدی کی طرح کوڑوں کا مزہ چکھ چکا ہو، جس کے پیر شکنجے میں ہوں اور گردن زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہو، وہیں، اس کے نزدیک، پڑا چیخ پکار کیا کرے... اور پھر اگر قیدی خاموش ہو جائے، ہمیشہ سوچتا رہے کہ اس نئے آنے والے کی کھال کے اندر کیا گزر رہا ہے، اگر وہ خود کو اس کی آنکھوں کی پشت پر پہنچانا چاہے تو...؟ اور آخر کار، اگر قیدی بولنے پر آمادہ ہو جاتا اور سب کچھ کہہ ڈالتا تو خفیہ نویس کس طرح اسے جوں کا توں اپنی یادداشت میں محفوظ کر سکتا تھا یا لکھ کر حضور میں پیش کر سکتا تھا؟ کن کن

Scanned with CamScanner

حرکات اور کن کن لفظوں کو ذہن میں محفوظ رکھے اور کون سی چیزوں کو یاد سے مٹا دے؟ ان بے ربط، ٹوٹے پھوٹے فقروں اور ان حرکات سے، جو صرف اسی لمحے کوئی اہمیت رکھتی ہیں جب واقع ہو رہی ہوں، کس طرح کسی آدمی کے گوشت پوست، رگوں اور اعصاب تک پہنچا جا سکتا ہے؟ یا کس طرح کسی کو نئے سرے سے بنایا جا سکتا ہے؟ قیدی اور خفیہ نویس دونوں کو آزاد کیوں نہ کر دیا جائے؟ اونچی دیواروں کے بیچ دو آزاد انسان، ایک باغیچے میں، حوض کے کنارے، بید کے درختوں کے درمیان ٹہلتے ہوئے، اور چند سو کتابیں؟ اور میں؟ میں...

شہزادہ احتجاب کو اپنے ہاتھوں میں لیا ہوا اپنا سر بہت بھاری محسوس ہوا۔ اس کے ہاتھ کانپنے لگے۔

دیواریں اونچی تھیں۔ بہت تلاش کے بعد یہ مکان ہاتھ آیا۔ چار کمرے دو افراد کے رہنے سہنے کے لیے کافی تھے۔ فخری نے کہا:

''شہزادے، آج خانم کو بہت کھانسی ہوئی۔ اتنی زیادہ کہ میں ڈر گئی۔''

میں نے پوچھا، ''خون کی قے تو نہیں ہوئی، ہاں؟''

بولی، ''نہیں، شہزادے، خدا نہ کرے۔ صرف ہونٹوں کے کونے پر کچھ سرخی تھی۔ خانم نے اسے جلدی سے رومال سے پونچھ لیا۔ میں نے کہا: خانم، مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ کہیے تو ڈاکٹر کو... بولیں: نہیں، فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔''

میں نے پوچھا، ''پھر؟ پھر اس نے کیا کیا، فخری؟''

بولی، ''خانم نے کہا: شہزادے سے کچھ مت کہنا۔ میں نے کہا: اچھا نہیں کہوں گی۔''

فخری میں سے بھوسے اور صابن کے پانی کی بو آ رہی تھی۔ اس کے ہاتھوں، پیش بند اور بالوں میں سے۔ بولی، ''خانم اٹھ کر حوض کے پاس چلی گئیں۔ ان کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ بولیں: فخری، کرسی حوض کے پاس رکھ دے۔ میں نے رکھ دی۔ بولیں: اس مکان میں دل گھبراتا ہے، ان سارے کمروں میں (چار منزلہ عمارت تھی، پشتینی مکان)۔ میں نے پوچھا: خانم، کیوں؟ کہنے لگیں: پتا نہیں کیوں، لیکن بالکل دل نہیں چاہتا کہ یہاں مروں۔ کاش شہزادہ کوئی دوسرا مکان لے لے۔ یہ عمارت بہت پرانی ہو گئی ہے۔ تجھ سے بھی ان سارے کمروں کی صفائی ستھرائی اکیلے نہیں ہوتی۔ کاش شہزادہ اس مکان کو بیچ

Scanned with CamScanner

ڈالے۔''

فخری کا بدن گرم تھا، گرم اور ننگا، اور خون میں سنا ہوا۔ سل ان زندہ حصاروں کو توڑ کر اندر نہیں آ سکتی۔ میں نے کہا:

''پھر کیا ہوا؟''

بولی، ''حوض کے پاس بیٹھ گئیں۔ کہنے لگیں: فخری، میرے موزے لے آ۔ میں نے کہا، اچھا، ابھی لاتی ہوں۔ میں اندر سے ان کے موزے لے آئی۔''

میں نے پوچھا، ''اس کے پیر کیسے تھے؟ تجھے اچھے لگے؟''

بولی، ''بہت سفید تھے، شہزادے۔''

فخر النسا نے اپنے پیر حوض کی منڈیر پر رکھ لیے۔ منڈیر ٹھنڈی تھی۔ پھر اس سے نیچے کی سیڑھی پر، جہاں مچھلیاں تیر رہی تھیں۔ مچھلیاں ایک ایک کر کے آتیں اور فخر النسا کے پیروں کی انگلیوں پر منھ مارتیں۔ فخر النسا کو بخار تھا، سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی۔ میں نے کہا:

''عینک لگا رکھی تھی، فخری؟''

بولی، ''ہاں، شہزادے۔ یہ بھی کہا: فخری جان، ذرا جا کے میز پر رکھی کتاب مجھے لا دے۔''

میں نے کہا، ''حوض کے کنارے بیٹھ کر کتاب پڑھنے لگی؟''

بولی، ''جب میں کتاب لے کر لوٹی تو دیکھا، خانم دونوں بازو گھٹنوں کے گرد لپیٹے، سامنے تکے جا رہی ہیں۔ میں نے کہا: خانم، لیجیے۔ وہ کچھ نہ بولیں۔ صرف دیکھتی رہیں۔ میں نے کہا: خانم، یہ رہی آپ کی کتاب۔ خانم ایک دم چونکیں، ان کے کندھے ہلے، مڑیں اور عینک اتار لی۔ بولیں: تو ہے، فخری؟ میں نے کہا: آپ کی کتاب۔ بولیں: ہاں ہاں، مجھے دے دے۔''

میں نے پوچھا، ''پھر کیا ہوا؟''

بولی، ''پھر کچھ نہیں۔ کتاب گود میں رکھ لی اور پہلے کی طرح سامنے دیکھنے لگیں۔''

میں نے پوچھا، ''کہاں؟''

بولی، ''مجھے پتا نہیں کہاں۔ سامنے وہ پتھر کی لڑکیاں بھی تھیں جن کے مونھوں سے پانی بہہ رہا تھا، فوارہ بھی تھا، سڑک بھی تھی، چنار کے پیڑ بھی تھے، سڑک کے بیچ ایک کوا بھی تھا، بیٹھا کسی ہڈی کو کرید

Scanned with CamScanner

رہا تھا۔''

میں نے پوچھا، ''آسمان کی طرف تو نہیں دیکھ رہی تھی؟''

بولی، ''مجھے پتا نہیں، شہزادے۔ میں خانم کے سامنے تو گئی نہیں۔ سوچا اگر گئی تو انھیں برا لگے گا۔''

میں نے تھپڑ مارا، فخری کے منھ پر۔ کہا:

''تجھ سے کہا نہیں تھا...؟''

وہ رونے لگی۔ میں نے کہا:

''پھر کیا ہوا؟''

اس کے آنسو میں نے پونچھ دیے تھے۔ اس کی سسکیاں نہیں رک رہی تھیں۔ کہنے لگی:

''میں باورچی خانے میں جا کر کھانا پکانے لگی۔ پھر آ کر ان سے کہا: خانم، بتیاں جلا دوں؟ آخر مغرب کا وقت ہو رہا تھا۔ بولیں: نہیں، فخری۔ بس یہ پوستین میرے کندھوں پر ڈال دے۔''

میں نے پوچھا، ''اب بھی دیکھ رہی تھی؟''

بولی، ''ہاں، شہزادے۔ پیر حوض میں نہیں تھے۔''

میں نے پوچھا، ''کوا تھا؟''

بولی، ''نہیں تھا۔''

میں نے پوچھا، ''آسمان کا کچھ حصہ دکھائی دے رہا تھا؟''

بولی، ''میں نے دیکھا نہیں۔ شاید نہیں دکھائی دے رہا تھا۔''

میں نے پوچھا، ''آگے، باغ کے آخر میں، دروازہ دکھائی دے رہا تھا؟''

بولی، ''ہاں، میرے خیال میں دکھائی دے رہا تھا۔''

میں نے پوچھا، ''فخر النسا کیا کہتی تھی؟''

بولی، ''بس اتنا کہا: فخری، تو بہت اچھی ہے۔''

کوا اور ہڈی، پتھر کی بی لڑکیاں، فوارہ، پانی میں اٹھتی لہریں... کوا بے شک پہلے ہڈی کو اپنی چونچ سے کرید کر دیکھتا ہے، پھر چونچ میں دبا لیتا ہے، یا نہیں دباتا، اور درختوں کے اوپر سے، یا ان کے بیچ میں سے اڑ کر چلا جاتا ہے۔ کیا فخر النسا اسے دیکھ رہی تھی؟ اگر دیکھ رہی تھی تو کیا اس کے سارے

Scanned with CamScanner

حواس اس کوّے پر مرکوز تھے، اور ہڈی پر، اور اس کی اڑان پر جو... جو... ؟

جب تک اجالا رہتا ہے، دروازہ دکھائی دیتا ہے۔ چھوٹی پھپھی کو مرے مدت ہو گئی۔ وہ آنکھیں... اگر کوئی راہگیر دروازے کی جھری میں سے جھانکے تو اتنی دور اسے کچھ دکھائی نہ دے۔ لیکن فخر النسا دیکھ سکتی تھی۔ چاہے کوئی بھی جھانک نہ رہا ہو۔ وہ ان سیاہ اور غور سے دیکھتی آنکھوں کو دیکھ سکتی تھی، اور جس کی وہ آنکھیں تھیں اسے، یعنی چھوٹی پھپھی کو، اوڑھنی اور نقاب اور چادر میں لپٹی ہوئی دروازے کے پیچھے کھڑی، خوف اور غرور، محبت اور نفرت اور پتا نہیں کون کون سے ملے جلے احساس کے ساتھ... معلوم نہیں کس انتظار میں ہیں، شاید اس انتظار میں کہ اپنی دبلی پتلی بیٹی کو چبوترے پر یا درختوں کے ٹھنڈے سائے میں یا حوض کے کنارے تنہا بیٹھا دیکھ پائیں۔

دھوپ نکلی ہوئی تھی اور درختوں کی چوٹیوں کے درمیان سے آسمان دکھائی دے رہا تھا۔ اگر آسمان پر کوئی بادل کا ٹکڑا ہوتا تو شاید بارش کے چند قطرے حوض میں گرتے۔ یہ فخری نے کہا، یا نہیں کہا۔ وہ تو بس یہی کہا کرتی تھی، ''مجھے نہیں پتا، مجھے نہیں پتا۔'' احمق! فخر النسا اپنے دبلے بدن کے ساتھ، اور ہوا زمی سے چلتی ہوئی...

قیدیوں کو پانی دیتے تھے، دن میں صرف چند گھونٹ۔ تاکہ اسے بار بار باہر نہ نکالنا پڑے یا کم از کم قید خانہ گندا نہ ہو۔ اور روٹی کا بس ایک ٹکڑا۔ اسے باہر والی کوٹھریوں میں سے کسی میں ڈلوا دیتے، یہاں تک کہ وہ سب کچھ بتا دیتا کہ اس کے پاس اور کیا کیا ہے اور کہاں رکھا ہے۔ پھر وہ اچانک دیو ہیکل جلاد کو، خنجر ہاتھ میں لیے، کوٹھری کے دروازے میں کھڑا دیکھتا ہے۔ خنجر کی نوک سے خون ٹپک رہا ہے۔ جلاد اسی طرح کھڑا دیکھتا رہتا ہے۔ کبھی کبھی شاید خنجر کے تیز دھار پھل پر ہاتھ پھیرتا ہے اور پھر معتمد میرزا کی طرف دیکھنے لگتا ہے۔ معتمد میرزا قالین کے گل بوٹوں کو دیکھ رہا ہے اور ان میں سے ایک پیچیدہ اِسلیمی نقش پر اپنی انگلی پھیر رہا ہے۔ کہہ رہا ہے، ''اچھا، پھر انتظار کس بات کا ہے؟ خدا کے لیے اپنا کام پورا کرو۔'' جلاد کہتا ہے، ''حضرتِ والا فرماتے ہیں کہ جاؤ، سید حبیب کا سر کاٹنے کا انعام معتمد میرزا سے وصول کرو۔'' فخر النسا بتاتی تھی۔ اس نے کہیں پڑھا تھا... یا اپنے بابا سے سنا تھا؟ کیا فرق پڑتا ہے۔

کیا فخر النسا ان باتوں کے بارے میں سوچ رہی تھی؟ یا... اس کوّے اور اس سڑک اور ان

Scanned with CamScanner

درختوں کے سائے کے بارے میں؟ یا ان شاخوں کے بارے میں جو سڑک کے آخر تک چلی گئی تھیں اور جنھوں نے سڑک پر جھک کر ایک سبز محرابی راہداری بنا دی تھی؟ یا فوارے کی مسلسل اور یکساں آواز کے بارے میں؟ یا ان چڑیوں کے بارے میں جن کے پر قلم تراش سے کتر دیے گئے تھے تاکہ اڑ کر کہیں نہ جا سکیں؟ وہ بانس کی سیڑھی لے کر آیا اور ہاتھ ڈال کر اس مصنوعی محراب کے اندر سے کچھ چڑیاں پکڑ لیں۔ ان کے پر، بے شک، رہے ہوں گے ورنہ اڑ نہیں سکتی تھیں۔ کہاں تک؟ کیا اس نے سیڑھی پر کھڑے کھڑے ان کی آنکھیں نکال ڈالی تھیں یا نیچے لا کر؟ جو بھی ہو، اس نے آنکھیں نکال دی تھیں۔ اس طرح کی چیزیں موروثی تو نہیں ہوتیں، یا شاید ہوتی ہوں گی۔ رگوں میں اجداد کا خون؟ میں تو شکار پر بھی نہیں جا سکتا تھا۔ کسی مرغابی کو بھی خون میں تر... یا سلوقی کتے کے جبڑوں میں پھنسا ہوا دیکھ پاتا تو... تیرہ برس کا لڑکا، چاہے اسے ابھی ابھی کسی ولایت کا حاکم مقرر کیا گیا ہو، ایسی چیزیں کس طرح کر سکا ہوگا؟ اس کا اتالیق کیا کر رہا تھا...؟ چڑیوں کی آنکھیں اس نے ایک ایک کر کے نکالیں، اور پھر انھیں اڑنے کے لیے آزاد کر دیا۔ کہاں تک؟ وہ درختوں سے ٹکرائی ہوں گی یا دیوار سے؟ کیا وہ ہنس رہا تھا؟ معلوم نہیں۔ شاید صرف دیکھ رہا تھا کہ شاید اس بار ان میں سے کوئی... یا شرط باندھ رہا ہوگا کہ یہ والی چڑیا ضرور کاج کے درخت تک پہنچ جائے گی، اور جب اسے پہنچتے نہ دیکھتا تو کسی اور پر شرط لگاتا۔ کیوں؟ آخر کوئی شخص کیوں ایسی چیزیں پڑھنا چاہے گا؟

فخری نے کہا، ''وہ بس بیٹھی سامنے دیکھتی رہیں۔'' کوا اڑ چکا تھا۔ سورج ڈوب چکا تھا۔ فخرالنسا اگر گردن گھماتی تو اسے آسمان پر مغرب کے وقت کی سرخی دکھائی دے جاتی۔ لیکن اس نے مڑ کر نہ دیکھا، یا شاید مڑی اور اسے محسوس کر لیا۔ یا شاید محسوس نہیں کیا اور پھر... پھر جب اندھیرا چھا گیا تب؟ یقیناً باہر کی کسی عمارت پر جلتی ہوئی کسی بتی کی روشنی رہی ہوگی، شاید عمارت کے مغربی پہلو کی کھڑکی سے آتی ہوئی... اور فوارے کی آواز اور جھینگروں کی آواز، اِس وقت کی طرح جب ان آوازوں کا تار ختم ہی نہیں ہوتا... جب آدمی اندھیرے میں، اُس سمت، دیکھتا ہے تو اسے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کیا کچھ ہونا ممکن ہے، لیکن یہ نہیں پتا چلتا کہ کیا ہو رہا ہے۔ اسی لیے اندھیرے کے پاس بتانے کو اتنا کچھ ہوتا ہے۔ جن راتوں کو میں دیر سے گھر لوٹتا تھا، مجھے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کھڑکی کے پاس بیٹھی ہے، اندھیرے میں... اندھیرے کو تکتی ہوئی... اور... اور شاید دراصل اس تمام وقت فخرالنسا کی آنکھیں بند

ہی رہتی ہوں، یا وہ سوتی رہی ہو... اور سوتے میں؟

اُس آبائی مکان میں آدمی خود کو ہر وقت کسی نہ کسی کام میں مصروف رکھ سکتا تھا۔ ان سب باعفت مستورات کے بارے میں سوچنا جو دادا حضور کے حرم میں تھیں، اور آخوندوں کے بارے میں... میں نے یہ مکان خرید لیا۔ اس کی دیواروں پر نظر پڑتے ہی مجھے پسند آ گیا۔ میں نے سوچا، اچھا ہوگا اگر بید کا درخت کٹوا دوں، باغیچے کی جگہ پکا فرش کروا دوں اور حوض میں پانی بھروا دوں۔ لیکن یہ نہ ہو سکا۔ اگر وہ جان جاتی تو بالکل نہ ہو سکتا۔ میں نے کہا، ٹھیک ہے، یوں ہی کیا برا ہے۔ حیدر علی بھی تھا۔ میں نے اس کے لیے ایک اور بیوی کا انتظام کیا۔ میں نے ان دونوں سے کہا کہ پھاٹک کے پاس اس کمرے میں اپنا اسباب رکھ لیں اور وہاں سے ہرگز نہ ہلیں، سوائے باغیچے کی دیکھ بھال یا سودا سلف لانے کی غرض سے۔ لیکن جب میں نے دیکھا کہ انھوں نے اپنا پھیلاوا پھیلانا شروع کر دیا ہے — دو سال میں دو بچے پیدا کر ڈالے — تو میں نے انھیں نکال باہر کیا۔ میں نے ٹھیک کیا۔ وہ اپنے عم زاد کے گھر چلا گیا۔ جب فخر النسا مر گئی تو پھر آ گیا۔ ''میں اور فخری ساتھ ساتھ ہیں۔'' احمق!

شروع میں میں پھاٹک بند نہیں رکھتا تھا۔ انھیں پھل اور سبزیاں گھر کے اندر لانے دیتا تھا۔ رعیت لاتی تھی، یا پھر بازار سے آ جاتیں، تاکہ گھر سے کسی کو باہر نہ جانا پڑے۔ صرف کبھی کبھار، جب فخر النسا اصرار کرتی تو ہم گاؤں جاتے۔ ڈاکٹر نے بھی وہاں جانے کی صلاح دی تھی... ڈاکٹر نے یہ بھی کہا تھا کہ اسے شراب نہیں پینی چاہیے۔ میں نے رعیت کو یہ کام سونپ دیا تھا کہ ہر سال شراب کشید کریں اور یہاں پہنچا جایا کریں۔ تہہ خانے میں چند پیپے ہمیشہ رکھے رہا کرتے۔ سہ پہر کو بھی پیتی اور شام کو بھی۔ اور صبح؟ فخری کہتی تھی، ''کبھی کبھار، بس ایک آدھ جام۔'' فخری کہتی تھی، ''صبح کو خانم تمام وقت صحن میں ٹہلا کرتی ہیں۔'' اگر میں صبح جلدی اٹھ جاتا تو خود بھی دیکھتا، اوپر مہتابی پر سے۔ عینک ہاتھ میں پکڑے ٹہل رہی ہوتی۔ اس سفید جالی دار پیراہن میں سے اس کا سفید، دراز قد بدن جھلک رہا ہوتا۔ پیچھے سے اس کی سفید گردن دکھائی دیتی۔ بال اس نے پستانوں پر ڈال رکھے ہوتے۔ چلتی جاتی اور ایک سبز ٹہنی کو چباتی جاتی۔ جب کبھی کھانسی اٹھتی تو جا کر بید کے درخت کے نیچے رکھی اپنی کرسی پر بیٹھ جاتی۔

وہ اپنی کرسی پر بیٹھی تھی۔ عینک اس کی آنکھوں پر لگی تھی۔ اپنے بالوں سے کھیل رہی تھی۔ کہنے لگی:

Scanned with CamScanner

’’شہزادے، تم انتظار کر رہے ہو، ہاں؟‘‘

میں نے کہا، ’’فخر النسا، صبح اتنے سویرے تمھیں سردی لگ جائے گی۔ اور پیراہن بھی یہ جالی دار پہن رکھا ہے۔‘‘

بولی، ’’دیر سے یا جلدی، کیا فرق پڑتا ہے؟ کل رات کتنا ہارے، شہزادے؟‘‘

میں نے کہا، ’’کچھ خاص نہیں۔‘‘

بولی، ’’تمھیں سردی نہیں لگے گی؟‘‘

میں نے کہا، ’’فکر مت کرو۔‘‘

بولی، ’’فخری کو آواز دو، وہ کوئی چیز لا کر میرے کندھوں پر اڑھا دے۔‘‘

یہ کہہ کر کھانسنے لگی۔ میں نے جا کر فخری سے کہا۔ یہ بھی کہا، ’’اگر خانم کچھ کہیں تو ہوشیار رہنا، کہیں بھول نہ جانا، ورنہ...‘‘ میں نے اس کے ہونٹوں پر چٹکی لی اور اسے بغل میں لے لیا۔ کہا:

’’ہنس، زور زور سے ہنس!‘‘

بولی، ’’خانم...‘‘

میں نے کہا، ’’ٹھیک ہے، میں چاہتا ہوں کہ وہ تیری آواز سنے۔‘‘ اور وہاں، زینے کے اوپر کھڑے کھڑے، اس نے کہا، ’’یہاں نہیں، شہزادے۔‘‘

میں نے کہا، ’’یہاں کیوں نہیں؟‘‘

بولی، سردی ہے۔ میری پیٹھ جمی جا رہی ہے۔‘‘

میں نے کہا، ’’تجھ پر اتنا گوشت ہے، کیوں ڈر رہی ہے؟ ہنس، لڑکی، زور زور سے ہنس! اگر فخر النسا کہے کہ کیوں ہنس رہی تھی، تو کہہ دینا شہزادے نے کہا تھا۔ ڈرنے کی ضرورت نہیں، کہہ دینا۔ لیکن بھولنا مت، مجھے سب کچھ بتانا کہ جب تو نے یہ کہا تو اس کی آنکھیں، اس کے ہاتھ، اس کے ہونٹ کیسے ہو گئے۔‘‘

فخر النسا نے کہا تھا، ’’فخری جان، تو بہت اچھی ہے۔‘‘ اور مسکرائی تھی اور اپنے ہاتھ پوستین کی جیبوں میں ڈال لیے تھے۔ آنکھیں اس کی عینک کے شیشوں کے پیچھے تھیں، پلکیں نہیں جھپک رہی تھیں۔ فخری اس کے سامنے زانو پر ہاتھ مار مار کر کہتی، ’’خانم، بخدا، میں...‘‘ وہ جواب دیتی، ’’میں

جانتی ہوں، تو اچھی ہے۔'' اور فخری کی پیشانی پر پڑے بالوں کو اپنے ہاتھ سے پیچھے ہٹاتی۔ فخری کے پیراہن کا گلا بھی اس نے ٹھیک کر دیا تھا۔ پھر بولی، ''فخری، تو حمام جا۔ اس طرح نہیں ہو سکتا۔ ایک ہفتہ ہو گیا کہ تو...'' وہ کہتی، ''خانم، ابھی میں ناپاک ہوں۔ جب پاک ہو جاؤں گی، تب ضرور۔'' فخر النسا پوچھتی، ''تو پھر شہزادہ تجھ سے کس طرح... اُس وقت کیسے...؟'' فخری رونے لگتی اور اپنا سر فخر النسا کے دامن پر رکھ دیتی۔ فخر النسا فخری کے بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگتی۔ کہتی، ''فخری، تو بہت اچھی ہے۔'' اور پھر کھانسنے لگتی۔

جب میں زینے سے اتر کر نیچے آیا تو دیکھا فخری نے اس کے کندھے پکڑ رکھے تھے۔ فخر النسا ابھی تک کھانس رہی تھی۔ بولی، ''شہزادے، اگر تمھارے پاس وقت ہو تو ڈاکٹر ابونو اس کے پاس چلے جاؤ اور اسے یہاں آنے کو کہہ دو۔'' میں نے کہا، ''ہمارے پاس فون ہے۔ فخری سے کہو اسے فون کر دے۔'' وہ بولی، ''دیکھو، شہزادے، میں کچھ نہیں کہتی، لیکن اگر لالہ کے پودے نہ بیچتے تو بہتر نہ ہوتا؟ کم از کم وہ تو میرے لیے رہنے دیتے۔'' میں نے کہا، ''میرے پاس اس کوڑے کرکٹ کے لیے جگہ نہیں۔'' بولی، ''کیا آج رات ہم تمھارے آنے کا انتظار کریں؟'' میں نے کہا، ''معلوم نہیں۔ دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔'' فخری نے سر جھکا رکھا تھا۔

جب رات آئی تو اوپر کے کمرے سے فخر النسا کی آواز سنائی دی۔ فخری نے کہا:

''ڈاکٹر آیا تھا۔ کہہ رہا تھا: خانم، ایسی حالت میں شراب نہ پیا کیجیے۔ یا کچھ کم ہی کر دیجیے۔ خانم نے کہا: جلدی یا دیر سے...''

میں نے کہا، ''فخری، صبح کا حال سنا۔''

اس نے سنایا۔

میں نے کہا، ''اوپر جانے کے بعد کیا ہوا؟''

بولی، ''خانم تخت پر لیٹی ہوئی تھیں۔ بولیں: فخری، تو ٹھیک سے کیوں نہیں ہنستی؟ میں کہنا چاہتی تھی: خانم، کیا کروں، شہزادہ مجھے پرے سے گدگدی کرتا ہے۔ لیکن کہا نہیں۔ خانم بولیں: جانتی ہوں۔ لیکن یہ نہیں جانتی کہ شہزادہ ایسی حالت میں کیسے تیرے ساتھ... جبکہ تو ناپاک ہے۔''

میں نے پوچھا، ''اور کیا کہہ رہی تھی؟''

Scanned with CamScanner

کہنے لگی، ''مجھے پتا نہیں۔'' پھر کہنے لگی، ''مجھے یاد نہیں رہا۔'' پھر بولی، ''میں بتانا نہیں چاہتی... ''میں نے اس کے منہ پر تھپڑ مارا۔ کہنے لگی... میرا خیال ہے یہی کہا تھا... رو رہی تھی اور روتے روتے کہہ رہی تھی، ''آخر مجھے ہر بات تو یاد نہیں رہ سکتی۔''

تخت پر، اور چھت پر چونے سے بنے ان سب نقش و نگار اور بیچ میں لٹکتے فانوس کے اردگرد، اور ان میں جڑے چھوٹے چھوٹے آئینوں میں اور کتابوں میں... مسہری پر لیٹ کر آدمی ان آئینوں میں اپنی شکل نہیں دیکھ سکتا۔ منیرہ خاتون شاید دیکھ سکتی تھی۔

ڈاکٹر آتا ہے، فخری بھی ہے۔ ڈاکٹر کہتا ہے، ''خانم، آپ کے سینے کا ایکسرے کرنا ہوگا۔'' فخرالنسا کہتی ہے، ''صرف شربت دے دیجیے تاکہ کھانسی نہ آئے، یا کم از کم اپنے پیروں پر کھڑی ہو سکوں۔''میں نے کہا:

''اور کیا بات ہوئی، فخری؟''

بولی، ''زیادہ بات نہیں ہوئی۔ ڈاکٹر جلدی ہی چلا گیا۔ جاتے ہوئے بولا: فخری، تیری خانم کا حال خراب ہے۔ شہزادے سے میرا اسلام کہنا، اور کہنا خانم کی فکر کریں ورنہ...''

میں نے کہا، ''ہنس، فخری، زور زور سے ہنس۔ میں اس کی کھانسی کی آواز نہیں سننا چاہتا۔ ہنس!''

فخرالنسا بالکل ویسے کھانستی تھی جیسے دادا حضور اور دادی حضور کھانسا کرتی تھیں۔ فخری کہتی تھی، ''شہزادے، آخر آدمی بلاوجہ تو نہیں ہنس سکتا۔''میں پرے سے اس کی بغل میں گدگدی کرتا یا پیروں کے تلووں میں۔ فخری بل کھا جاتی۔ اس کے پستان ہلنے لگتے۔ اس قدر ہنستی کہ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے۔ لیکن فخرالنسا کی کھانسی پھر سنائی دیتی۔ میں فخری کے بالوں میں سر دے لیتا اور کانوں پر ہاتھ رکھ لیتا۔

اوپر، اس مسہری پر، جس وقت فخری کے ہنسنے کی آواز سنائی دیتی، اور چھت پر بنے چونے کے نقش و نگار، چھوٹے چھوٹے آئینے، اور فانوس...؟ کتابیں الماری پر رکھی تھیں، یا مسہری کے پاس، یا آتشدان پر، ایک کے اوپر ایک۔ اگر وہ سر گھما کر دیکھتی تو اسے میز پر کتاب کے صفحوں میں رکھی جانے والی نشانی بھی دکھائی دے جاتی۔ کیا یہی کچھ تھا؟ اس نے ایک بار بھی نہیں کہا، ''تم بہت اچھے ہو، شہزادے۔''

میں نے کتنی ہی کوشش کی مگر اس کے برہنہ بدن کو کبھی نہ دیکھ سکا۔ کہتی تھی، ''مجھے اچھا نہیں لگتا، شہزادے۔'' میں صرف اس کے پہلو میں لیٹ جاتا اور اندھیرے میں اس کے پورے بدن پر ہاتھ پھیرتا۔ وہ کہتی، ''جلدی کرو اور میری جان چھوڑو۔ میں سونا چاہتی ہوں۔'' لیکن پھر اسے نیند نہ آتی۔ کہتی، ''اچھا اب اٹھو، اس کتاب میں سے کچھ صفحے مجھے پڑھ کر سناؤ، بلکہ...'' میں کہتا، ''تم نے پھر وہی شروع کر دیا، فخر النسا؟ مجھے نیند آ رہی ہے۔'' کہتی، ''اس لیمپ کو روشن کر کے اپنے پاس رکھ لو۔'' میں مسہری پر اس کے پاس بیٹھ جاتا اور پڑھنے لگتا۔ وہ اپنے ہاتھ سر کے پیچھے رکھ کر چھت کو تکنے لگتی۔ جب میں اس کی طرف دیکھتا تو وہ کہتی، ''تمھارا دھیان کہاں ہے، شہزادے؟'' اس کا ایک پستان دکھائی دے رہا تھا۔ لیمپ کی روشنی اس پر پڑ رہی تھی۔ میں اس کے نچلے پستان کو گھورنے لگا جس پر سایہ پڑ رہا تھا۔ بولی، ''پڑھو، شہزادے۔'' میں یقیناً نشے میں رہا ہوں گا، کیونکہ میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کے شب خوابی کے لباس کا تکمہ کھول دیا۔ وہ اسی طرح کروٹ سے لیٹی ہوئی تھی، ہاتھ سر کے نیچے رکھے چھت کو تک رہی تھی۔ میں نے کہا، ''مجھے تم سے محبت ہے، فخر النسا۔'' وہ ہنسنے لگی، اتنے زور سے ہنسی کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ عینک نہیں لگائے ہوئے تھی۔ فخری اتنی اونچی اور خوشگوار آواز میں نہیں ہنس سکتی تھی۔ ہرگز نہیں ہنس سکتی تھی۔ میں نے کتنی ہی کوشش کی، لیکن نہ ہو سکا۔ اس کے بڑے بڑے پستان ہلنے لگتے، منھ کو اتنا کھول دیتی کہ مجھے اس کے سارے دانت دکھائی دینے لگتے۔ اس کے بس کی بات ہی نہ تھی۔ یوں لگتا جیسے پانی سے غرارے کر رہی ہو۔ میں نے اسے مارا بھی، لیکن اس سے نہ ہوا۔ میں کہتا:

''ٹھیک ہے، اسی طرح ہنس، لیکن اونچی آواز میں۔''

اور اس کی بغل میں گدگدی کرنے لگتا، یہاں تک کہ اسے رونا آ جاتا۔ میں اس کے برابر میں لیٹ جاتا اور اپنا سر اس کے بالوں میں یا پستانوں پر رکھ لیتا۔ وہ گرم تھی۔ میں سو جاتا، وہیں، فخری کے بستر میں۔ لیکن مجھے نیند نہ آتی۔ فخر النسا کی کھانسی کی آواز خشک تھی اور ٹکڑوں ٹکڑوں میں آتی تھی۔

جب تابوت لایا گیا اور قندیلیں بجھا دی گئیں اور پورے تکیے میں عود کی خوشبو پھیل گئی اور قاری چلے گئے اور ختم کی مجلس پوری ہوئی، تب فخر النسا — گلدان میں سے گلِ میخک نکال کر اپنے دہن کے گوشے میں اٹکائے بغیر — جا کر اپنی تصویر کے چوکھٹے میں بیٹھ گئی۔ اس کے بالوں پر گرد جمی ہوئی تھی۔

Scanned with CamScanner

اور شہزادے نے دیکھا... دیکھا کہ فخر النسا اپنے بالوں پر جمی اس گرد کے پیچھے، اور اس جالی دار پیراہن اور عینک اور اپنی سفید جلد کے پیچھے، اس کی دسترس سے دور، ہے بھی اور نہیں بھی ہے۔ اور سفید چادر اور فخر النسا کے دہن کے کونے سے بہتا خون۔ اور اسے ایک بار پھر پہیوں کی چرچراہٹ اور حسنی کے پیروں کی چاپ سنائی دی۔ پہیوں دار کرسی سیڑھیوں پر چڑھ کر اوپر پہنچی اور مراد اس کے پیچھے آ کر بولا:

''جلدی کر، عورت۔''

حسنی بولی، ''میں تھک گئی ہوں۔ کیا ان سیڑھیوں پر چڑھنا ضروری ہے؟''

اس کے بعد سوائے پہیوں کی چرچراہٹ کے، جو بڑے کمرے میں گونج رہی تھی، کوئی آواز نہ آئی۔ دروازہ کھلا تو شہزادے کو صرف پہیوں کی چرچراہٹ اور عورت کے قدموں کی چاپ ہی سنائی دی۔ دروازہ بند ہو گیا۔

''سلام۔''

حسنی نے بھی کہا، ''سلام۔''

شہزادے نے کہا، ''مراد، تو پھر آ گیا؟ کیا میں نے سو دفعہ تجھ سے نہیں کہا...''

شہزادے نے فقط قالین پر کرسی کے پہیوں کی نرم حرکت کو محسوس کیا۔ چوہے کسی چیز کو کتر رہے تھے۔ شہزادہ چیخ کر بولا:

''مراد، پھر کوئی مرا ہے کیا، ہاں؟''

یہ کہہ کر کھانسنے لگا۔ ماچس جلائی گئی تو شہزادے کو چہرے کی جھریوں اور ہونٹوں میں دبے سگریٹ کے جلتے سرے کی مدھم چمک کے درمیان فقط وہی دو آنکھیں دکھائی دیں۔ جان گیا کہ پہیوں دار کرسی اب آتشدان کے پاس پہنچ گئی ہے اور حسنی آتشدان کی راکھ کرید کر اس میں کوئی چیز ڈھونڈ رہی ہے۔ چوہوں کے کسی چیز کو کترنے کی بھی آواز آئی۔ خشک اور طویل کھانسی سے شہزادے کے کندھے کانپنے لگے۔

مراد بولا، ''شہزادہ جان، شہزادہ احتجاب اپنی عمر آپ کو دے کر رخصت ہوا۔''

شہزادے نے پوچھا، ''احتجاب؟''

مراد نے کہا، ''اسے نہیں پہچانتے؟ سرہنگ احتجاب کا بیٹا، بڑے شہزادے کا پوتا، جدِ اعلیٰ کا

Scanned with CamScanner

پڑپوتا۔ خسرو کو کہہ رہا ہوں، جو سلام کے دن بڑے شہزادے کے برابر میں کھڑا ہوتا تھا، اور بڑے شہزادے جس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہتے تھے: میرے بیٹے، تم اپنے باپ کی طرح قرمساق مت نکلنا۔"

شہزادہ بولا، "آہا۔"

"سل ہوگئی تھی۔ سرکنڈے کی طرح سوکھ گیا تھا۔ پہچان میں نہ آتا تھا۔ خدا اس کی مغفرت کرے۔"

کھانسی سے شہزادے کے کندھے کانپنے لگے۔ اور شہزادے کو سنائی دیا کہ کھڑکیوں میں جڑے رنگین شیشے، فانوس، الماری کے خانوں میں رکھی قابیں اور رکابیاں، اور دیواروں پر لگی تصویریں —— دادا حضور اور دادی حضور، پھپھیوں اور یہاں تک کہ فخرالنسا کی تصویریں —— لرزنے لگیں۔ اور شہزادے نے دیکھا کہ فخرالنسا اس سفید چادر کے نیچے سیدھی لیٹی ہوئی ہے اور خون چادر میں سے رس رہا ہے اور یہ دھبا پھیلتا جا رہا ہے۔ وہ کھانسا اور خون اس کے منھ سے نکل کر ہونٹوں پر پھیل گیا۔

چوہے جا چکے تھے۔ شہزادے نے سر جھکا کر ہاتھوں میں تھام رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ پیشانی سرد پڑ گئی تھی۔ صبح کاذب نے پورے کمرے میں اجالا کر دیا تھا اور کہیں دور مرغے بانگ دے رہے تھے۔ شہزادے کو کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سنائی دیں، اور قالین پر پہیوں کے چلنے کی آواز، اور پھر دروازے کے کھلنے اور بند ہونے کی آواز۔ کرسی کے پہیے ہال کمرے کی کاشی کی ٹائلوں پر چرچرائے اور پھر سیڑھیوں پر۔ مراد بولا:

"عورت، جلدی کر!"

اور حسنی نے کہا، "میں تھک چکی ہوں۔ کیا ان سیڑھیوں سے اترنا ضروری ہے؟"

سیڑھیاں سیلن زدہ تھیں اور ان کا کوئی اختتام نہ تھا۔ اور شہزادہ جانتا تھا کہ اس کے بس کی بات نہیں کہ وہ دادا حضور کو اپنی کھال میں جگہ دے سکے... کہ فخرالنسا اس زینے پر نیچے، اور نیچے اترتی چلی جا رہی ہے، اسی زینے پر جو سیلن زدہ دہلیزوں تک لے جاتا تھا، اور اس سرد تہہ خانے تک اور سفید چادر اور اس میں سے رستے خون تک، اور ان دو خیرہ آنکھوں تک جو تھیں بھی اور نہیں بھی تھیں۔

❊❊

اگلے صفحات میں سعید الدین کی تازہ نظموں کا ایک انتخاب پیش کیا جا رہا ہے۔ سعید الدین کی نظمیں ''آج'' کے صفحات پر ابتدا ہی سے شائع ہوتی رہی ہیں، اور ان کی نظموں کا مجموعہ ''رات'' بھی آج کی کتابیں کے زیرِ اہتمام 1997 میں شائع ہوا تھا۔ پچھلے کچھ برسوں سے سعید الدین کی شاعری میں ایک طرح کا تعطل آ گیا تھا۔ کئی برس کے وقفے کے بعد انھوں نے نظمیں لکھنے کا سلسلہ دوبارہ شروع کیا ہے۔ اس انتخاب سے ان کی شاعری کے نئے رخ کا اندازہ ہوتا ہے اور توقع پیدا ہوتی ہے کہ ان کی شاعری اس نئی سمت میں مزید منزلیں طے کرے گی۔

Scanned with CamScanner

سعید الدین

محبت

اس کمرے میں مت جاؤ
محبت کپڑے بدل رہی ہے
تم محبت کا بدن دیکھ لو گے
اور سب کو آ کر بتا دو گے
محبت کا بدن جگہ جگہ سے جلا ہوا ہے
اس کے بدن کی جلد
جا بجا سے نچ گئی ہے
تم حقارت سے کہو گے
بو دینے لگے ہیں یہ زخم

تم نے محبت کو
پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا
محبت ہمیشہ سے ایسی ہی ہے
زخم خوردہ
جلی بھسی

Scanned with CamScanner

محبت کے زخم کبھی نہیں بھرتے
اگر تمھیں ان سے
پیپ بہتی نظر آتی ہے
یا ان رستے زخموں سے بو آتی ہے
تو اس کے پاس نہ جاؤ

مجھے کبھی محبت سے گھن نہیں آتی
میں اس کے زخموں کو
چھو کر بھی دیکھ لیتا ہوں
ایک ایک زخم کو
ہونٹوں سے اٹھا کر
میں اپنے جسم پر رکھتا ہوں
پھر آئینے کے سامنے جا کھڑا ہوتا ہوں
مجھے اپنا آپ حسین دکھائی دیتا ہے

محبت کے زخم
اصل میں میرے اپنے زخم ہیں
یہ زخم میں آئینے کو مستعار بھی
دینے پر تیار نہیں ہوں
میں ان زخموں کی مہک میں
لمبے لمبے سانس لیتا ہوں
محبت دور بیٹھی
یہ سب کچھ دیکھتی ہے

Scanned with CamScanner

وہ میرے نزدیک آتی ہے
اور مجھے چھوتی ہے
جن سطحوں پر یہ مجھے چھوتی ہے
اس کا تصور بھی تم نہیں کر سکتے
ایک بار تم اس لمس کو محسوس کر سکتے
تو پھر کسی چیز کو
اپنے بدن سے مس تک نہ ہونے دیتے
جیسے میں
محبت کے سوا
کسی دوسری چیز کو
اپنے بدن سے مس نہیں ہونے دیتا

اب میں
بے رنگ
اور بے بو ہو گیا ہوں
مجھے چھونا تو دور کی بات ہے
جب تک محبت
کسی روزنِ دیوار سے
میرے جسم پر منعکس نہ ہو
مجھے
دیکھا تک نہیں جا سکتا

Scanned with CamScanner

نظم

اس نے سکہ میری کھلی ہوئی ہتھیلی پر رکھ دیا
''اب مجھے ایک سوانگ اور بھرنے دو''
اس نے چند نپے تلے قدم اٹھائے
پھر وہ مڑا
میں نے دیکھا اس کا چہرہ بدلا ہوا تھا
اس کے چہرے سے انکسار
اور بے چارگی رخصت ہو چکی تھی
پھر اس نے
تاریخ، اخلاق، تہذیب
اور انسانیت کے خون میں ڈوبی ہوئی
چند تقریریں کیں
اس کی کمر دُہری ہو چکی تھی
پھر اس نے اپنی پیٹھ آپ تھپتھپائی
اور کمر کو ٹھونک کر
وہ پھر کھڑا ہو گیا
اس کی نظر اب بھی
میری ہتھیلی پر رکھے ہوئے سکے پر تھی
سکہ ہتھیلی پر رکھے رکھے
سرخ ہو کر لو دینے لگا تھا
وہ بھاگتا ہوا آیا

Scanned with CamScanner

اور ایک اور سکہ
میری کھلی ہوئی ہتھیلی پر رکھ دیا
"بس دو چار مکالمے اور رہ گئے ہیں"
وہ لجاجت سے مسکرایا
لو دیتے پہلے سکے نے
تیزی کے ساتھ دوسرے سکے کو بھی
انگارے کی طرح سرخ کر دیا
اس نے اپنی پتلون کی جیب سے
مٹھی بھر سکے نکالے
اور میری ہتھیلی پر رکھ دیے
پھر اس نے اپنی وردی
بوٹ
اور اپنی گز بھر لمبی زبان نکال کر
میری ہتھیلی پر رکھ دی

وہ زیادہ دیر
اس حدت کے آگے نہ ٹھہر سکا
جو آس پاس کی ہوا میں شامل
آکسیجن کی مقدار کو بھی
جلنے کے اس عمل میں شریک کر رہی تھی

اس کا بدن پگھلنے لگا
کمرے میں نکاسی کے لیے ایک تنگ سی موری تھی

Scanned with CamScanner

اس کا بدن پگھلے بغیر
اس سے گزر نہیں سکتا تھا

ستارے سے ستارے نے کہا

ٹوٹنے والے ستارے کتنے تھے
میں کبھی ان کو گن نہیں پایا
کچھ دیر تک گنتا
پھر مجھے نیند آ دبوچتی
خواب میں میں
خود کو ستاروں کے بیچ پاتا
اتنے بہت سے ستارے
اپنے آس پاس پا کر
میری خوشی کی انتہا نہ رہتی
میں ستاروں کو چھوتا
اور ان کے ٹھنڈے پن
اور نمی کو ہتھیلیوں میں اترتا محسوس کرتا
پھر یکا یک ستاروں میں
دراڑیں ابھرنے لگتیں
اور یہ ٹوٹ کر
دور تک بکھر جاتے

Scanned with CamScanner

میرے ہاتھ بہت چھوٹے تھے
میں ان کے ٹکڑوں کو سمیٹ نہیں سکتا تھا
پھر مجھے دور زمین دکھائی دیتی
ایک جاگتا ہوا حیرت زدہ بچہ
بڑے تاسف کے ساتھ
ٹوٹے ہوئے ستاروں کو گن رہا ہوتا
شاید یہ مجھے بھی
کسی ٹوٹے ہوئے ستارے کا
ٹکڑا سمجھ رہا ہوتا تھا
اس کے ہاتھ اوپر کو اٹھے ہوئے ہوتے
اور نیند سے بوجھل پلکیں
اسے یہ دیکھنے کی مہلت بھی نہ دیتیں
کہ میں بھی
اس کے اٹھے ہوئے ہاتھوں کو چھونے کے لیے
کتنے نیچے تک
زمین پر جھک آیا ہوں

پھیلتا ہوا دائرہ

کوئی مجھے لکھاتا ہے
اور میں لکھتا چلا جاتا ہوں
کوئی مجھے ہنساتا ہے

اور میں ہنستا چلا جاتا ہوں
کوئی کہتا ہے
چپ ہو جاؤ
ایسے میں مجھے بڑی دقت ہوتی ہے
پھر بھی میں احتجاج نہیں کرتا
لیکن چپ بھی نہیں ہوتا
بس ہنستا چلا جاتا ہوں
اور میری ہنسی ہی
میرا احتجاج بن جاتی ہے
ہنسی کے چھوٹے چھوٹے دائرے
باہم مل کر
ایک بڑا سا دائرہ بناتے ہیں
مجھے لکھانے والے
ہنسانے والے
اور چپ کرانے والے
ہنسی کے اس پھیلتے دائرے سے
بچ نکلنے کے لیے
ہاتھ پاؤں مارتے ہیں
ہنسی کا دائرہ
سب کو نگل جاتا ہے
مجھے بھی

Scanned with CamScanner

فیصلہ

جھوٹ بولنے والے
اور سچ بولنے والے
سب ایک ہیں
پہلے کبھی یہ الگ الگ رہے ہوں
پر اب یہ ایک ہیں
کسی کو کچھ پتا نہیں
کہ سچ بولتے بولتے
سچ
کب جھوٹ بن جاتا ہے
اور جھوٹ
ایک جگہ پر جا کر
جھوٹ نہیں رہتا
یہاں پر
ایک نو گو ایریا ہے
یہ ان لوگوں کا قطعہ ہے
جو نہ جھوٹ بولتے ہیں
نہ سچ
چپ رہتے ہیں
لیکن ان کی یہ چپ بھی

Scanned with CamScanner

زیادہ دور تک نہیں چل پاتی
جب ان کی چپ
چپ نہیں رہے گی
اور یہ بول پڑیں گے
کچھ نہیں کہا جا سکتا
یہ جھوٹ بولیں گے
یا سچ
البتہ یہ بات طے ہے
کہ فیصلہ
ان ہی کے ہاتھوں میں ہوگا

روشنائی

آپ لکھنے کے لیے
کس رنگ کی روشنائی استعمال کرتے ہیں؟
عام طور پر
نیلی یا سیاہ روشنائی استعمال کی جاتی ہے
لیکن میں
بغیر روشنائی کے
کاغذ پر لکھ لیتا ہوں
اس میں آسانی یہ ہے

Scanned with CamScanner

کہ مٹانے کی دقت سے نہیں گزرنا پڑتا
لکھائی کو پڑھنے میں بھی
مشکل پیش نہیں آتی

اگرچہ یوں
مختلف لوگ
اسے مختلف انداز سے پڑھیں گے
ممکن ہے
وہ معنی و مفہوم بھی الگ الگ نکالیں
لیکن یہ امکان تو
کسی بھی تحریر کو پڑھنے میں
بہر حال رہتا ہی ہے

اسی طرح
آپ اس بات کے پابند بھی نہیں
کہ آپ
لکھ کس زبان میں رہے ہیں
ویسے میں جس زبان میں لکھتا ہوں
وہ میری اپنی ایجاد کردہ ہے
اور اس کے قواعد اور اصول بھی
میرے اپنے بنائے ہوئے ہیں

مجھے آج تک

Scanned with CamScanner

ایک صفحہ بھی ایسا نہیں ملا
جس پر کچھ لکھا ہوا نہ ہو
اصل میں
میرا تجزیہ تو یہ ہے
کہ کاغذ پر
کسی بھی روشنائی کا استعمال
لکھنے کے لیے نہیں
بلکہ لکھے ہوے کو
مٹانے کے لیے کیا جاتا ہے
یوں
دنیا کی ساری کتابیں
ہمیں کوئی علم نہیں دیتیں
بلکہ علم کے ماخذات پر
پردہ ڈالتی ہیں

صاف اور بے داغ کاغذ
صاف اور بے داغ تحریر ہے
جو کتاب ابھی منصۂ ظہور پر نہیں آئی
اسے
اس کے عدم میں پڑھ کر دیکھیے

Scanned with CamScanner

کھوٹے سکے کی کوند

مجھے کھوٹے سکے جمع کرنے کا شوق ہے
یہاں میری مراد
تاریخی اہمیت کے حامل سکوں سے نہیں
جو کمیاب اور گراں قدر ہوتے ہیں
میں ان سکوں کو جمع کرتا ہوں
جنھیں کوئی قبول نہیں کرتا
یا جن سے کوئی چیز خریدی نہیں جاسکتی
جن کے بیچ کیل سے سوراخ کر کے
انھیں ایک سلاخ میں پرو کر
بجایا جاسکے
میرے نزدیک یہ سکے بہت اہمیت کے حامل ہیں
کیونکہ یہ خراب اور بدنما
ٹوٹے پھوٹے اور گھسے ہوئے ہونے کے باوجود
ہوتے اصلی سکے ہی ہیں
انھیں اپنے بھٹی میں پگھلا لیے جانے پر بھی اعتراض نہیں ہوتا

یہ کھوٹے اور معمولی سکے
میرے لیے بڑے کارآمد ہیں
سب سے بڑی بات تو یہ ہے
کہ تاریخی اہمیت کے حامل سکوں کے برعکس

Scanned with CamScanner

ان کی حفاظت کے سخت انتظامات کی بھی ضرورت نہیں ہوتی
انھیں سڑک پر گرا دیں
تو کوئی بھکاری بھی نہیں اٹھائے گا
لیکن میں انھیں اٹھانے کے لیے
کسی بھی دشوار
اور کھڑی چٹان پر چڑھ سکتا ہوں

میوزیم میں شیشے کے بند شوکیسوں میں
نرم مخمل پر سجائے ہوئے سکے
سردی اور نمو پیے کے اثر میں رہتے ہیں
جب کہ دھوپ بارش، گرمی سردی میں
کھلے آسمان تلے پڑے ہوئے ان سکوں پر جا بجا خراشیں آ جاتی ہیں
اس وجہ سے ان میں
حرارت اور زندگی کی
اک کوند بھری رہتی ہے

سب کی ٹھوکروں میں آ کر
جب یہ سڑک پر
دور تلک لڑھکتے ہیں
تو ایک چنگاری پیدا کرتے ہیں
اور دم دار ستارے کی طرح
تارکول پر لکیر ڈالتے چلے جاتے ہیں
اس وقت ان کا اوپری میل

ڈھل جاتا ہے
اور اندر کی یہ کوند
اپنی جھلک دکھاتی ہے
میں اسی لمحے کے انتظار میں ہوتا ہوں
اور اس کوند کو
اپنے بدن میں سمیٹ لیتا ہوں

میرے جسم میں اتر کر
یہ کوند شانت ہو جاتی ہے
اور میرے عضلات میں
شریانوں کے خون میں
پٹھوں اور جوڑوں میں جا کر سو جاتی ہے

لیکن کبھی کبھی
جب میرا جسم
کسی اندرونی خلفشار
یا باہر کے ناموافق حالات کے زیر اثر
حرارت پکڑنے لگتا ہے
اور اس میں
چنگاریاں پیدا ہونے لگتی ہیں
یہ کوند میری آواز میں
اور میری خاموشی میں
میرے رنگ اور شبد میں ڈھل کر

Scanned with CamScanner

سامنے آتی ہے

اور کاغذ پر لکیر ڈالتی ہوئی گزرتی ہے
کاغذ پر پڑی ہوئی لکیر کو چھو کر دیکھیں
آپ یہ دیکھ کر حیران رہ جائیں گے
یہ کس سرعت کے ساتھ
آپ کے بدن میں اترنے لگتی ہے

بھوک

میں اپنے بھیڑیوں کو ڈھونڈنے نکلا ہوں
وہ سامنے کے جنگل میں
کہیں روپوش ہو گئے ہیں
شاید وہ مجھے دانستہ پریشان کر رہے ہیں

اب وہ خاصے بڑے ہو گئے ہیں
میرے خون کے چند گھونٹ
ان کی پرورش کو ناکافی ہیں
انھیں گوشت کی وافر مقدار درکار ہے
انھیں اپنے جبڑوں کی قوت آزمانے کے لیے
مضبوط پٹھے اور ہڈیاں چاہییں

Scanned with CamScanner

انھیں ایک جیتا جاگتا جانور چاہیے
جسے وہ چیر پھاڑ سکیں

میں اپنے بھیڑیوں کے بغیر نہیں رہ سکتا
میں انھیں اپنا خون نہ پلاؤں
تو میری شریانوں میں خون کا دباؤ
ناقابلِ برداشت حد تک بڑھ جاتا ہے
بھیڑیوں کو اپنا خون چٹا کر
میں تسکین محسوس کرتا ہوں

لیکن میرے بھیڑیے
اب میرے خون پر مطمئن نہیں
ان کی بڑھتی بھوک کے پیش نظر
اب میں اپنے آپ کو بھنبھوڑنے کے لیے
ان کے آگے پیش کروں گا
تاکہ وہ مجھ سے دور نہ جائیں
اگر یوں بھی ان کی بھوک نہیں مٹی
تو میں انھیں
اس اژدہے کی حکایت سناؤں گا
جس نے اپنی بڑھتی ہوئی بھوک سے مجبور ہو کر
اپنے آپ کو دُم کی طرف سے نگلنا شروع کر دیا تھا
اور جب وہ خود کو نگلتا ہوا
اپنے سر تک پہنچا

Scanned with CamScanner

تواس کی بھوک
گھبرا کراس کے بدن سے باہر نکل آئی
اوراس کے سامنے آکھڑی ہوئی
جیسے میرے بھیڑیے
میرے بدن سے نکل کر
ایک دن میرے سامنے آکھڑے ہوئے تھے

خطِ تنسیخ

جو بات ہم لکھ کر کاٹ دیتے ہیں
وہ ہمارے تنسیخی خط کے نیچے دبی
دیر تک اپنی بقا کے لیے
لڑتی رہتی ہے

ہمارا تنسیخی خط
ایک وزنی سل کی طرح
ہماری عبارت کے سینے پر دھرارہ جاتا ہے

تنسیخی خط کھینچتے ہوئے
گویا ہم یہ کہہ کر آگے بڑھ جاتے ہیں

Scanned with CamScanner

کہ ہمیں تمھاری ضرورت نہیں

منسوخ عبارت لمبے لمبے سانس لیتی ہے
اور اپنے سینے پر دھری سل کو
پرے دھکیل دینا چاہتی ہے
بار بار ناکامی کے بعد
وہ اس بوجھ تلے
کس مشکل سے جان دیتی ہے
اس کا ہمیں اندازہ نہیں
لیکن بعض صورتوں میں
یہ اس جان لیوا بوجھ تلے بھی
ایک طویل عرصے تک جینا سیکھ لیتی ہے

بہت سی منسوخ عبارتیں
فاصلے فاصلے سے
اپنی بقا کی جنگ میں مصروف ہیں
یہ سب اکٹھا ہونا چاہتی ہیں
انھیں ایک مکمل جسم درکار ہے
ایک مکمل جسم
تاکہ وہ
اپنے اوپر سے یہ تنسیخی بوجھ ہٹا سکیں

اگر یہ بوجھ ہٹ جائے

Scanned with CamScanner

تو ایک طرح سے
خود ہم پر
خطِ تنسیخ نہیں پھر جائے گا؟

تشنگیِ نقش گر

جس برتن میں میں پانی پیتا ہوں
جب یہ پانی سے لبالب بھرا ہو
اور میرے ہونٹوں سے لگا ہو
تو اس میں مجھے بہت سے چہرے نظر آتے ہیں
یہ کسی قسم کے آسیب نہیں ہیں
یہ ایک جانی پہچانی بستی کے
جانے پہچانے چہرے ہوتے ہیں
ہم سب ایک ساتھ
پانی کے اس برتن سے
ایک دوسرے سے آنکھیں ملائے بنا
منھ لگا کر پانی پینے لگتے ہیں
لیکن ہمارے ہونٹ تک تر نہیں ہو پاتے
پانی کے برتن میں ریت بھری ہوتی ہے

میں آسمان کی طرف دیکھتا ہوں

وہاں بھی مجھے
ایک بڑا سا کٹورا نظر آتا ہے
جس میں کچھ ابر پارے ہیں
میں اپنے خالی برتن کو دیکھتا ہوں
جہاں مجھے ریت کے ٹیلوں کے درمیان
پیاسوں کی ایک نسل بھٹکتی نظر آتی ہے
میں اپنا کٹورا زمین پر گرا دیتا ہوں
کٹورے کے ہاتھ سے گرتے ہی
لاتعداد ننھی منی پیاسیں بکھر جاتی ہیں
ہر پیاس کے ساتھ
ریت سے بھرا ایک کٹورا ہے

آپ اپنے کٹورے میں
ریت کے ٹیلوں پر چلتے
کچھ شناسا چہروں کے درمیان
مجھے بہ آسانی شناخت کر سکتے ہیں

توہم کا کارخانہ

میری بینائی جاتی رہی ہے
یہ سب کچھ کسی حادثے کے نتیجے میں نہیں ہوا

Scanned with CamScanner

بلکہ بتدریج
میں اپنی بینائی سے
دست بردار ہو گیا ہوں

بینائی کے بعد
گویائی اور سماعت ہے
پھر
چھونے اور محسوس کرنے کی دیگر حسیں
میں آہستہ آہستہ
ان تمام حسوں سے
دست بردار ہو جاؤں گا
ایک دم تو ایسا کرنے کا
میں متحمل نہیں ہو سکتا

ابھی میری محض بینائی گئی ہے
ڈرتے ڈرتے
میں نے ایک بے رنگ دنیا میں
آنکھیں کھولی ہیں
سفید چھڑی ہاتھ میں تھامی ہے
اور اس کے ذریعے
اپنے اگلے قدم کے لیے
جگہ کا جائزہ لینے لگا ہوں

Scanned with CamScanner

میں نے اپنی آنکھیں
عطیہ کی ہیں
اور نہ ہی میں نے انھیں تلف کیا ہے
بس دھیرے دھیرے
جو آنکھوں نے دکھایا
اس پر یقین کرنا چھوڑ دیا ہے
یا یہ کہہ لیجیے
ان کی طرف سے
پوری طرح سے منھ موڑ لیا ہے
میرا تجربہ ہے
ایسا کرنے سے
چند ہی دنوں میں
آنکھوں کی چمک زائل ہو جاتی ہے
اور مہینے دو مہینے میں
بصارت مکمل طور پر ختم ہو جاتی ہے

جب سے میں بینائی سے دست بردار ہوا ہوں
مجھے اپنے گرد و پیش میں منھ پھاڑے
ایسے خطرات نظر آنے لگے ہیں
جو میں اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتا تھا
یہ سفید چھڑی تو بس دل کی تسلی کے لیے ہے
ایسا لگتا ہے
جیسے میں نے

Scanned with CamScanner

پہلے پہل دیکھنا شروع کیا ہے
اب میں اپنے آگے پیچھے
دائیں بائیں
دور و نزدیک
اندھیرے اجالے، سب میں
یکساں طور پر دیکھ لیتا ہوں
لیکن جلووں کے اس ازدحام میں
میری دوسری حسیں
مجھے دو قدم بھی ٹھیک سے چلنے نہیں دیتیں
یہ تمام حسیں
میری دیکھنے کی اس نئی حس سے
مستقل متصادم رہتی ہیں
اس کے باوجود
اگر آپ مجھے چلتا ہوا دیکھ لیں
تو آپ کو اپنی آنکھوں پر یقین نہ آئے
میں زمین پر چلتا ہی کب ہوں
میرے تلوے زمین کو چھوتے تک نہیں
کبھی خوشبو اور کبھی رنگ پر قدم جماتا
بنا کسی چیز کو ضرر پہنچائے
یا اسے اپنی جگہ سے بے جگہ کیے
دیکھیے تو کس سہولت کے ساتھ
میں آپ کی طرف بڑھ رہا ہوں
آپ کا ہاتھ تھامنے کے لیے

Scanned with CamScanner

کہیں آپ
اس نادیدہ چٹان سے نہ ٹکرا جائیں
جو سڑک کے بیچوں بیچ
راتوں رات ابھر آئی ہے

نظم

میں اس لمحے میں
بری طرح الجھ گیا
جب کہ تمھارا خودکار خواب
اپنی تکمیل کے مرحلے طے کرتا رہا

وہ لمحہ مجھے سمیٹ سمٹ کر
ایک صدف میں اتر گیا
اور وہ صدف
سمندر کی پاتال میں بیٹھ گئی

میری طویل نیند تب ٹوٹی
جب ایک دن سمندر کی ایک لہر نے
مجھے ساحل پر اچھال دیا
اور میں ٹھوکریں کھاتا ہوا

Scanned with CamScanner

کسی طرح
تمھاری ہتھیلی تک پہنچ گیا
تمھارے خودکار خواب نے
تمھارے وجود سے
میرا ہر نقش مٹا ڈالا تھا
سو تمھاری آنکھوں میں
میرے لیے
پہچان کا ہلکا سا شائبہ تک نہ تھا
جو میری سرد اور چمکیلی سطح کو چھُو کر
مجھے اس قید سے آزاد کر سکتی تھی
اور آن کی آن میں
مجھے ایک آبدار موتی سے
ایک گرم و گداز آنسو میں تبدیل کر سکتی تھی
جو تمھاری گلابی ہتھیلی پر
کچھ دیر کے لیے اتراتا
اور تمھارے بدن کی پُر حرارت آسائش میں
چند سانسیں لے کر
فنا ہو جاتا

رائیگاں ریاضت

''مجھے اپنے آپ سے نفرت ہو گئی ہے''

یہ جملہ
میں دن بھر میں
کوئی سات سو بار لکھتا ہوں
چار ہزار مرتبہ
زبانی ادا کرتا ہوں

کہتے ہیں آدمی
کسی بھی کام میں جاں کاہی دکھائے
تو جوہرِ قابل بن سکتا ہے
اتنی مشق کے بعد
اب میں اعتماد سے
اتنا تو کہہ سکتا ہوں
کہ مجھے اس فقرے کی ادائیگی
اور اسے ضبطِ تحریر میں لانے میں
اتنا ملکہ ضرور حاصل ہو گیا ہے
کہ میں یہ فقرہ
مختلف طریقوں سے لکھ کر
یا زبان سے ادا کر کے
اس میں
لاتعداد معنی پیدا کر سکتا ہوں
اور اپنا مافی الضمیر
مکمل طور پر
صرف اس ایک فقرے میں

Scanned with CamScanner

بیان کر سکتا ہوں

مجھے ٹھیک سے یاد نہیں
کہ میری خود سے نفرت کی
کبھی کوئی حقیقی وجہ بھی رہی ہوگی
لیکن
اب تو یہ محض مشق رہ گئی ہے
اور یہ ساری مشق
اسی ایک فقرے تک محدود ہے
یہی میرا کل سرمایۂ الفاظ ہے
اپنی عمر کے باون سالوں میں
ایک موقع بھی ایسا نہیں آیا
کہ میں نے کبھی
اپنی بات دوسروں تک پہنچانے میں
ناکامی محسوس کی ہو
یا مجھے اس ہشت لفظی سرمائے سے
تجاوز کرنے کی ضرورت کبھی محسوس ہوئی ہو
ایک لڑکی کو
محبت کے اظہار کے طور پر
اپنا کان کاٹ کر پیش کرتے ہوئے بھی نہیں
اس وقت بھی نہیں
جب اس کا جسم
میرے واسطے کھنچ کر کمان ہو گیا تھا

Scanned with CamScanner

اور میں چلے میں تیر چڑھا کر
شست لینے کو تھا

لیکن اس وقت
جب اس نے سرشاری کے عالم میں
مجھ سے ''محبت'' کا لفظ ادا کرنے کو کہا
اور میں ہزار کوشش کے باوجود
اس لفظ کو ٹھیک سے ادا کرنے میں ناکام رہا
اور اس کی نظروں سے
ہمیشہ ہمیشہ کے لیے گر گیا
اس وقت واقعی مجھے
اپنے آپ سے
پہلی بار حقیقی نفرت کا تجربہ ہوا
لیکن یہ فقرہ
میرے حلق میں اٹک کر رہ گیا
اور میں پہلی بار اپنی کیفیت
اس لڑکی کے سامنے
بیان نہیں کر سکا

بعد میں اگرچہ یہ فقرہ
لکھنے یا بیان کرنے میں
مجھے کبھی دقت محسوس نہیں ہوئی
لیکن اب

میرے منھ سے یہ لفظ سن کر
یا میرے ہاتھ سے لکھا دیکھ کر
لوگ بیگانگی اور لاتعلقی سے
میرا منھ تکتے رہ جاتے ہیں
جیسے میں نے کوئی
مہمل بات کہہ دی ہو

آنسو

ستارے کیسے بنے ہوں گے؟
یا آسمان؟
خلا یا سمندر؟
ان سب چیزوں کے بارے میں
ہمارے تمام قیاسات
ایک مستقل بے بسی پر ختم ہوتے ہیں

ہمارے لیے یہی کافی ہے
کہ ہم اس ننھے سے عمل کا مشاہدہ کریں
جسے ہم آنسو کا بننا کہتے ہیں
اس کے محرکات
اور کیمیائی ماخذات کا سراغ لگانا

ایک جو کھم ہے

یہ اول اول
اس وقت اپنا پتا دیتا ہے
جب یہ دل پر پڑی ہوئی لکیر میں
درز بنا کر کسی بھی رخ بہنے لگتا ہے
ایک کامل قطرہ بننے سے پہلے
شاید یہ گھٹی گھٹی سی ایک سانس ہوتا ہے
اور پھر یہ سانس بھیج جاتی ہوگی
اور جب اس کا نم جڑ پکڑ جاتا ہوگا
تو یہ اپنے نوزائیدہ وجود کے لیے
کسی وا آغوش کی تلاش میں
نکل کھڑا ہوتا ہوگا

ہمارے جسم کے پیچیدہ نظاموں میں
یہ کیسے ٹھوکریں کھاتا ہوگا
یہ جہاں رکتا ہوگا
وہاں ایک زخم ڈال دیے جانے کے
خطرے کے پیش نظر
اسے کہیں اقامت کی اجازت نہیں ملتی ہوگی
اس طرح یہ
پلکوں سے باہر گرا دیا جاتا ہوگا
پلکوں سے گرنے کے بعد

کسی آنسو کا کھوج لگانا آسان نہیں
یہ ریت میں جذب ہو کر فنا بھی ہو سکتا ہے
یا روشنائی بن کر
لکیر بناتا ہوا
ایک دل تک دوبارہ پہنچ سکتا ہے
جہاں اسے
ایک نازک سی لکیر بنا کر
از سرِ نو
تخلیق کے مرحلے سے گزرنا ہے

ریشم کا کیڑا

ایک بہت بڑا ریشم کا تھان
تمھارے پیروں میں پڑا ہے
تمھارے پاؤں کی گلابی انگلیاں
ریشم کے دھاگوں میں الجھ رہی ہیں
تم نے ریشم کے کیڑے کو
اپنے بدن کی خوشبو پر لگا دیا ہے
اب یہ رات دن شہتوت کے پتے چباتا ہے
اور اپنے منھ کے لعاب سے
تمھارے لیے ریشم تیار کرتا ہے

Scanned with CamScanner

ڈھیروں شہتوت کے پتوں کو
وہ چند گھنٹوں میں
ریشم کے لچھے میں تبدیل کر دیتا ہے

میرا خیال تھا
اگر شہتوت کے پتوں کی ترسیل روک دی جائے
تو یہ ریشم نہیں بنا پائے گا
لیکن شہتوت کے پتوں کے بغیر بھی
اس کیڑے کی کارکردگی میں ذرہ برابر فرق نہیں آیا
ریشم کے لچھے بنتے رہے
اور تمھاری گلابی انگلیوں میں الجھتے رہے
یوں ایک بہت بڑا ککون تیار ہو گیا
جب بھی اس ککون کو چیرا جائے گا
تو ریشم کے ایک بڑے ذخیرے میں
تمھاری گلابی انگلیوں کے بیچ میں
دبا ایک کیڑا ابھی نکلے گا
تمھاری گلابی انگلیوں سے جدا کر دیے جانے کے بعد
یہ کبھی ریشم نہیں بنا پائے گا
اور چند سانسیں لے کر
مر جائے گا

Scanned with CamScanner

ہم بہت خوش ہیں

ہم بہت خوش ہیں
اتنے خوش
کہ خوشی کے اظہار کے طور پر
ایک دوسرے کے قتل پر آمادہ ہو گئے ہیں

اس سے کم تر
کوئی ایسا طریقہ سرے سے ہے ہی نہیں
کہ ہم اپنی خوشی کا
بھرپور اظہار کر سکیں

خوشی کے اظہار کے فرسودہ طریقے
ہمارے لیے قابل قبول نہیں

ہم اپنی خوشی میں
ہر ایک کو شریک کرنا چاہتے ہیں
جو ہماری خوشیوں میں شریک ہے
وہی ہمارا اصل دوست ہے
لوگوں کو چاہیے
کہ وہ خوشی خوشی
خود کو قتل کے لیے پیش کریں

Scanned with CamScanner

بہت سے خون
اور بہت سی چیخوں کا مطلب آپ سمجھتے ہیں
ایک نا قابلِ بیان خوشی کا
نا قابلِ بیان اظہار
خواہ یہ اظہار دسترخوان پر کیا جائے
عبادت گاہ کی سیڑھیوں پر
یا عدالت کے دروازے پر

ایسے میں ایک آنسو تو کیا
کسی تشویش کو بھی
ایک برا شگون سمجھا جائے گا
ایسے میں کسی سوال کی گنجائش بھی نہیں
ہم سے یہ بھی نہ پوچھا جائے
کہ ہم اتنے خوش کیونکر ہیں

ہم بہت تھکے ہوئے ہیں
رات بھر خون بہانے کے بعد
اب ہم میں اتنی سکت بھی نہیں
کہ ہم اپنی گنتی بھی کر سکیں
یا یہی دیکھ سکیں
کہ رات کی اس مارا ماری میں
ہم نے اس خوشی کو تو ہلاک نہیں کر دیا

Scanned with CamScanner

جو ہمارے پہلو میں کٹی
لرز رہی تھی

عظیم ضیافت

ایک بہت ہی عظیم جشن ہے یہ
جانے کب اور کیسے اس کی موت واقع ہوئی ہے
کسی کو یاد نہیں
کب اور کیسے یہ زمین پر چلتا ہوگا
لیکن اس وقت تو کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی

سب اس بدن کو نوچ رہے ہیں
کچھ رکابی اور چھری لے کر
اس کے پہلو سے گوشت تراش رہے ہیں
کچھ ناخنوں اور دانتوں ہی سے کام نکال رہے ہیں
کچھ گلے کی شریانوں سے لہو کھینچ رہے ہیں

یہاں اس بڑی ضیافت میں
کسی کو جلدی نہیں
گوشت پوست اور خون کا یہ پہاڑ
ان سے ہفتے بھر ختم نہیں ہوگا

Scanned with CamScanner

انسانوں کے ساتھ جانور بھی ہیں
کسی کو کسی دوسرے پر تعرض نہیں ہے
سب کو اپنی اپنی پسند کے مطابق
اور طلب کے موافق دستیاب ہے

کھانے کے بعد لوگ
بڑے بڑے گوشت اور چربی کے پارچے کاندھے پر ڈالے
اپنے اپنے گھروں کو جا رہے ہیں
کچھ کھا پی کر وہیں اینڈ رہے
یا پڑ کر سو رہے
پھر اٹھے اور جٹ گئے

ہفتہ گزر گیا
پھر مہینہ گزر گیا
گوشت کا پہاڑ ختم ہونے پر نہیں آتا
پیٹوؤں کے پیٹ پھول گئے
گوشت کا پہاڑ ابھی چوتھائی بھی خرچ نہیں ہوا تھا
اسہال اور الٹیاں شروع ہو گئیں
سب دوڑے اسپتال کی طرف

گھروں میں گوشت کے ذخیروں میں کیڑے پڑ گئے
جہاں جہاں گوشت پہنچا
وہاں وہاں خوف بھی پہنچ گیا

Scanned with CamScanner

ہر طرف موت کے سائے بڑھنے لگے
دو قدم چلنے کی طاقت نہیں تھی کسی میں
بستی کو چھوڑ کر کیسے بھاگتے

لاتعداد تو اسی عظیم جثّے کے آس پاس مر رہے
کچھ رینگ رینگ کر اس ڈھیر سے دور ہو سکے
تو گلیوں اور چوراہوں پر موت کا انتظار کرنے لگے
جنھوں نے گھروں میں گوشت کے پارچوں کا ذخیرہ کر لیا تھا
انھیں گھر سے باہر نکلنے تک کی مہلت نہ مل سکی

گو موت اور قے کی کیچڑ سے پٹ گئی بستی

تب اس جثّے میں حرکت ہوئی
اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ کھڑا ہو گیا
تب جو ابھی تک مرنے سے بچے رہے تھے
انھوں نے اسے اپنے پورے قد کے ساتھ چلتے دیکھا

پہلے اس نے اپنے پہلو میں پڑے ہوؤں کو نوالہ بنایا
پھر وہ آگے بڑھا
اور ٹھوکروں سے ان کے گھروں کو توڑ توڑ کر انھیں باہر نکالا
اور انھیں سالم ہی نگل گیا
یوں اس نے سب گلیاں اور چوراہے صاف کیے
اب اس کا شکم سیر ہو چکا تھا

Scanned with CamScanner

شام تک اس کے زخم بھی بھر چکے تھے
رات کے آخری پہر تک وہ چلتا رہا
اپنے پیچھے گو، موت، قے، مکھیاں اور نحوست چھوڑ کر
پھر تھک کر
اگلی بستی کے سرے پر
وہ سانس روک کر پڑ گیا

فلیم آف دی فاریسٹ☆

جانے کیا بات ہے
میں کاغذ پر بے مقصد لکیریں کھینچتا ہوں
تو اس سے ابھرنے لگتے ہیں
کریہہ اور اذیت ناک نقوش
خالی تلوار چلاتا ہوں
ہوا میں خون کی بو پھیل جاتی ہے
اور کٹے پھٹے اعضا
میرے آس پاس گرنے لگتے ہیں

میں سہم جاتا ہوں

☆ Flame of the forest

Scanned with CamScanner

میرے سامنے ناچنے لگتے ہیں
خوفناک عفریت اور مہیب سائے

ایسے میں
مجھے ستارے کیوں یاد نہیں آتے ؟
ذہن پر زور دینے کے باوجود
میں پھولوں کے نام تک بھول جاتا ہوں
میں تمھیں بھی بھول جاتا ہوں، میری پیاری
میں ان راستوں کے نام تک بھول جاتا ہوں
جن کو تم نے
ایک رکے ہوئے وقت کے ساتھ
اس میوزیم میں قید کر دیا تھا
جس میں تمھارے نام کا زیر و بم
اور اس سے پھوٹنے والے
سو طرح کے رنگ
اور سُر محفوظ ہیں

تم مجھے اس درخت میں قید کر کے بھول گئیں
جسے بہت جلد کاٹا جانا تھا
جس کے گودے سے بنائے جانے تھے
ایک نفرت انگیز تاریخ کے ورق
اگر یہ درخت کٹ نہ گیا ہوتا
تو تم بہ آسانی

Scanned with CamScanner

مجھے اس درخت سے نکال سکتی تھیں
تاریخ سے تمھاری عدم دلچسپی کے بعد
اب اس بات کے امکانات معدوم ہو گئے ہیں

لیکن اگر تم
اگلے موسمِ بہار میں
اتفاق سے
پھولوں کی اس نمائش میں چلی جاؤ
جو شہر کی ایک قدیم عمارت میں لگنے والی ہے
جہاں ایک ہال میں ایک آتش دان کے اوپر
فلیم آف دی فاریسٹ رکھے جاتے ہیں
جو تمھارے بدن میں آگ بھر دیتے ہیں

اور اگر کوئی
اس آگ کو چومنے کی جسارت پر
اس آتش دان کے سامنے
مار دیا جائے
جیسا کہ دو صدی پہلے
ٹھیک اسی جگہ
ایک سورما کو مار دیا گیا تھا

اور اگر اس واقعے کے زیرِ اثر
تمھیں اس سورما کی زندگی

Scanned with CamScanner

یا اس کی موت کی تفصیلات سے
اچانک دلچسپی پیدا ہو جائے
اور تم اسی عمارت میں رکھے
اس شیلف تک پہنچ جاؤ
اور وہ کتاب نکال لو
اور کسی طرح تمہاری انگلیاں
اس کتاب کے صفحات کو چھو جائیں
جو اس پیڑ کے گودے سے بنائے گئے ہیں
جس میں تم مجھے قید کر کے بھول گئی تھیں

ممکن ہے اس کے باوجود بھی
تم مجھے اس پیڑ سے بازیاب نہ کر سکو
لیکن کم از کم
مجھے اس نفرت انگیز تاریخ سے تو رہا کر سکتی ہو
جس نے میرے وجود کو
خون کی بو
اور کریہہ نقوش کی شبیہوں سے بھر دیا ہے
اور میری یادداشت سے
فلیم آف دی فاریسٹ کا نام تک مٹا دیا ہے
جس کے پھول تمہارے بدن میں آگ بھر دیتے ہیں
اور جس کے تنے میں
تم نے مجھے قید کر دیا تھا

بدروحیں

جو مر رہا ہے
اسے مرنے دو
اور اگر کوئی
کسی ادھ موئے کو
ٹھوکریں بھی مار رہا ہے
تو مارنے دو
ٹھوکریں کھانے والا
چلاّتا کیوں نہیں؟
احتجاج کیوں نہیں کرتا؟
اگر وہ کمزور ہے
تو مدد کو پکارے
ورنہ پٹتا رہے
کیا ہوگا
لوگ جمع ہو جائیں گے
ایک ہاہاکار مچ جائے گی
لیکن اگر مارنے والا
ثابت قدم
اور مضبوط اعصاب کا مالک ہے
تو یہ بات یقینی ہے
کہ پٹنے والے کو بچانے کے لیے

کوئی آگے نہیں بڑھے گا

تو اہمیت کس بات کی ہوئی؟
ثابت قدمی کی؟
یا اعصاب کے مضبوط ہونے کی؟
قطعی نہیں، ذرا غور کیجیے
لوگوں کے ٹھٹ کے بیچ
پٹنے والا رو نہیں رہا
وہ تو ہنس رہا ہے
ان کی بے بسی پر
جو تماشا دیکھ رہے ہیں
تماشا ختم ہوا تو
یہ لوگ
اپنی اپنی روح کا بوجھ لیے
بدروحوں کی طرح
سڑکوں پر بھٹکتے رہیں گے

لکیریں

جب بھی میں کوئی تصویر بناتا ہوں
پہلے ایک سپاٹ سی لکیر کھینچ دیتا ہوں

Scanned with CamScanner

یکا یک اس لکیر میں ایک ارتعاش پیدا ہوتا ہے
جسے دبانے کے لیے
میں اسے نسبتاً زیادہ گہری لکیر میں پیوست کر دیتا ہوں
چند ثانیے تک
ان میں کسی قسم کی لرزش نہیں ہوتی
پھر دونوں لکیریں کپکپانے
اور بجنے لگتی ہیں
پھر میں کئی اور لکیروں سے ان کی بندش کرتا ہوں
یوں لکیر پر لکیر
بناتے بناتے
اچانک جھانکنے لگتی ہیں ان سے
بے خواب آنکھیں
لرزتے ہونٹ
کھنچے ہوے اعصاب والے چہرے
پھر کڑکڑاتے ہوے اٹھ بیٹھتے ہیں
صدیوں سے سوئے ہوے پیکر

میں ان سب سے بیزار ہوں
یہ ہر وقت کراہتے، بسورتے
یا بڑبڑاتے رہتے ہیں
انھیں مجھ سے طرح طرح کی شکایتیں ہیں
کسی کی ناک چہرے پر ترچھی جڑ گئی ہے
کسی کی دو ایک پسلی ادھوری رہ گئی ہے

کسی کی کمر
ایک مہرے کے غلط جڑ جانے سے
عیب دار ہو گئی ہے

یہ پیکر ہر وقت میرے آس پاس منڈلاتے ہیں
رفعِ حاجت کرتے ہیں
ہم جفت ہوتے ہیں
بعض اوقات
یہ ایک دوسرے کی جان کے درپے ہو جاتے ہیں

ادھر کئی دنوں سے
میں جوڑوں کے عارضے میں مبتلا ہوں
اور بلڈ پریشر کا شکار بھی رہنے لگا ہوں
اب تو یہ میرے کمرے سے نکلتے ہی نہیں
انھیں میری بیماری پر بڑی تشویش ہے
لے دے کے ان کا موضوع
میری بیماری رہ گیا ہے
آپ کہیں گے
میں نے انھیں کینوس تک محدود کیوں نہیں رکھا
یا یہ کینوس سے باہر کیسے آ گئے
میں نے انھیں کینوس پر ہی رکھا تھا
تب یہ بڑی لاچاری سے مجھے تکتے تھے
جیسے التجا کر رہے ہوں

Scanned with CamScanner

ہمیں اس فریم سے باہر نکالو

اب یہ بالکل آزاد ہیں
اور اپنے اپنے کینوس کی طرف
لوٹنے پر ہرگز تیار نہیں
مجھ سے تو اب یہ مایوس ہو چکے ہیں

مجھے سن گن ملی ہے
اب یہ اپنے اعضا کی معمولی ٹوٹ پھوٹ کی مرمت
خود کرنے لگے ہیں
کوئی سرکس میں کام کرنے لگا ہے
کسی نے بڑھئی کا کام سیکھ لیا ہے
تو کوئی شارٹ ہینڈ کی مشق کر رہا ہے

میرے جوڑوں کا عارضہ
اب بہت تکلیف دہ ہو گیا ہے
میرے اعضا اینٹھنے اور بل کھانے لگے ہیں
بلڈ پریشر نے میرے اعصاب کو بری طرح متاثر کیا ہے

اب وہ سر جوڑ کر بیٹھ گئے ہیں
اور ایک مضبوط فریم میں
مجھے فٹ کرنے کے
منصوبے بنا رہے ہیں

Scanned with CamScanner

عالم پناہ کا تابوت

اس سال شروع بہار میں
ہم نے قومی سطح پر جو فیصلے کیے تھے
ان کو عملی جامہ پہنانے میں
ہمیں اس قدر دیر نہ ہوتی
اگر ہم عالم پناہ کا تابوت بنانے کی ذمے داری
کسی مناسب شخص کے سپرد کرتے

ہمیں اعتراف ہے
کہ تابوت میں استعمال ہونے والی لکڑی
اور اسے اٹھانے کے قبضے
عالم پناہ کے شایانِ شان نہیں تھے

کاش ہم
ان کے تابوت کے عین اوپر
ان کی مینا کا پنجرہ رکھتے ہوئے
یہ دیکھ لیتے
کہ تابوت کی لکڑی
کرم خوردہ تو نہیں
یا ان کی مینا کے گلے میں پڑے ہوئے
ننھے زمردی ہار میں

Scanned with CamScanner

ایک ادنیٰ درجے کے پتھر کو
کس نے پرو دیا تھا

عالم پناہ کی آخری وصیت کو
جو روشنائی میں پوٹاشیم سائنائیڈ تحلیل کر کے لکھی گئی تھی
پڑھ کر سناتے ہوئے
جب ان کی بیوہ کا گلا رندھ گیا تھا
ایسے میں
شاہی دستور کے مطابق
مرحوم کی وصیت کو عرقِ گلاب میں دھو کر
ملکۂ عالیہ کے گلے میں ڈالا گیا
ٹھیک اسی وقت
جب ملکۂ عالیہ زمین پر گرنے والی تھیں
انھیں گرنے سے بچاتے ہوئے
ان کے دائیں بائیں دو زنگی سپاہیوں نے
اپنے ہاتھوں سے ننگی تلواریں نہیں چھوڑی تھیں

جب ایک ساتھ دو تلواریں
ملکۂ عالیہ کے دونوں پہلوؤں کو چیر کر
ٹھیک اس مقام پر متصل ہو گئیں
جہاں پوٹاشیم سائنائیڈ نے بڑی سرعت کے ساتھ اپنا اثر دکھایا تھا
تو اس بھگدڑ میں
عالم پناہ کے تابوت کے قبضوں کے جوڑ

اپنی جگہ چھوڑ گئے تھے
اور تابوت لے جانے والی گاڑی کے پہیے ٹوٹ جانے کے ساتھ ہی
بگھی کے برق رفتار گھوڑے
شاہی عملداروں کو روندتے ہوئے
اتفاقاً
اس طرف نکل گئے تھے
جہاں عالم پناہ سے منحرف سپاہیوں کا دستہ
اس نوجوان کی تدفین سے ابھی فارغ ہی ہوا تھا
جس نے عالم پناہ کی تدفین کے انتظامات
اپنے ذمے لیے تھے

عالم پناہ کی لاش کو
تابوت سے گرنے کے بعد کیسے دفنایا گیا
عالم پناہ کی مینا
(جو اس شخص کو دی جانی تھی
جسے عالم پناہ کی تدفین کا کام سونپا گیا تھا)
کس کو ملی
اس بارے میں کسی کو کچھ معلوم نہیں
البتہ شروع بہار میں
قومی سطح پر کیے گئے فیصلوں پر
بعد میں اقتدار پر قبضہ کرنے والوں نے
ذمے داری کے ساتھ عمل درآمد کر کے دکھایا

Scanned with CamScanner

نظم

یہ میں نہیں ہوں
کوئی اور ہے
لیکن یہ خنجر جس ہاتھ میں ہے
وہ میرے بدن سے جڑا ہے
لیکن یہ میرا ہاتھ ہے نہیں
میرا اپنا ہاتھ تو
خود کو بچانے میں زخمی ہو گیا

خنجر میری پسلی میں اتر گیا ہے
پر یہ چیخ میری نہیں
کسی اور کی ہے
لیکن دوڑ میں پڑا ہوں
اسٹریچر لے کر
یہ کون کھڑا آنسو بہا رہا ہے
یہ کوئی بھی ہو، لیکن ان آنکھوں میں آنسو میرے ہیں
یہ زخم میرا ہے
لیکن اس میں درد کسی اور کا ہے
کس کی موت کی خبر ہے
جو میرے سرہانے سنائی جا رہی ہے؟

Scanned with CamScanner

بحیرۂ عرب کے پانیوں میں عکس

بحیرۂ عرب کے کنارے
ہمارا شہر
اپنے سرنگوں پرچموں سے
آپ کا استقبال کرتا ہے
دوسو جبری مزدوروں کو
ہم نے بندرگاہ پر پہنچادیا ہے
تا کہ آپ کا سامان
اسلحہ اور گولہ بارود
جہاز سے اتاریں
اور شراب کے پیپے

اگر کسی کی غفلت سے
شراب کے کسی پیپے کے پیندے میں
سوراخ پیدا ہو گیا
تو یہ سارے جبری مزدور، جو بدیسی شراب کے بڑے حریص ہیں،
جہاز کے عرشے کو
اپنی سرخ زبانوں سے چاٹ جائیں گے

ہمارے جبری مزدوروں کی آنکھیں
اور سرخ زبانیں دیکھ کر

Scanned with CamScanner

غیر ملکی جہاز راں
ہماری بندرگاہوں کا رخ کرنے سے کتراتے ہیں

لیکن ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں
یہ جبری مزدور بڑے بے ضرر ہیں
آپ چاہیں تو ان کی عورتوں کے ساتھ
آپ کی شب باشی کا بندوبست بھی کیا جا سکتا ہے
لیکن پہلے آپ کے سامان
خصوصاً اسلحہ اور گولہ بارود
کی نگرانی اور تحفظ کا تسلی بخش انتظام ہو جائے
اسلحہ اور گولہ بارود کی بو
ان جبری مزدوروں کی عورتوں کی شہوت کو
منھ زور کر دیتی ہے
ان کے بدن کی تپش سے
بندرگاہ پر کھڑے جہاز جل سکتے ہیں
جن کا عکس
بحیرۂ عرب کے پانیوں میں
دیکھا جا سکتا ہے

Scanned with CamScanner

گھاؤ

کچھ چیزیں نہیں ہیں
لیکن ان کے ہونے کے
پورے پورے شواہد موجود ہیں

جب کہ کچھ چیزیں موجود ہیں
ان کے شواہد بھی موجود ہیں
لیکن ان شواہد کو
کھوجنے والا کوئی نہیں

ہمیں ڈر ہے
ہماری تلاش بھی
ہمیں کسی ایسی صورتِ حال سے
دوچار نہ کردے
کہ ہمیں
خود اپنی نفی کرنی پڑے

دیکھو بچہ اسکول جا رہا ہے
اس کے ہاتھ میں بستہ ہے
بستے میں کتابیں بھری ہیں
کتابوں میں جہالت بھری ہوئی ہے

Scanned with CamScanner

بچہ کتابوں کو کوڑے دان میں ڈال دے گا
اور گھر کی طرف چل پڑے گا
لیکن اس کا گھر اب وہاں نہیں ہے
جہاں وہ اسے چھوڑ گیا تھا

بچہ رو رہا ہے
آؤ اس کے ساتھ ہم بھی روئیں
اپنے بستے کو
اپنے گھر کو

بچے کو اسکول کا راستہ کس نے بتایا؟
بچے کے ہاتھ میں کتابیں کس نے دیں؟
کس نے اس معصوم بچے کے ہاتھ میں کتابیں دیں؟
بچے کے ہاتھ میں چاقو کیوں نہیں تھمایا؟
اس کے بستے میں حشیش کیوں نہیں بھر دی؟
اسے جھوٹ بولنا
اور جیب کاٹنا کیوں نہیں سکھایا؟
اسے بتانا چاہیے تھا
''تم نالی کے کیڑے ہو،
حرام کے جنے!''
اسے سکھانا چاہیے تھا
بے حیائی سے کھڑے کھڑے موتنا
بچہ کچرے کو کھدیڑ رہا ہے

شاید وہ اپنی ماں کو کھوج رہا ہے
کیا اسے اس کچرے میں اس کی ماں مل جائے گی؟

جب بچہ کچرے کو کھدیڑ رہا ہو
تو ہمیں احتراماً
خاموشی اختیار کرنی چاہیے
خواہ ہمیں پختہ یقین ہو
کہ اسے اس کی ماں کچرے میں نہیں ملے گی
لیکن اس تلاش میں
وہ زمین میں اتنا بڑا گھاؤ ڈال سکتا ہے
جسے ساری انسانیت پُر نہیں کر سکے گی

مونالیزا

فرانس جانے سے پہلے
میں بہت محبت کرتا تھا
لیونارڈو داونچی کی مونالیزا سے
لیکن جب میں
پیرس کے لوور میوزیم میں
مونالیزا کی تصویر کے سامنے کھڑا ہوا
تو غصے کے مارے میں کانپنے لگا

Scanned with CamScanner

اگر داونچی میرے سامنے ہوتا تو میں اسے قتل کر دیتا
مونالیزا مسکرا نہیں رہی تھی
رو رہی تھی
داونچی نے اس سچ کو چھپانے کے لیے
اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ چپکا دی تھی

کئی صدیاں گزرنے کے بعد بھی
کوئی محقق یا آرٹ کا نقاد
اس تصویر کے چہرے سے
اس مسکراہٹ کو ہٹا نہیں سکا
داونچی نے محض اتنا نہیں کیا
اس نے برش کے ایک جھک اسٹروک کے نیچے
اس کی آنکھ سے نکلے ہوئے آنسو کو بھی
دفن کر دیا تھا

شاید اس مسکراہٹ کے نیچے
مونالیزا کے کپکپاتے ہونٹ میں بھی نہ دیکھ پاتا
میں ایک معصوم لڑکے کا شکر گذار ہوں
جس نے ایک گستاخانہ جرأت دکھائی
اور صدیوں سے چپکی اس مسکراہٹ کو
نوچ کر پھینک دیا

Scanned with CamScanner

میں بھی مونالیزا کے کپکپاتے ہونٹوں کی
ایک جھلک ہی دیکھ سکا ہوں
کیونکہ دوسرے لمحے ہی
مونالیزا نے تصویر سے باہر آ کر
فرش پر پڑی مسکراہٹ
پھر سے اپنے ہونٹوں پر چپکا لی تھی

مونالیزا اور وہ لڑکا ابدیت پا چکے ہیں
وہ ہمیشہ زندہ رہیں گے
مونالیزا کو مسکراتا دیکھنے والے
مرتے جائیں گے

سفید کاغذ

میں ایک سفید کاغذ ہوں
اور ہمیشہ سفید رہتا ہوں
آپ اس پر کچھ بھی لکھیں
مٹ جائے گا
کیسی ہی شبیہیں کھینچیں
وہ زیادہ دیر
میری سفید سطح پر نہیں ٹھہر سکیں گی

Scanned with CamScanner

یہ آپ کیا بنا رہے ہیں؟
فوجی جرنیل
ہتھیار بند، چاق و چوبند اور چوکس
جرنیل دانت پیس رہا ہے
جرنیل پھنکارتا ہے تو اس کی وردی سے دھول
اٹھ اٹھ کر
دوبارہ وردی پر جمنے لگتی ہے

جرنیل دوسرے اعلی افسروں میں اپنے آپ کو چھپا لیتا ہے
یہ تصویری امیج ایک کیک سے مشابہ ہے
اسے ایک چھری کی مدد سے کاٹ کر
قومی نسیان کا دن منایا جا سکتا ہے

لیکن جلد ہی جرنیل اپنے پوز سے اکتا جائے گا
اس کی اکڑی گردن ڈھیلی پڑ جائے گی
اور یہ گھٹنوں کے بل چلتا ہوا
کاغذ کے ایک کونے میں سمٹ کر بیٹھ جائے گا

یہ کون ہے؟
یہ ملّا ہے
اس کے چہرے پر فرشتوں جیسی تقدیس ہے
ابھی یہ کچھ کہنے کے لیے منہ کھولے گا

تواس کی زبان
کارپٹ کی طرح کھلتی چلی جائے گی
کئی طرح کی لذتیں کلبلا رہی ہیں اس زبان میں
مرگ ونحوست کی ایک تہذیب اس پر مارچ کرتی ہے

یہ کون صاحب ہیں
سر پر سفید وگ لگائے ہوئے؟
ان کے ہاتھ میں لکڑی کی ہتھوڑی ہے
یہ اس ہتھوڑی سے
زمین کو ٹھونک بجا کر دیکھیں گے
پھر گھٹنوں کے بل چلتے ہوئے
زمین سے کان لگا کر کچھ سنیں گے
ساتھ ہی ایک سفید کاغذ پر کچھ نوٹ کرتے جائیں گے
پھر ایک بہت ہی موٹی کتاب پر سیڑھی لگا کر
چڑھ جائیں گے
اور اسے کتر کتر کر نیچے پھینکیں گے

ایک خلقت ان ننھے ننھے کاغذی پرزوں پر ٹوٹ پڑے گی
جیسے یہ لاٹری کے ٹکٹ ہوں
پھر ایک بڑے میدان میں ان ٹکڑوں کو جوڑا جائے گا
لیکن کوئی ٹکڑا دوسرے سے نہیں جڑ پائے گا
لوگ جھنجلا جائیں گے
ہر سطر کٹی پھٹی

Scanned with CamScanner

اور ہر نقش نامکمل پاکر
مشتعل ہجوم
اس سفید کاغذ پر دوڑ لگائے گا
کاغذ پر موجود جرنیل اور ملّا کے نقوش
تھرّا اٹھیں گے
ملّا اپنی تسبیح نگل لے گا
جرنیل اپنی وردی اور جوتے چبا لے گا
پھر سب ایک دوسرے کے پیچھے دوڑنے لگیں گے
اور کاغذ خالی رہ جائے گا
بالکل سادہ اور سفید

نظم

میں زمین کو بچانا چاہتا ہوں
زمین کو کئی طرح کے خطرے ہیں
سب سے بڑا خطرہ آسمان ہے
مخدوش آسمان

میں زمین کو آسمان کے ٹھیک نیچے سے سرکانا چاہتا ہوں
زمین کو سمندر سے بھی خطرہ لاحق ہے
میں سمندر کو دور تک دھکیل دوں گا

Scanned with CamScanner

افق کے اُس پار
اور میری زمین ڈوبنے سے بچ جائے گی

زمین تیزی سے گھوم رہی ہے
مجھے ڈر ہے
ایک دن یہ ٹوٹ پھوٹ کر بکھر جائے گی
میں زمین کو گھومنے سے روک لوں گا
اس کام کے لیے میرے سامنے کئی ممکنہ تدبیریں ہیں
لیکن اس طرح تو دن اور رات کے عمل میں خلل پیدا ہو جائے گا
اس کے لیے مجھے ایک مصنوعی سورج بنانا ہوگا

لیکن جوں جوں میں زمین کو لاحق خطرات کے پہلوؤں پر سوچ رہا ہوں
میرے سامنے زمین کی تباہی کے لاتعداد گوشے سامنے آنے لگتے ہیں
میں ہمت ہارنے لگتا ہوں

زمین کو کسی طرح بچانا ممکن نہیں
زمین کو ٹوٹنے پھوٹنے کے لیے چھوڑ دیا جائے؟
گرنے دیا جائے اس پر آسمان؟
چڑھ دوڑنے دیا جائے اس پر سمندر؟
مٹا دیا جائے یہ خطرہ
جو انسان کی صورت میں اس پر ہمیشہ سے منڈلا رہا ہے
اس پر دوڑے چلا جا رہا ہے
ہاتھ میں دیا سلائی لے کر؟

Scanned with CamScanner

نظم

ایک تیر سنسناتا ہوا آتا ہے
اور میرے گھر کے دروازے پر بیٹھ جاتا ہے
گھوڑوں کے سموں کی قریب آتی آواز سے
میں سمجھ جاتا ہوں
وہ اسی طرف آ رہے ہیں
پھر وہ واقعی آن پہنچتے ہیں
آگ لگا دیتے ہیں شہر کو

وہ مجھے ڈھونڈ رہے ہیں
حالانکہ میں ان کے درمیان کھڑا تھا
بلکہ میں خود ان میں موجود تھا
میں نے ان میں شامل ہو کر
شہر کو جلایا تھا
لیکن وہ مجھے شناخت نہیں کر پا رہے ہیں
ان کی جھنجھلاہٹ بڑھتی جاتی ہے
سب کچھ برباد کرنے کے باوجود
میں اب تک ان کی پہنچ سے دور تھا
وہ تھک کر چور ہو گئے
ان کے بازو شل اور بدن نڈھال تھے

Scanned with CamScanner

وہ قابل رحم دکھائی دے رہے تھے

پھر وہ ایک جگہ جمع ہو گئے
اندھیرے میں ان کی آنکھیں مشعل کی طرح جل رہی تھیں
اور ان کی سانسیں ایک دوسرے کی سانسوں سے الجھ رہی تھیں
پھر وہ ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑے
اس بار ان کی تلواریں
زیادہ سرعت دکھا رہی تھیں

میں اپنے قدموں کے بیچ گڑے تیر کو اٹھا کر
اس طرف چل پڑتا ہوں
جس طرف میرے خیال میں
اب انھیں رخ کرنا ہے

رات

میں اس رات سے ڈرا ہوا ہوں
جو ہر دن کے پیچھے چھپی ہوتی ہے
اور دن کی روشنی میں یوں غائب ہو جاتی ہے
جیسے یہ ایک فرضی کہانی کا
فرضی کردار ہو
حالانکہ

Scanned with CamScanner

یہ میرے ناخنوں اور پلکوں کی جڑوں میں کہیں اتر جاتی ہے

میں اپنے دکھتے ناخنوں سے
اس رات کے ہونے کا سراغ پاتا ہوں
کئی ہفتوں، مہینوں بلکہ سالوں سے
رات میرے تعاقب میں ہے
یہ میرے ساتھ ساتھ چلتی ہے
ہر پتھر اور شجر پر
قدم جماتی ہے

ہر سانس کی ڈور سے بندھے ڈر کو
چھوتی گزرتی ہے

میں سورج کا سامنا نہیں کر سکتا
میں رات کا سامنا نہیں کر سکتا
میں دن کی روشنی میں
رات کا ہاتھ پکڑ کر
یہ نہیں کہہ سکتا
کہ اے رات، تو میرے موزوں میں اتر جا
اے رات، تو میرے قلم کی روشنائی کے ساتھ دوڑ جا
اے رات، مجھے میرے گرما گرم لہو کی پاتال میں
بوسہ دے
تا کہ میں ایک بار

تیرے خوف سے آزاد ہو کر
تجھے تیرے اندھیروں اور روشنیوں سے الگ کر کے
تیری ایک جھلک دیکھ سکوں

مزدوری

پانی سے بلبلے اٹھتے ہیں
ضرور کوئی ذی روح ہے
جو پاتال میں سانس لیتی ہے
جس کی آنکھیں مجھے دیکھتی ہیں
مجھے نہیں معلوم
یہ کوئی جل پری ہے
یا کوئی آبی آسیب

میں پلک نہیں جھپکوں گا
کہیں یہ مجھے اچک نہ لے
کشتی میں قدم نہیں رکھوں گا
کہیں یہ اس کے پیندے میں سوراخ نہ کر دے

میں بھاگ کھڑا ہوتا
اگر میرے پاؤں زمین پر جم نہ گئے ہوتے

Scanned with CamScanner

اب پانی ساکت ہو گیا ہے
شاید کوئی تہہ میں دم توڑ گیا ہے
یا مجھے دھوکا دینے کے لیے
اس نے سانس کھینچ لی ہے
میں پانی کی سطح سے نظر نہیں ہٹاتا
کوئی بھی چیز پانی کی سطح سے اوپر کو آ سکتی ہے

ارے یہ کیا؟
یہ بیج کیسے ہیں
جو پانی میں سانس لیتے ہیں؟
اب یہ کیسے پانی کی سطح پر آ کر تیرنے لگے ہیں؟
کیا پانی کی تہہ میں کوئی پیڑ بھی ہے؟
میں اس پیڑ کو دیکھنا
اور اس کے پتوں کو چھونا چاہتا ہوں

آپ بھی میری جگہ ہوتے
تو یہی کچھ آپ بھی چاہتے
لیکن آپ کی جیب میں بیج نہیں ہیں
آپ کے سامنے
وہ پانی بھی تو نہیں
جس کی پاتال میں
کوئی ذی روح آپ نے چھپا رکھی ہو

❁❁

Scanned with CamScanner

میلان کنڈیرا کی تحریروں کا ایک انتخاب 1987 میں ''آج: دوسری کتاب'' میں پیش کیا گیا تھا۔ اس کے بعد بھی چیک (اور اب فرانسیسی) زبان کے اس اہم ادیب کی تحریروں کے ترجمے ''آج'' کے مختلف شماروں میں جگہ پاتے رہے ہیں۔ اس بار کنڈیرا کے پہلے ناول ''مذاق'' (The Joke) کے ابتدائی تقریباً پچاس صفحات کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ ترجمہ سید کاشف رضا نے کیا ہے جو ایک جدید شاعر کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ کنڈیرا کا یہ ناول جس دور سے متعلق ہے وہ اب ماضی کا حصہ بن چکا ہے، لیکن اس ناول میں جن انفرادی اور اجتماعی انسانی رویوں کا مطالعہ کیا گیا ہے وہ مختلف صورتوں میں اب بھی ہمارے اردگرد موجود ہیں۔ امید ہے اس ناول کے باقی صفحات کا ترجمہ بھی آئندہ شماروں میں پیش کیا جا سکے گا۔

Scanned with CamScanner

میلان کنڈیرا

انگریزی سے ترجمہ: سیّد کاشف رضا

مذاق

حصہ اوّل: لُڈوِک

سو اب میں اپنے شہر میں تھا، اتنے برسوں بعد واپس آ کر۔ مرکزی چوک پر کھڑے ہوئے مجھے کسی قسم کا کوئی جذبہ محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ یہ چوک میں اپنے بچپن، لڑکپن اور جوانی میں کئی مرتبہ عبور کر چکا تھا۔ میں تو بس یہی سوچ پایا کہ یہ چپٹا قطعہ کسی بڑے سے پریڈ گراؤنڈ سے مشابہ لگتا ہے جہاں ٹاؤن ہال کا مدوّر مینار (جیسے کوئی قدیم خود پہنا ہوا سپاہی) چھتوں کے اوپر سے جھانکتا دکھائی دے رہا تھا، اور یہ کہ یہ موراویائی (Moravian) قصبہ جو مگیار اور ترک جارحین حملوں کے خلاف ایک مضبوط اڈا رہا تھا، اس کے ماضی نے اس کے چہرے پر ایسے ہیبت ناک نقوش ثبت کر دیے ہیں جنھیں مٹانا اب ممکن نہیں رہا۔

برسوں تلک اس جگہ میں میرے لیے کوئی کشش نہیں تھی؛ میں نے خود سے طے کر رکھا تھا کہ اب اس جگہ سے متعلق میرے کوئی محسوسات نہیں، اور یہ بات بہت فطری معلوم دیتی تھی: میں پندرہ برس یہاں سے باہر رہا تھا؛ اب یہاں میرا کوئی دوست یا شناسا نہیں رہا تھا (اور جو رہ گئے تھے میں ان سے اجتناب کا خواہش مند تھا)، اور میری ماں اجنبیوں کے درمیان ایک ایسی قبر میں مدفون تھی جس کی میں نے کبھی خبر گیری نہیں کی۔ لیکن میں خود کو دھوکا دیتا رہا تھا: جسے میں لاتعلقی قرار دیتا تھا وہ دراصل تنفر

Scanned with CamScanner

کا جذبہ تھا۔ معلوم نہیں اس جذبے کو کس شے نے انگیخت کیا، کیونکہ دیگر مقامات کی طرح یہاں بھی مجھے برے بھلے ہر دو قسم کے تجربات ہوئے تھے۔ مگر یہ جذبہ تھا موجود، اور یہی وہ چہل قدمی تھی جس کے دوران مجھے اس کا احساس ہوا۔ وہ مقصد جو مجھے یہاں کھینچ لایا تھا، پراگ میں بھی پورا ہو سکتا تھا اور اگر میں نے اچانک اس منصوبے پر یہیں عمل درآمد کرنے میں اتنی کشش محسوس کی تھی تو اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ پورا خیال اس قدر رنگی اور اس قدر رسطلے پن پر مبنی تھا کہ اس سے یہ شبہ ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ میں ماضی سے کسی احمقانہ جذباتی تعلق کے واسطے سے یہاں آیا ہوں۔

میں نے اس کریہہ المنظر چوک پر ایک آخری طنزیہ نگاہ ڈالی اور اس سے پیٹھ موڑ کر اس ہوٹل کو چل دیا جہاں میں نے شب بسری کے لیے ایک کمرہ بک کرا رکھا تھا۔ قلی نے مجھے ایک چوبی ناشپاتی میں لٹکی ہوئی کنجی تھمائی اور کہا، ''دوسری منزل۔'' کمرہ کچھ ایسا پُرکشش نہیں تھا۔ ایک دیوار کے ساتھ بستر لگا تھا۔ درمیان میں ایک چھوٹی سی میز اور کرسی تھی۔ بستر کے ساتھ مہاگنی کی ایک پُرتصنع الماری تھی جس میں آئینہ جڑا ہوا تھا اور دروازے کے قریب ایک واش بیسن جس میں ایک باریک سی دراڑ تھی۔

میں نے اپنا بریف کیس نیچے میز پر رکھا اور کھڑکی کھول دی۔ سامنے ایک صحن اور پاس پڑوس کی عمارتوں کی میلی پشتیں دکھائی دیتی تھیں۔ میں نے کھڑکی بند کی، پردے برابر کیے اور واش بیسن کی جانب چلا گیا جس میں دو ٹونٹیاں لگی تھیں — ایک نیلی اور دوسری سرخ؛ میں نے انھیں کھولا: دونوں میں سے ٹھنڈا پانی نکلنے لگا۔ میں نے میز کی جانب نگاہ دوڑائی جو اتنی بری نہیں تھی؛ کم از کم اس پر ایک بوتل اور دو گلاس رکھنے کی جگہ تو تھی؛ مشکل یہ تھی کہ اس سے صرف ایک آدمی مستفید ہو سکتا تھا کیونکہ کرسی وہاں ایک ہی تھی۔ میں میز کو بستر تک گھسیٹ کر لے گیا اور بستر پر بیٹھنے کی کوشش کی، لیکن بستر بہت نیچا اور میز بہت اونچی تھی۔ علاوہ ازیں، بستر میرے وزن سے اتنا نیچے بیٹھ گیا کہ مجھے فوراً اندازہ ہو گیا کہ یہ نہ صرف بیٹھنے کے لیے غیر اطمینان بخش ہے بلکہ بطور بستر بھی کام نہیں دے سکتا۔ میں اپنی مٹھیوں کے بل اس پر جھکا تو وہ اندر تک دھنستی چلی گئیں۔ میں نے اپنی ٹانگیں احتیاط سے بستر پر رکھیں تاکہ کمبل میلا نہ ہو جائے۔ بستر اس قدر دب گیا کہ مجھے محسوس ہوا جیسے میں کسی جھولن کھٹولے میں پڑا ہوں۔ اس پر کسی سے ہم بستری کا خیال ہی ناممکن تھا۔

میں کرسی پر بیٹھ گیا اور شفاف پردوں کو گھورتے ہوئے چیزوں کو اپنے دماغ میں الٹنے پلٹنے لگا۔

Scanned with CamScanner

اسی وقت راہداری سے کسی کی آواز اور قدموں کی چاپ کمرے میں در آئی۔ دو اشخاص — ایک مرد اور ایک عورت — باہم محوِ گفتگو تھے اور میں ان کا ایک ایک لفظ سمجھ پا رہا تھا؛ وہ ایک لڑکے پیتر سے متعلق بات کر رہے تھے جو بھاگ گیا تھا اور اس کی خالہ کلارا سے متعلق جو بالکل بے وقوف تھی اور جس نے لڑکے کو بگاڑ دیا تھا۔ پھر قفل میں ایک کنجی گھومی۔ ایک دروازہ کھلا اور ان آوازوں نے پڑوس کے کمرے میں گفتگو جاری رکھی؛ میں نے عورت کو آہیں بھرتے ہوئے سنا (جی ہاں، اس کی آہیں بھی قابلِ سماعت تھیں) اور مرد کو یہ اعلان کرتے ہوئے کہ وہ کلارا کو ایک بار مزہ چکھا کر رہے گا۔

جب تک کہ میں کھڑا ہوتا میرا فیصلہ محکم ہو چکا تھا؛ میں نے بیسن میں اپنے ہاتھ دھوئے، تولیے سے انھیں خشک کیا اور ہوٹل سے باہر نکل آیا، حالانکہ میرے ذہن میں یہ خیال واضح نہیں تھا کہ مجھے جانا کہاں ہے۔ میں بس اتنا جانتا تھا کہ اگر میں اپنے سفر (اس طویل اور مشقت طلب سفر) کی کامیابی کو خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا تو میرے پاس اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں کہ اپنے کسی مقامی شناسا سے ایک خاص کام کے لیے مدد مانگوں، ہرچند کہ مجھے یہ خیال نفرت انگیز لگتا تھا۔ میں نے اپنی نوعمری کے زمانے کے تمام پرانے چہروں کو کھنگالا اور ایک کے بعد ایک سب کو مسترد کرتا چلا گیا، چاہے اس کی وجہ یہی رہی ہو کہ کام کی رازدارانہ نوعیت کا تقاضا یہ ہوتا کہ مجھے غیر حاضری کے طویل برسوں کی توجیہہ پیش کرنا پڑتی اور اس خلا کو پُر کرنا پڑتا — اور یہ ایسی چیز تھی جس کا مجھے کوئی شوق نہیں تھا۔ لیکن پھر مجھے ایک اور شخص یاد آیا۔ یہ اس شہر میں باہر سے نیا نیا آیا تھا جب میں نے نوکری کی تلاش میں اس کی مدد کی تھی اور جو، اگر میں اسے ذرا بھی اچھی طرح جانتا تھا، میرے احسان کا بدلہ اتار کر خوشی ہی محسوس کرتا۔ وہ ایک عجیب کردار تھا — بیک وقت انتہائی محتاط طور پر بااخلاق اور حیرت انگیز طور پر نامطمئن، غیر مستقل مزاج — جس کی بیوی، جہاں تک میں بتا سکتا تھا، کئی برس پہلے اسے اس بنا پر طلاق دے کر چلی گئی تھی کہ وہ ہر جگہ اور کسی بھی جگہ موجود ہوتا ہے مگر اس کے اور اس کے بچے کے ساتھ نہیں۔ میں کچھ اعصاب زدہ محسوس کر رہا تھا؛ اگر اس نے دوبارہ شادی کر لی ہوئی تو معاملات بڑی حد تک بگڑ سکتے تھے۔ میں جس قدر تیز چل سکتا تھا چلتا ہوا اسپتال کی سمت روانہ ہوا۔

مقامی اسپتال عمارتوں اور ایوانوں پر مشتمل ایک کمپلیکس تھا جو ایک وسیع رقبے پر پھیلا ہوا تھا؛ میں گیٹ پر واقع بوتھ میں داخل ہوا اور چوکیدار سے کہا کہ متعدی امراض کے شعبے میں میری بات کرا

دے۔اس نے ٹیلیفون کو میز کے کونے تک کھسکا دیا اور کہا: ''02'' ۔ میں نے نمبر گھمایا تو مجھے بتایا گیا کہ ڈاکٹر کوستکا ابھی شعبے سے نکلا ہے اور باہر جانے کے لیے راستے میں ہوگا۔ میں گیٹ کے قریب بنچ پر بیٹھ گیا تا کہ وہ میری نظروں سے اوجھل نہ رہ جائے، اور یہاں وہاں گھومتے نیلی اور سفید دھاریوں والے اسپتالی چوغے پہنے لوگوں کو غور سے دیکھنے لگا۔ پھر میں نے اسے دیکھا: وہ سوچ میں ڈوبا ہوا چلا آ رہا تھا، لمبا، دبلا پتلا، پرکشش حد تک غیر پرکشش۔ ہاں، یہی تھا کوستکا، صحیح ہے۔ میں کھڑا ہوا اور سیدھا اس کی سمت چلا جیسے اس سے ٹکرانے کو ہوں۔ پہلے اس نے مجھے خشمگیں نگاہوں سے دیکھا، لیکن پھر مجھے پہچان گیا اور اپنے بازو وا کر دیے۔ مجھے محسوس ہوا کہ اس کی حیرت میں ناخوشگواری سے زیادہ خوشگواری کا عنصر شامل ہے اور جس فطری انداز میں اس نے مجھے خوش آمدید کہا وہ بہت حوصلہ افزا تھا۔

میں نے اسے بتایا کہ مجھے یہاں پہنچے ایک گھنٹے سے بھی کم وقت ہوا ہے اور یہاں ایک غیر اہم کام کے لیے آیا ہوں جس میں مجھے دو یا تین روز لگیں گے۔ اس نے فوراً مجھے بتایا کہ وہ اس بات پر کتنا حیران اور شکر گذار ہے کہ میرے ذہن میں سب سے پہلا خیال اسے ہی آ کر ملنے کا آیا۔ اچانک مجھے اپنے در پردہ عزائم پر اور اپنے سوال پر پشیمانی سی ہوئی جو میں نے حقیقی دلچسپی کے بجائے کچھ اندازہ لگانے کے لیے کیا تھا۔ (میں نے خوش طبعی کے سے انداز میں پوچھا تھا، ''اچھا، تو دوبارہ شادی کی؟'') اس نے مجھے بتایا (جسے سن کر مجھے اطمینان ہوا) کہ وہ اب تک اکیلا ہی ہے۔ میں نے اسے کہا کہ ہمارے پاس ایک دوسرے سے کرنے کو بہت سی باتیں ہوں گی۔ اس نے اتفاق کیا اور اس افسوس کا اظہار کیا کہ اس کے پاس صرف ایک گھنٹے کا وقت ہے جس کے بعد اسے دوبارہ اسپتال پہنچنا ہے جبکہ شام کو اسے قصبے سے جانا ہے۔ ''تمھارا مطلب ہے کہ تم یہاں رہتے نہیں ہو؟'' میں نے مایوسی سے پوچھا۔ اس نے مجھے تسلی دی کہ وہ یہیں رہتا ہے اور یہ کہ ایک نئے کمپلیکس میں اس نے ایک کنواروں والا فلیٹ لے رکھا ہے مگر یہ کہ ''اکیلے رہنا کوئی اچھی چیز نہیں۔'' پھر یہ بات کھلی کہ کوستکا کی ایک منگیتر ہے جو پندرہ میل دور ایک اور قصبے میں رہتی ہے، ایک اسکول میں استانی ہے اور اس کے پاس ایک اپنا دو کمرے کا فلیٹ ہے۔ ''تو تم آخر کار اسی کے ساتھ رہنے کے لیے منتقل ہو جاؤ گے؟'' میں نے پوچھا۔ اس نے کہا کہ وہاں اسے ایسی دلچسپ نوکری ملنا ممکن نہیں جیسی میں نے اسے تلاش

کر کے دی تھی جبکہ اس کی منگیتر کو یہاں نوکری تلاش کرنے میں دقت ہوگی۔ میں نے افسر شاہی پر (بڑے خلوص کے ساتھ) لعنت ملامت شروع کردی کہ وہ ایک مرد اور ایک عورت کے اکٹھا رہنے کا بندوبست نہیں کرسکتی۔ ''ارے چھوڑو، لڈوِک،'' اس نے مشفقانہ دلچسپی لیتے ہوئے کہا، ''سب کچھ اتنا بھی برا نہیں۔ اِدھر سے اُدھر سفر کرنے میں وقت اور پیسے کا ضیاع ہوتا تو ہے مگر میں اپنا تخلیہ برقرار رکھتا ہوں—اور اپنی آزادی بھی۔'' ''تمھاری آزادی تمھارے لیے اتنی اہم کیوں ہے،'' میں نے اس سے پوچھا۔ ''اور تمھاری آزادی تمھارے لیے اتنی اہم کیوں ہے؟'' اس نے جواباً سوال کیا۔ ''میں صنفِ نازک کا متوالا ہوں،'' میں نے جواب دیا۔ ''عورتوں کے لیے مجھے آزادی کی ضرورت نہیں،'' وہ بولا، ''مجھے اس کی ضرورت اپنی ذات کے لیے ہے۔ چلو میرے گھر، جب تک میرے واپس آنے کا وقت نہیں ہوتا۔ کیا خیال ہے؟'' میں اس سے بہتر کسی شے کا آرزومند نہیں ہوسکتا تھا۔

اسپتال کے احاطے سے نکلنے کے فوری بعد ہمارا سامنا چند عمارتوں سے ہوا جو ایک غیر مسطح اور دھول سے اٹے قطعۂ ارضی پر عجیب پاگل پن سے باہر کو نکلی ہوئی تھیں (نہ ان میں لان تھے، نہ راستے، نہ سڑکیں) جنھوں نے قصبے اور کچھ فاصلے پر دکھائی دیتے کھیتوں کے درمیان ایک قابلِ افسوس پردہ تان رکھا تھا۔ ہم ایک دروازے سے داخل ہوئے اور ایک تنگ زینہ چڑھتے ہوئے (لفٹ خراب تھی) تیسری منزل تک پہنچے، جہاں مجھے کوستکا کا کارڈ دکھائی پڑا۔ جب ہم داخلے کے ہال سے مرکزی ہال میں داخل ہوئے تو مجھے وہاں کونے میں ایک میز کے ساتھ آرام دہ اور چوڑا روزینہ بستر، ایک آرام دہ کرسی، کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ، ریکارڈ پلیئر اور ریڈیو دیکھ کر مسرت ہوئی۔

میں نے اس انتظام کی تعریف کی اور غسل خانے کے بارے میں دریافت کیا۔ ''کچھ ایسا پرتعیش نہیں،'' کوستکا نے کہا جو میری دلچسپی پر مسرور تھا۔ وہ مجھے داخلے کے ہال کی جانب واپس لے آیا اور ایک چھوٹے مگر خوشگوار غسل خانے کا دروازہ کھولا جس میں ٹب بھی تھا، فوارہ بھی اور واش بیسن بھی۔ ''تمھاری اس پُرکشش جگہ کو دیکھ کر مجھے ایک خیال آیا ہے،'' میں نے کہا، ''تمھاری کل سہ پہر اور شام کو کیا مصروفیت ہوگی؟'' ''بدقسمتی سے مجھے کل دیر تک کام کرنا ہے،'' اس نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا، ''میں کوئی سات بجے سے پہلے واپس نہیں آؤں گا۔ کیا تم شام میں فارغ ہوگے؟'' ''ممکن ہے،'' میں نے جواب دیا، ''لیکن کیا تمھارے خیال میں تم مجھے کل سہ پہر کے لیے یہ جگہ دے سکتے ہو؟''

میرے سوال نے اسے حیران کر دیا۔ لیکن فوراً ہی (جیسے اسے یہ پریشانی ہو کہ میں یہ نہ سمجھوں کہ وہ اس پر آمادہ نہیں) اس نے جواب دیا، ''میں اس کمرے کو تمھارے ساتھ بانٹنے پر بہت خوش ہوں گا۔'' پھر میرے منصوبوں سے متعلق اندازہ لگانے سے جان بوجھ کر اجتناب کرتے ہوئے اس نے مزید کہا، ''اور اگر تمھیں آج شب سونے کے لیے جگہ چاہیے تو تمھیں یہاں رہنے پر خوش آمدید کہتا ہوں۔ میں صبح سے قبل واپس نہیں آؤں گا۔ نہیں، بلکہ تب بھی نہیں، میں سیدھا اسپتال جاؤں گا۔''

''نہیں، اس کی ضرورت نہیں۔ میرے پاس ہوٹل میں ایک کمرہ ہے۔ بات یہ ہے کہ ہوٹل کا کمرہ ایسا خوشگوار نہیں اور کل سہ پہر مجھے ایک خوشگوار ماحول کی ضرورت ہے — ظاہر ہے صرف اپنے لیے ہی نہیں۔'' ''ظاہر ہے،'' کوستکا نے اپنی آنکھیں جھکاتے ہوئے کہا، ''میں نے بھی یہی سوچا تھا۔'' اس نے توقف کیا، پھر مزید کہا، ''مجھے خوشی ہے کہ میں تمھارا کوئی کام کرنے کے قابل ہوا۔'' پھر ایک اور توقف کے بعد، ''شرط یہ ہے کہ یہ واقعی مفید مطلب ہو۔''

پھر ہم میز کے گرد بیٹھ گئے (کوستکا نے کافی بنائی تھی) اور ہمارے درمیان مختصر گفتگو ہوئی۔ (میں نے روزینہ بستر کا جائزہ لیا اور یہ جان کر مجھے خوشی ہوئی کہ وہ سخت ہے: نہ دبتا ہے نہ چرچراتا ہے۔ زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ کوستکا نے اعلان کیا کہ اس کے اسپتال واپس جانے کا وقت ہو گیا ہے اور فوراً مجھے گھریلو اشیا سے متعلق اہم اسرار بتانے لگا: غسل کے ٹب کی ٹونٹی کو زیادہ زور سے بند کرنا ہو گا، معمول کے برخلاف گرم پانی 'سی' نامی ٹونٹی سے وافر مقدار میں دستیاب ہو گا، ریڈیو لگانے کے لیے ساکٹ روزینہ بستر کے نیچے ہے اور ووڈکا کی ایک نئی کھلی ہوئی بوتل الماری میں ہے۔ اس نے مجھے ایک حلقے میں بندھی دو کنجیاں تھمائیں اور دکھایا کہ کس سے عمارت کا مرکزی دروازہ کھلتا ہے اور کس سے اس کے فلیٹ کا۔ زندگی بھر بستر تبدیل کرتے رہنے کے باعث میں نے کنجیوں کا ایک نجی ذوق پیدا کر لیا تھا اور کوستکا کی کنجیاں ایک خاموش مسرت سے اپنی جیب میں ڈال لیں۔

جب ہم باہر جا رہے تھے، راستے میں کوستکا نے اس امید کا اظہار کیا کہ اس کا فلیٹ ''کسی واقعتاً خوبصورت چیز'' کا مرکز رہے گا۔ ''ہاں،'' میں نے کہا، ''اس سے مجھے ایک حسین انہدامی امر انجام دینے میں مدد ملے گی۔'' ''تو تمھارا خیال ہے کہ تباہی خوبصورت ہو سکتی ہے؟'' کوستکا نے کہا، اور میں اندر ہی اندر مسکرا دیا۔ میں نے اس جواب میں (جو بہت فطری انداز مین دیا گیا مگر ایک چیلنج کی حیثیت

سے سوچا گیا تھا) اس کوستکا کو پہچان لیا جس سے میری پندرہ برس قبل ملاقات ہوئی تھی۔ اگرچہ میں نے اسے پسند کیا تھا، تاہم اسے کچھ مضحکہ خیز بھی پایا تھا۔ اور میں نے یوں جواب دیا، ''میں جانتا ہوں کہ تم خدا کے ازلی تعمیراتی مقام کے خاموش کارکن ہو اور انہدامی امور کی بابت سننا پسند نہیں کرتے، لیکن میں کیا کرسکتا ہوں؟ میں خدا کے معماروں میں سے بالکل نہیں۔ اب اگر خدا کے معمار حقیقی دیواریں بنا ڈالیں تو مجھے اس بات میں شبہ ہے کہ ہم انھیں تباہ کرسکیں گے۔ لیکن دیواروں کے بجائے مجھے تو دیواری شبیہیں اور سیٹ ہی دکھائی دیتے ہیں — اور سیٹ تباہ ہونے کے لیے ہی بنائے جاتے ہیں۔''

اس بات نے ہمیں واپس وہاں پہنچا دیا جہاں (تقریباً نو سال قبل) ہمارے راستے جدا ہوئے تھے۔ اِس مرتبہ البتہ ہمارا جھگڑا واضح طور پر تجرید میں ڈھلا ہوا تھا؛ ہم اس کی ٹھوس بنیادوں سے بخوبی آگاہ تھے اور ان پر زور دینے کی ضرورت محسوس نہیں کر رہے تھے۔ ہمیں ضرورت تھی تو صرف اس بات کی کہ یہ دیکھیں ہم کتنے کم تبدیل ہوئے ہیں، کس طرح ہم یکساں طور پر ایک دوسرے کے متضاد رہے ہیں (اگرچہ مجھے یہ کہنا پڑے گا کہ یہ ہمارے اختلافات ہی تھے جنھوں نے مجھے اس کا دلدادہ بنایا تھا اور جن کے باعث مجھے اپنی بحثوں میں لطف آتا تھا؛ میں انھیں یہ اندازہ لگانے کے لیے استعمال کرتا کہ 'میں' کون ہوں اور 'میں' کیا سوچتا ہوں)۔ مگر اپنی پوزیشن واشگاف الفاظ میں واضح کرنے کے لیے اس نے جواب دیا، ''یہ سب بہت ٹھیک اور مناسب ہے، مگر ایک بات بتاؤ۔ تم جیسا تشکیک پسند کیسے یہ بات یقین سے کہہ سکتا ہے کہ وہ جانتا ہے سیٹ کون سا ہے اور دیوار کون سی؟ کیا تمھیں کبھی اس بات پر شبہ نہیں ہوا کہ وہ فریبِ نظر جن کا تم مضحکہ اڑاتے ہو، واقعی فریبِ نظر ہیں کہ نہیں؟ فرض کرو تم غلطی پر ہو؟ فرض کرو وہ اقدار اصلی و جائز ہوں جنھیں تباہ کرنے میں تم مصروف ہو؟'' پھر کہا، ''کسی قدر کی تحقیر کر دی جائے یا کسی فریبِ نظر کو بے نقاب کر دیا جائے، دونوں کا ایک ہی جیسا قابلِ افسوس نتیجہ نکلتا ہے۔ یہ دونوں چیزیں ایک جیسی ہیں۔ ان میں ہر ایک سے دوسری چیز مراد لینے سے آسان کوئی شے نہیں۔''

میں کوستکا کے ساتھ چلتا، قصبے سے گزرتا، اسپتال پہنچ گیا، اپنی جیب میں موجود کنجیوں سے کھیلتا اور یہ سوچتا ہوا کہ کتنا اچھا محسوس ہوتا ہے کہ آپ پھر سے ایک پرانے دوست کے پاس واپس آجائیں جو آپ کو اپنے پچ کی طرف لانے کے لیے کسی بھی وقت، کسی بھی جگہ بحث کرنے کے لیے تیار ہو، بلکہ یہاں بھی اور اس وقت ایک نئے تعمیراتی کمپلیکس کی اونچی نیچی سطح سے ہمارے گزرتے ہوئے بھی۔

چونکہ کوستکا کو معلوم تھا کہ ہمارے پاس اگلے روز کی شام ساری کی ساری موجود ہے جس کی طرف ہم خوش امیدی سے دیکھ سکتے ہیں، لہٰذا اس نے خود کو فلسفہ طرازی سے معمولی امور کی جانب مراجعت کرنے کے عیش کی اجازت دی: وہ اس بات کو یقینی بنانا چاہتا تھا کہ اگلے روز سات بجے جب تک وہ آ نہ جائے، میں اس کا انتظار کروں گا (اس کے پاس کنجیوں کا کوئی فاضل جوڑا نہیں تھا) اور اس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا اب مجھے کسی اور چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے اپنا ہاتھ اپنے چہرے پر پھیرا اور کہا، ''بس ذرا نائی کی دکان تک چلنا ہے،'' کیونکہ میری داڑھی نا قابلِ قبول حد تک بڑھی ہوئی تھی۔

''یہ مجھ پر چھوڑ دو،'' کوستکا نے کہا، ''چلو تمھاری فرسٹ کلاس داڑھی بنواتے ہیں۔''

میں نے کوستکا کی سرپرستی قبول کی اور اسے مجھ کو نائی کی ایک چھوٹی سی دکان میں لے جانے دیا جہاں تین بڑی بڑی گھومنے والی کرسیاں تین آئینوں کے روبرو اونچی کھڑی تھیں۔ دو کرسیوں پر مرد براجمان تھے جنھوں نے اپنے سر پیچھے کو جھکا رکھے تھے اور ان کے چہروں پر صابن لپا ہوا تھا۔ سفید چوغوں میں ملبوس دو عورتیں ان پر جھکی ہوئی تھیں۔ کوستکا ان میں سے ایک کے پاس گیا اور اس کے کان میں کچھ کہا۔ عورت نے اپنا استرا ایک کپڑے پر صاف کیا، دکان کی عقبی سمت کچھ پکارا اور وہاں سے سفید چوغے میں ملبوس ایک اور لڑکی برآمد ہوئی۔ نئی لڑکی نے اس مرد کو سنبھالا جسے وہ عورت چھوڑ چکی تھی جبکہ وہ عورت جس سے کوستکا نے بات کی تھی، اس نے سر کی جنبش سے مجھے اشارہ کیا اور فالتو کرسی کی جانب تحریک دی۔ کوستکا اور میں نے مصافحہ کیا اور جب وہ چلا گیا تو میں نے کرسی پر اپنی جگہ سنبھالی اور سر رکھنے کی جگہ کی جانب پیچھے سر لٹکا دیا۔ چونکہ کئی برس کے تجربے نے مجھے یہ سکھایا تھا کہ میں اپنا چہرہ نہ دیکھوں، اس لیے میں نے اپنے بالکل روبرو موجود آئینے سے صرفِ نظر کیا اور اپنی آنکھیں بلند کر کے انھیں دھبے دار سفید چھت پر دوڑنے کے لیے چھوڑ دیا۔

لڑکی کی انگلیوں کو ایک سفید کپڑا اپنی قمیص کے کالر کے اندر گھساتے ہوئے محسوس کرنے کے بعد بھی میں نے اپنی نگاہیں چھت پر ہی مرکوز رکھیں۔ پھر اس نے قدم پیچھے کیے اور میں اب چمڑے کے ٹکڑے پر استرے کے اوپر نیچے پھیرے جانے کی آواز ہی سن سکتا تھا۔ میں ایک قسم کی مسرت انگیز سستی میں ڈوب گیا، اپنے چہرے پر اس کی گیلی اور پھسلواں انگلیوں کو جھاگ بناتے ہوئے محسوس کرنے لگا۔ میں نے خیال آرائی کی کہ یہ بات کتنی حیرت انگیز اور مضحک ہے کہ کوئی نامعلوم عورت

اتنے پیار سے میرے چہرے کو اپنے لمس سے مستفید کرے، ایک ایسی عورت جو میرے لیے کوئی معنی نہ رکھتی ہو اور جس کے لیے میں کوئی معنی نہ رکھتا ہوں۔ اس کے بعد (چونکہ دماغ جب آرام کر رہا ہو تب بھی اپنے کھیل دکھانے سے باز نہیں رہتا) میں نے خواب بنایا کہ میں ایک بے دفاع شکار ہوں جو اُسترا بدست عورت کے مکمل رحم و کرم پر ہو، اور چونکہ میرا جسم خلا میں تحلیل ہو چکا تھا اور میں اگر کچھ محسوس کر سکتا تھا تو صرف اپنے چہرے پر اس کی انگلیوں کا لمس، تو میں نے ایک خواب بنایا کہ وہ نرم ہاتھ جو میرے سر کو تھامے ہوئے تھے (جو اسے موڑتے، تھپکیاں دیتے تھے)، اس طرح عمل کر رہے ہیں گویا میرا سر میرے جسم سے جڑا ہوا نہ ہو؛ جیسے وہ آزادانہ طور پر اپنا وجود رکھتا ہو اور سامنے میز پر پڑا تیز دھار استرا وہاں صرف اس لیے ہو کہ اس آزادی کو تکمیل تک پہنچا سکے۔

پھر جب چہرے کو نرمی سے سہلانے کا عمل ختم ہوا اور میں نے اس لڑکی کو قدم پیچھے ہٹا کر استرے کو باقاعدہ اٹھاتے ہوئے سنا تو میں نے خود سے کہا (کیونکہ میرے دماغ نے ابھی تک اپنی چال بازیاں ختم نہیں کی تھیں) کہ مجھے یہ دیکھنے کی مطلقاً ضرورت نہیں ہے کہ وہ لگتی کیسی ہے، یہ میرے سر کی خادمہ، میری نازک قاتلہ۔ میں نے چھت سے اپنی نگاہ نیچی کر کے آئینے پر ڈالی اور اپنی ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد لہر دوڑتی ہوئی محسوس کی: جو کھیل میں کھیل رہا تھا اس نے اچانک اور غیر محسوس طریقے سے ایک حقیقت کی شکل اختیار کر لی تھی؛ وہ عورت جو آئینے میں مجھ پر جھکی ہوئی تھی، مجھے خیال ہوا کہ میں اسے جانتا ہوں۔

وہ اپنے ایک ہاتھ سے میرے کان کی لو کو پکڑے ہوئے تھی اور دوسرے سے میرے چہرے پر لگا جھاگ بڑی احتیاط سے صاف کر رہی تھی۔ جب میں اسے کام کرتے ہوئے دیکھنے لگا تو وہ مشابہت جس نے ایک منٹ پہلے ہی مجھے اس قدر حیران کر دیا تھا، آہستہ آہستہ تحلیل ہونے اور غائب ہونے لگی۔ وہ بیسن پر جھکی اور استرے کے پھل پر دو انگلیاں پھیر کر جھاگ صاف کرنے لگی، پھر سیدھی ہوئی اور کرسی کو نرمی سے ہلکا سا موڑا۔ ہماری نگاہیں ایک بار پھر چار ہوئیں اور ایک مرتبہ پھر میں نے سوچا کہ میں اسے جانتا ہوں۔ یہ سچ ہے کہ چہرہ ذرا سا مختلف تھا، جیسے اس کی بڑی بہن کا ہو، بھورا پڑ چکا، مرجھایا ہوا، ذرا سا خود میں ڈوبا ہوا، لیکن یہ بھی تو ہے کہ میں نے اسے پندرہ سال سے نہیں دیکھا تھا۔ اس عرصے کے دوران وقت نے اس کے حقیقی چہرے پر ایک نقاب تان دیا تھا۔ مگر خوش قسمتی سے اس

Scanned with CamScanner

نقاب میں دو سوراخ موجود تھے جن سے اس کی اصل آنکھیں، اس کی حقیقی آنکھیں چمکتی ہوئی نظر آ سکتی تھیں — اور وہ بالکل ویسی ہی تھیں جیسی میں انھیں جانتا تھا۔

پھر یادوں کی یہ لکیر دوبارہ گڈ مڈ ہوگئی: ایک اور گاہک اندر آیا اور اپنی باری کے انتظار میں میرے عقب میں بیٹھ گیا۔ اس نے میری والی لڑکی سے گفتگو شروع کر دی اور کہنے لگا کہ ہمیں آج کل کیسی زبردست گرمیاں میسر ہیں اور قصبے کے باہر وہ لوگ کیسا سوئمنگ پول تعمیر کر رہے ہیں۔ جب اس نے جواب دیا (میں نے اس کے لفظوں سے زیادہ ان کی ادائیگی پر غور کیا، کہ لفظ کوئی اہمیت نہیں رکھتے تھے) تو مجھے یقین تھا کہ میں نے اس کی آواز نہیں پہچانی — وہ بس یونہی سی اور سپاٹ تھی، فطری اور تقریباً کھردری؛ یہ آواز کسی اجنبی کی تھی۔

اس وقت تک وہ میرا چہرہ صاف کرنا شروع کر چکی تھی، اسے اپنی ہتھیلیوں کے درمیان دباتے ہوئے اور (اس کی آواز کے باوجود) میں نے ایک مرتبہ پھر اس بات پر اعتبار کرنا شروع کر دیا کہ میں اسے جانتا ہوں۔ یہ کہ پندرہ برس بعد وہ یہاں ہے، میرے قریب، ایک مرتبہ پھر میرا چہرہ سہلاتی ہوئی، اپنی لمبی نرم تھپتھپاہٹوں کے لمس سے مستفید کرتی ہوئی (میں یہ بات قطعی بھول چکا تھا کہ وہ میرا چہرہ سہلا نہیں رہی تھی بلکہ اسے دھو رہی تھی)۔ اس کی اجنبی آواز باتونی گاہک کی جانب کچھ بڑبڑاتی رہی مگر میں نے اس پر یقین کرنے سے انکار کر دیا؛ میں اس کے ہاتھوں پر اعتبار کرنا چاہتا تھا، اسے اس کے ہاتھوں سے پہچاننا چاہتا تھا؛ میں چاہتا تھا کہ اس بات کا تعین اس کے لمس کی نرمی کی سطح کرے کہ میں اسے جانتا ہوں یا نہیں، وہ مجھے پہچانتی ہے کہ نہیں۔ اس نے ایک تولیہ لیا اور میرا منھ خشک کیا۔ باتونی گاہک اپنے ہی کسی مذاق پر بلند آواز قہقہے لگا رہا تھا اور میں نے نوٹ کیا کہ میری والی لڑکی ان میں شریک نہیں ہوئی۔ دوسرے لفظوں میں، اس نے غالباً اس کا کہا ہوا کوئی بھی لفظ نہیں سنا تھا۔ اس بات پر مجھے پُرجوش مسرت ہوئی: میں نے اسے اس بات کے ثبوت کے طور پر لیا کہ اس نے مجھے پہچان لیا ہے اور اسی باعث وہ ہل کر رہ گئی ہے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ جیسے ہی کرسی سے اتروں اس سے کچھ نہ کچھ کہوں۔ اس نے میری گردن سے کپڑا کھینچ لیا۔ میں کھڑا ہو گیا۔ میں نے اپنے سینے کی جیب میں پانچ کراؤن کا نوٹ ڈھونڈا۔ میں نے اس سے نگاہیں چار ہونے کا انتظار کیا تاکہ اسے اس کے نام سے پکار سکوں (گاہک اب بھی کسی چیز کے بارے میں رواں تھا) مگر اس نے اپنا سر میری جانب سے

Scanned with CamScanner

موڑے رکھا اور اتنی تیزی سے، اتنے غیر ذاتی انداز سے پیسے لے لیے کہ مجھے اچانک محسوس ہوا جیسے میں کوئی پاگل آدمی ہوں جو اپنے ہی التباس کا شکار ہو، اور میں اس سے کچھ کہنے کی ہمت نہیں کر سکا۔

میں عجیب پریشانی کے عالم میں نائی کی دکان سے نکلا۔ میں بس یہ جانتا تھا کہ میں کچھ نہیں جانتا، اور یہ کہ ایک ایسے چہرے کو پہچان نہ پانا جسے کبھی شدت سے چاہا جا چکا ہو، بڑی بے دردی کی علامت ہے۔

میں تیزی سے ہوٹل کو واپس آیا (راستے میں مجھے ایک پرانے دوست یاروسلاو کی جھلک دکھائی دی جو ہماری لوک سنگت کا پہلا وائلن نواز ہوتا تھا لیکن میں نے اس کی نگاہوں کا سامنا کرنے سے گریز کیا جیسے میں اس کی بلند اور تاکیدی موسیقی سے بھاگ رہا ہوں) اور کوستکا کو فون کیا۔ وہ ابھی تک اسپتال میں تھا۔

''وہ لڑکی جس سے تم نے میری شیو بنوائی — اس کا نام لوسی سبتکا تو نہیں؟''

''اب وہ ایک اور نام کے ساتھ زندگی گزار رہی ہے، مگر وہ ہے یہی۔ تم اسے کہاں سے جانتے ہو؟'' کوستکا نے پوچھا۔

''ارے، زمانہ گزر گیا،'' میں نے جواب دیا اور رات کے کھانے کا خیال کیے بغیر دوبارہ سے ہوٹل چھوڑ دیا (سیاہی پھیل رہی تھی) اور قصبے میں آوارہ گردی کرنے نکل کھڑا ہوا۔

حصہ دوم: ہیلینا

1

آج شب میں بستر پر جلد جا رہی ہوں۔ ہو سکتا ہے مجھے نیند نہ آئے مگر میں بستر پر جلد جا رہی ہوں۔ پاول آج سہ پہر براتی سلاوا (Bratislava) روانہ ہوا ہے، میں صبح سویرے برنو (Brno) پرواز کر جاؤں گی اور باقی سفر بس کے ذریعے طے کروں گی۔ ننھی زدینا کو دو روز تک اکیلے رہنا پڑے گا۔ وہ محسوس نہیں کرے گی؛ ویسے بھی وہ ہماری قربت کی زیادہ پروا نہیں کرتی — کم از کم میری قربت

Scanned with CamScanner

کی تو نہیں۔ وہ پاول کی پرستش کرتی ہے۔ پاول اس کی زندگی میں آنے والا پہلا مرد ہے، وہ جانتا ہے اسے کیسے سنبھالا جا سکتا ہے، وہ تمام عورتوں کو سنبھالنا جانتا ہے، مجھے سنبھالنا جانتا ہے، اب بھی، اس ہفتے، وہ دوبارہ وہی تھا، پرانا والا، میرے چہرے کو تھپتھپاتے ہوئے وعدہ کر رہا تھا کہ وہ براتیسلا وا سے واپسی پر میرے لیے موراویا میں رکے گا، کہہ رہا تھا اب وقت آ گیا ہے کہ ہم چیزوں کو بات چیت سے نمٹانا شروع کریں، اسے اندازہ ہو گیا ہوگا کہ ہم اسی طرح تو سلسلہ جاری نہیں رکھ سکتے، مجھے امید ہے کہ وہ یہ سب کچھ ویسے ہی ہوتے دیکھنا چاہتا ہے جیسے پہلے تھا، مگر اسے اب تک انتظار کرنا ہی کیوں ضروری تھا— اب جبکہ میری ملاقات لڈوِک سے ہو چکی ہے؟ آہ اس سب کا درد! مگر نہیں، مجھے خود کو مایوسی کے سپرد نہیں کرنا چاہیے، مایوسی میرے نام کو کبھی داغدار نہ کرے، جیسا کہ فیوچک[1] نے کہا تھا، اس کے لفظ میرا نصب العین ہیں، اس وقت بھی جب وہ اسے اذیت دے رہے تھے، حتیٰ کہ پھانسی کے سائے تلے بھی فیوچک دل نہیں ہارا، اور مجھے اس بات کی کیا پروا کہ اب اس کا فیشن نہیں رہا، ہو سکتا ہے میں نری احمق ہوں، مگر اپنی فیشن ایبل تشکیک پسندی کے ہمراہ وہ بھی احمق ہی ہیں، میں ان کی حماقت کی جگہ اپنی حماقت کیوں نہ اختیار کروں، میں نہیں چاہتی کہ میری زندگی بیچ سے تڑخ جائے، میں چاہتی ہوں کہ یہ شروع سے آخر تک یک جان ہو۔ یہی وجہ ہے کہ میں لڈوِک کے لیے اتنی پاگل ہوں، جب میں اس کے ساتھ ہوتی ہوں تو مجھے اپنے نظریات اور اپنے ذوق تبدیل نہیں کرنے پڑتے، وہ اتنا نارمل ہے، اتنا سیدھا، خوش مزاج، ہر شے سے متعلق واضح— یہ چیز ہے جو مجھے پسند ہے، یہ چیز ہے جو مجھے ہمیشہ پسند رہی۔

میں جیسی ہوں ویسی ہونے پر مجھے کوئی شرمندگی نہیں، جیسی میں ہمیشہ رہی اس کے سوا میں کسی اور طرح کی ہو ہی نہیں سکتی، اٹھارہ برس کی عمر تک مجھے زندگی میں صرف ایک منظم بورژوا خاندان کے آراستہ فلیٹ کا علم تھا اور اسکول کے کام کا، اسکول کا کام اور بس اسکول کا کام، میں حقیقی دنیا سے اتنی ہی کٹی ہوئی تھی جتنی کٹ سکتی تھی، اور جب میں 1969 میں پراگ آئی تو جیسے یہ کوئی معجزہ تھا، میں اتنی خوش تھی، میں اسے کبھی نہیں بھولوں گی، اور اسی لیے میں پاول کو اپنے دل سے کبھی مٹا نہیں سکتی، ہر چند

---

[1] جولیس فیوچک (Julius Fuchik): چیک اخبار نویس اور شاعر جسے جرمن نازی فوج نے پھانسی دے دی تھی۔

Scanned with CamScanner

کہ میں اب اس سے محبت نہیں کرتی، ہر چند کہ اس نے مجھے دکھ دیا ہے، نہیں، نہیں مٹا سکتی، پاول میری جوانی ہے، پراگ، یونیورسٹی، سونے کا کمرہ، اور فیوچک کے گیت اور رقص کی سنگت کا اکثر حصہ، اب کوئی نہیں جانتا کہ اس سب کے ہمارے لیے معنی کیا تھے، یہی تھی وہ جگہ جہاں میں پاول سے ملی تھی، وہ دھیوت (tenor) گاتا تھا، میں رکھب (alto)، ہم نے سیکڑوں کنسرٹ اور فن کے مظاہرے کیے، ہم سوویت گیت گاتے تھے، خود اپنے اشتراکی تعمیری گیت اور ہاں لوک گیت، وہی ہمیں سب سے زیادہ پسند تھے، میں موراویائی لوک گیتوں کے عشق میں ایسی مبتلا ہوئی کہ وہی میری بقا کا لائیت موتیف[2] ٹھہرے۔

رہی یہ بات کہ میں پاول کے عشق میں کیسے مبتلا ہوئی تو اب میں یہ بات کسی کو نہیں بتا سکتی، وہ سب کسی پریوں کی کہانی کی طرح تھا، آزادی کی سالگرہ تھی، قصبے کے پرانے چوک پر ایک بڑا مظاہرہ ہونا تھا، ہماری سنگت بھی وہاں موجود تھی، ہم ہر جگہ اکٹھے جاتے تھے، دسیوں ہزار لوگوں میں مٹھی بھر لوگ، اور اوپر روسٹرم پر ہر قسم کے اہم مدبر بیٹھے تھے، چیک اور غیر ملکی، اور وہاں ہر قسم کی تقریریں اور واہ واہ ہو رہی تھی، اور پھر تاگلیاتی[3] خود اوپر گئے، مائیکروفون سنبھالا اور چند جملے اطالوی زبان میں کہے، چوک میں موجود تمام لوگوں نے حسبِ عادت چلاّ چلاّ کر، تالیاں پیٹ کر اور نعرے لگا کر جواب دیا۔ اس رش میں پاول اتفاق سے میرے برابر میں کھڑا ہوا تھا اور میں نے سنا کہ اس نے عام لوگوں کی بڑبڑاہٹوں میں اپنی طرف سے کوئی آواز شامل کر دی ہے، کوئی مختلف چیز، اور جب میں نے اس کے ہونٹوں کی طرف دیکھا تو مجھے اندازہ ہوا کہ وہ گیت گا رہا ہے، بلکہ گیت چیخ رہا ہے، وہ کوشش کر رہا تھا کہ ہم اس کا گیت سن پائیں اور اس کے ساتھ شریک ہو جائیں، وہ ایک اطالوی گیت گا رہا تھا جو ان دنوں ہمارے معمول کا حصہ تھا اور ان دنوں بہت مشہور تھا:

Avanti pololo, a la riscasso,
bandiera rossa, bandierra rossa...

---

[2] لائیت موتیف (leitmotiv): جرمن لفظ جس کے معنی leading motive کے ہیں۔ اصطلاحاً موسیقی یا کسی بصری آرٹ کے پارے میں کسی خاص شخص، شے یا خیال سے متعلق مختصر اور بار بار دہرائی جانے والی تھیم۔

[3] برنار دو تاگلیاتی (Bernardo Tagliati): اطالوی کمیونسٹ پارٹی کا رہنما۔

یہ سرتا پا پاول ہی تھا، وہ صرف دماغ تک رسائی پر کبھی مطمئن نہیں ہوتا تھا، وہ جذبات تک رسائی پانا چاہتا تھا، کیسی شاندار بات ہے، میں نے سوچا، اطالوی مزدوروں کی تحریک کے رہنما کو پراگ کے چوک میں ایک اطالوی انقلابی گیت کے ذریعے سلام پیش کرنا، ہر چیز سے زیادہ میں یہ چاہتی تھی کہ تاگلیاتی بھی میری ہی طرح کے جذبے سے مغلوب ہو جائیں، سو میں نے پاول کے گیت میں آواز ملا دی، اتنی بلند جتنی میں کر سکتی تھی، اور دوسرے لوگ ہمارے ساتھ شریک ہو گئے، پھر دوسرے، پھر اور دوسرے، حتیٰ کہ آخرکار ہماری پوری سنگت گانے لگی، مگر مجمعے میں شور بہت ہی زیادہ تھا اور ہم مٹھی بھر افراد سے زیادہ نہیں تھے، کم از کم پچاس ہزار کے مجمعے کے مقابل ہم پچاس تھے، بادِ مخالف غالب تھی مگر ہم نے جان لڑا دی، پہلے بند کے دوران ہم نے سوچا کہ ہم کامیاب نہیں ہو سکیں گے اور ہمارا گیت ان سنا رہ جائے گا، مگر پھر ایک معجزہ ہوا، آہستہ آہستہ مزید آوازیں گیت میں تبدیل ہوتی گئیں، لوگوں کو اندازہ ہونا شروع ہوا کہ ہو کیا رہا ہے اور وہ گیت چوک کے اس شور شرابے سے آہستہ آہستہ یوں ابھرا جیسے کسی بڑے سے اور ہلتے جلتے ہوئے کرائی سیلس[4] سے تتلی نمودار ہوتی ہے۔ اور آخرکار وہ تتلی، وہ گیت یا کم از کم اس کے آخری چند ٹکڑے اڑ کر روسٹرم تک جا پہنچے اور بے چینی سے ہم، بڑھاپے کی طرف گامزن اطالوی کے چہرے کی طرف دیکھنے لگے، اور جب ہم نے یہ سمجھا کہ ہم نے انھیں اپنا ہاتھ ہلا کر گیت کا جواب دیتے ہوئے دیکھا ہے تو ہم خوش ہوئے اور مجھے یقین تھا، حالانکہ میں اتنی دور تھی کہ بتا نہیں سکتی تھی، مجھے یقین تھا کہ میں نے ان کی آنکھوں میں آنسو دیکھے ہیں۔

اور اس تمام جوش و جذبے کے بالکل درمیان میں، مجھے نہیں معلوم یہ سب کیسے ہوا، میں نے اچانک پاول کا ہاتھ تھام لیا اور اس نے میرا ہاتھ دبایا، اور جب یہ چیزیں تھم گئیں تو ایک اور مقرر مائیکروفون کی جانب چڑھا، مجھے ڈر تھا کہ وہ اس اثر انگیز کیفیت کو ختم نہ کر دے مگر اس نے ایسا نہیں کیا، ہم مظاہرے کے آخر تک ہاتھ تھامے رہے بلکہ اس کے بعد بھی نہیں چھوڑے، ہجوم چھٹ گیا اور ہم پراگ میں بہار کی طرحداری کے درمیان کئی گھنٹے آوارہ گردی کرتے رہے۔

سات سال بعد، جب ننھی زدینا پانچ برس کی تھی، میں بھول نہیں پاؤں گی، اس نے مجھے بتایا کہ ہم نے شادی محبت کی وجہ سے نہیں کی، ہم نے شادی پارٹی نظم و ضبط کے باعث کی ہے، میں جانتی

---

[4] Chrysalis: تتلی یا پتنگے کا ساکت منجھ روپ۔

Scanned with CamScanner

ہوں اس نے بحث کی گرما گرمی میں یہ بات کہہ دی تھی، میں جانتی ہوں یہ جھوٹ تھا، پاول نے مجھ سے شادی محبت کی وجہ سے کی تھی، وہ تبدیل بعد میں ہوا، پھر بھی کہنے کی حد تک یہ بات تھی بڑی ہیبت ناک۔ کیا یہ وہی نہیں تھا جو ہر ایک کو کہتا پھرتا تھا کہ آج کل محبت بہت مختلف ہو چکی، اب یہ جنگ میں مدد دینے کے مترادف ہے، دنیا سے فرار کے مساوی نہیں؟ بہر کیف، یہ ہمارے لیے ایسی ہی تھی، ہم تو باہر کہیں کھانا کھانے کا وقت بھی نہیں نکالتے تھے۔ جوانوں کی لیگ کے دفتر میں محض دو خشک رول کھانے کے بعد یہ بھی ہوتا تھا کہ ہم دوبارہ مل ہی نہ پاتے، میں نصف شب تک پاول کا انتظار کرتی جب وہ ان نا مختتم، چھ چھ آٹھ آٹھ گھنٹے کی میٹنگوں میں شرکت کر کے واپس گھر آتا تھا، اپنے فارغ وقت میں میں اس کی وہ گفتگوئیں اور تقریریں نقل کرتی جو وہ ہر قسم کی کانفرنسوں اور سیاسی تربیت کے اجلاسوں میں کرتا تھا، ان لوگوں کے لیے وہ بہت اہمیت رکھتا تھا، یہ صرف میں جانتی ہوں کہ اس کے لیے ان سیاسی موقعوں پر موجودگی کی اہمیت کتنی زیادہ تھی، وہ یہ بات دُہرا دُہرا کر تھکتا نہیں تھا کہ نیا آدمی پرانے آدمی سے یوں مختلف ہے کہ اس نے نجی اور عوامی زندگی میں امتیاز ختم کر ڈالا ہے اور اب، کئی سال بعد، وہ یہ شکایت کرتا ہے کہ ان دنوں کامریڈ لوگ اس کی نجی زندگی میں مداخلت کرنے سے بھی باز نہیں رہتے تھے۔

ہم تقریباً دو برس تک ساتھ رہے، اور میں ذرا بے صبر ہونے لگی، اور اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں، کوئی عورت اپنے خود پسند محبوب سے ہمیشہ مطمئن نہیں رہ سکتی، پاول بالکل مطمئن تھا، ہر مرد تھوڑا بہت خود غرض تو ہوتا ہی ہے، اب یہ عورت پر ہے کہ اپنی ذات اور اپنے مقصد کی خاطر اٹھ کھڑی ہو، بدقسمتی سے پاول کو اس مشکل سے ہماری سنگت کے دیگر ارکان کی بہ نسبت کم سروکار تھا، خصوصاً ان چند لڑکیوں کی بہ نسبت جن کے میں بہت قریب تھی اور انھوں نے دوسرے لوگوں سے بات کی۔ اس سب کا نتیجہ یہ نکلا کہ پاول کو کمیٹی کے روبرو طلب کیا گیا۔ مجھے نہیں معلوم انھوں نے وہاں اس سے کہا کیا، ہم نے اس معاملے پر کبھی گفتگو نہیں کی، مگر وہ اس سے سختی سے پیش آئے ہوں گے، اُن دنوں اخلاقیات پر بڑی سختی سے عملدرآمد ہوتا تھا، لوگ کچھ زیادہ ہی اس پر عمل کرتے تھے، لیکن شاید یہ بہتر ہی ہے کہ اخلاقیات پر زیادہ شدومد سے کاربند رہا جائے، بجائے اس کے کہ بداخلاقی پر، جیسا کہ ان دنوں ہوتا ہے۔ پاول کافی عرصے تک میرے راستے سے ہٹا رہا، میں نے سوچا میں نے ہر شے برباد کر دی

Scanned with CamScanner

ہے، میں مایوس تھی، خودکشی کرنے پر تیار تھی، مگر پھر وہ لوٹ آیا، ہائے، میرے گھٹنے کیسے لرز رہے تھے، اس نے مجھے کہا کہ اسے معاف کردوں اور مجھے ایک لاکٹ دیا جس میں کریملن کی تصویر بنی ہوئی تھی، وہ اس کی سب سے پسندیدہ ملکیت تھی، میں اسے کبھی نہیں اتارتی، یہ پاول کی یاد سے بہت زیادہ کچھ ہے، بہت ہی زیادہ، اور میں خوشی کے آنسو چھلکانے لگی اور دو ہفتے بعد ہماری شادی ہوگئی، اور ساری سنگت شادی پر آئی، انھوں نے تقریباً چوبیس گھنٹے تک گیت گائے اور رقص کیا، میں نے پاول سے کہا کہ اگر ہم نے ایک دوسرے سے بے وفائی کی تو یہ اس بیاہ میں موجود ہر شخص سے بے وفائی کرنے کے مترادف ہوگا، قصبے کے پرانے چوک والے مظاہرے میں موجود ہر شخص سے بے وفائی کے مترادف، بشمول تاگلیاتی کے، جب میں پیچھے مڑ کر ان چیزوں کو دیکھتی ہوں جن سے ہم نے سچ مچ بے وفائی کی تو مجھے ہنسی سی آجاتی ہے...

2

ذرا دیکھیں تو، کل میں پہنوں گی کیا، گلابی سویٹر، پلاسٹک کا رین کوٹ، ان میں میرے جثے کی نمائش بہترین ہوتی ہے، میں اب اتنی دبلی نہیں جتنی پہلے ہوا کرتی تھی لیکن پھر بھی میرے پاس اپنی جھریوں کی تلافی کے لیے کچھ ہے، ایسا کچھ جو نوجوان لڑکیوں کے پاس نہیں ہوتا، ایک بھرپور طریقے سے گزاری ہوئی زندگی کا حسن۔ یہی ہے وہ چیز جس نے جندرا کو میری طرف راغب کیا، بے چارہ لڑکا! مجھے ابھی تک یاد ہے کہ جب میں نے اسے بتایا کہ میں طیارے سے جاؤں گی اور اسے اکیلے جانا ہوگا تو اس کے چہرے پر کیسی مایوسی پھیل گئی تھی، وہ میرے ساتھ گزارے ہوئے ہر لمحے پر اور اپنی انیس سالہ مردانگی کی نمائش کر کے خوش ہوتا ہے، اس کا بس چلے تو مجھے متاثر کرنے کے لیے رفتار کے تمام ریکارڈ توڑ دے، ہاں وہ دیکھنے میں زیادہ اچھا نہیں مگر آلات اور اوزاروں کا ماہر ہے اور ایک بہترین ڈرائیور ہے، اسٹیشن پر موجود لوگ اسے چھوٹے موٹے کاموں کے لیے ساتھ لے جا کر خوش ہوتے ہیں، اور کیوں نہ ہو، یہ جاننا کیسا خوشگوار ہے کہ میرے اردگرد کوئی ایسا شخص موجود ہے جو مجھے چاہتا ہے، گزشتہ چند برسوں میں میں اسٹیشن پر اتنی زیادہ ہر دل عزیز نہیں رہ گئی، لوگ مجھے انتہا پسند کہتے ہیں، جنونی، عقیدہ پرست، پارٹی کی خونخوار اور پتا نہیں کیا کیا، مگر وہ مجھے پارٹی سے محبت کرنے اور اپنا

Scanned with CamScanner

تمام فارغ وقت اس کی نذر کرنے پر کبھی شرمندہ نہیں کر پائیں گے۔ زندہ رہنے کے لیے میرے پاس اور ہے بھی کیا؟ پاول کے پاس تو دوسری عورتیں ہیں، اور اب مجھے ان پر نظر رکھنے سے بھی کوئی سروکار نہیں، ننھی زدینا اس کی پرستش کرتی ہے، کوئی دس سال سے میرا کام ایک ہی ڈھرّے پر چل رہا ہے، فیچر لکھنا، انٹرویو کرنا، پایۂ تکمیل تک پہنچنے والے منصوبوں کے بارے میں پروگرام، ماڈل گودام اور ماڈل گوالنیں، یہ اور پھر گھر کی مایوس کن صورتِ حال، صرف پارٹی ہے جس نے مجھے کبھی نقصان نہیں پہنچایا اور نہ میں نے پارٹی کو نقصان پہنچایا ہے، اُن دنوں بھی نہیں جب لگتا تھا ہر کوئی پارٹی چھوڑنے پر تیار ہے، سن چھپن میں، جب ہر طرف اسٹالن کے جرائم کی بات ہو رہی تھی، اور لوگوں پر وحشت سوار ہوگئی تھی اور وہ ہر چیز کو مسترد کرتے پھرتے تھے، کہتے تھے ہمارے اخبارات جھوٹ کا پلندہ ہیں، قومیائے گئے اسٹور بے کار ہیں، ثقافت زوال کا شکار ہے، فارموں کو اجتماعیانا[5] نہیں جانا چاہیے تھا، سوویت یونین میں کوئی آزادی نہیں، اور سب سے بری چیز تو یہ تھی کہ خود کمیونسٹ اسی طرح کی باتیں کرتے پھرتے تھے اور اپنے ہی اجلاسوں میں، پاول بھی، اور وہ سب اسے داد دیتے تھے، پاول کو تو ہمیشہ ہی داد ملتی تھی، اس وقت سے جب وہ بچہ تھا، اکلوتا بچہ، اس کی ماں اس کی تصویر اپنے ساتھ بستر پر لے جاتی تھی، اپنے نادرِ روزگار بیٹے کو، نادرِ روزگار بچہ مگر اوسط درجے کا نوجوان، وہ سگریٹ نہیں پھونکتا، شراب نہیں پیتا، مگر اپنی تعریف سنے بغیر رہ نہیں سکتا، یہی اس کا الکحل ہے، یہی اس کی نکوٹین، لوگوں کے دلوں کے تاروں پر دستک دینے کے کسی نئے امکان پر اسے کیسا جوش آجاتا تھا، اس نے عدالتی قتل کے ان ہیبت ناک واقعات پر ایسی جذباتی تقریریں کیں کہ لوگ بس روئے ہی نہیں، کچھ میں ہی بتا سکتی ہوں کہ وہ اپنی اس برہمی کا کتنا لطف لیتا تھا، اور میں اس سے نفرت کرتی تھی۔

خوش قسمتی سے پارٹی نے ان کائیں کائیں کرنے والوں کو اچھی طرح سبق سکھایا، اور جب وہ دھیمے پڑے تو پاول بھی دھیما پڑ گیا، وہ یونیورسٹی میں مارکسزم پر اپنی آرام دہ لیکچر شپ کو خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا، مگر کوئی چیز پیچھے رہ ہی گئی، نفرت کا ایک جرثومہ، بے اعتمادی، وسوسہ، ایک ایسا جرثومہ جو خاموشی میں افزائش کرتا ہے، چوری چھپے، میں نہیں جانتی تھی کہ اس کا مقابلہ کیسے کروں، میں تو بس پہلے سے زیادہ پارٹی سے جڑ گئی، پارٹی ایک طرح سے ایک زندہ وجود ہے، میں اسے اپنی تمام نجی

---

[5] اجتماعیانا: Collectivisation

سوچوں سے آگاہ کر سکتی ہوں، اب جبکہ میرے پاس پاول سے کہنے کے لیے کچھ نہیں، اور نہ کسی اور سے، دوسرے لوگ بھی مجھے پسند نہیں کرتے، یہ سب اس وقت ظاہر ہوا جب ہم اُس والے ہیبت ناک واقعے سے نمٹ رہے تھے، اسٹیشن پر ہمارے ساتھیوں میں سے ایک — شادی شدہ آدمی تھا — اس کا شعبۂ تکنیک میں ایک لڑکی سے چکر چل رہا تھا، وہ لڑکی تنہا، غیر ذمہ دار اور سنکی تھی، تنگ آ کر اس کی بیوی نے مدد کے لیے پارٹی کمیٹی سے رجوع کیا، ہم نے کئی گھنٹے معاملے پر غور کرنے میں لگائے، ہم نے بیوی سے بات کی، لڑکی سے بات کی، وہاں کام کرنے والے مختلف شاہدین سے بات کی، ہم چاہتے تھے کہ معاملے کی واضح اور مبسوط تصویر ہمارے سامنے آجائے اور ہم احتیاط سے انصاف کریں، مرد کو پارٹی کی جانب سے برا بھلا کہا گیا، لڑکی کو تنبیہ کی گئی اور دونوں کو پارٹی سے وعدہ کرنا پڑا کہ وہ ایک دوسرے سے ملنا بند کر دیں گے۔ بدقسمتی سے الفاظ اور اعمال میں بہت فرق ہوتا ہے، وہ جدا ہونے پر صرف ہمارا منھ بند رکھنے کے لیے آمادہ ہوئے تھے اور درحقیقت انھوں نے کمال عیاری سے ایک دوسرے سے ملنا جاری رکھا ہوا تھا۔ لیکن سچ سامنے آتا ہی ہے اور ہم نے جلد ہی اس کے بارے میں جان لیا، میں نے سخت موقف اختیار کیا، میں نے تجویز پیش کی کہ مرد کو جان بوجھ کر پارٹی کو دھوکا دینے اور اسے غلط اطلاع دینے پر پارٹی سے نکال دینا چاہیے، آخر جب وہ پارٹی کو دھوکا دے چکا ہے تو وہ کمیونسٹ کس بات کا ہو سکتا ہے؟ مجھے نفرت ہے جھوٹ سے، مگر میری تجویز کامیاب نہ ہوئی اور مرد کو ایک مرتبہ پھر برا بھلا کہہ کر چھوڑ دیا گیا، لیکن کم از کم لڑکی کو اسٹیشن چھوڑنا پڑا۔

اور ان کی مجھ پر نظرِ کرم کا باعث یہی ایک واقعہ نہیں، انھوں نے تو مجھے ایک عفریت ہی بنا کر رکھ دیا، ایک درندہ، یہ مجھے داغدار کرنے کی ایک مسلسل مہم تھی، انھوں نے میری نجی زندگی کی کرید کرنا شروع کیا، اور میری دکھتی ہوئی رگ یہی تھی، کوئی عورت محسوسات کے بغیر نہیں رہ سکتی، اگر رہتی ہو تو پھر وہ عورت ہی نہیں، پھر میں ان سے انکار کیوں کروں؟ اب چونکہ مجھے گھر پر محبت میسر نہیں تھی، میں نے اسے دیگر جگہوں پر تلاش کیا، ایسا بھی نہیں کہ میں نے کبھی اسے پا لیا ہو، لیکن وہ ایک اجلاس کے دوران مجھ پر حملہ آور ہو گئے، مجھے منافق کہا جو دوسروں کو شادیاں خراب کرنے کے جرم میں نمائشی شکنجوں میں کسنے کے لیے کوشاں ہے، دوسروں کو نکالنے، برطرف کرنے، تباہ کرنے کے لیے کوشاں ہے، جبکہ خود ہر بار موقع پا کر اپنے شوہر سے بے وفائی کی مرتکب ہوتی ہے، یہ تھے وہ الفاظ جن میں انھوں نے

Scanned with CamScanner

اجلاس کے دوران میرے معاملے پر گفتگو کی تھی، لیکن میرے پیٹھ پیچھے تو وہ زیادہ ہی منحوس تھے، کہتے تھے میں سامنے سامنے تو راہبہ بنی پھرتی ہوں اور اپنی اصل زندگی میں طوائف ہوں، لگتا تھا وہ یہ دیکھ ہی نہیں پا رہے تھے کہ میرے دوسروں کے معاملے میں اتنی سخت ہونے کا واحد سبب یہ تھا کہ مجھے معلوم تھا کہ پُرمسرت ازدواجی زندگی ہوتی کیا ہے، یہ نفرت نہیں تھی جس نے مجھے وہ سب کچھ کرنے پر مجبور کیا جو میں نے کیا، یہ محبت تھی، محبت کی محبت، ان کے گھروں اور مکانوں کی محبت، ان کے بچوں کی محبت، میں ان کی مدد کرنا چاہتی تھی، میرا ابھی ایک بچہ ہے، گھر ہے اور میں ان کے لیے کانپتی رہتی ہوں۔

اگرچہ ہو سکتا ہے وہ صحیح ہوں، ہو سکتا ہے میں ہی کوئی تلخ بڈھی چڑیل ہوں، اور لوگوں کو جو جی میں آئے کرنے میں آزاد ہونا چاہیے اور کسی کو یہ حق نہیں کہ ان کی نجی زندگی میں ناک گھسیڑتا رہے، ہو سکتا ہے یہ دنیا جتنی ہم نے سوچ رکھی ہے اتنی خوشگوار نہ ہو اور میں کوئی گندی کیسار[6] ہی ہوں جو اپنے کام سے کام نہیں رکھتی، مگر کیا کروں میرا طریق کار ہے ہی یہ، میں عمل بس اپنے محسوسات کو دیکھ کر ہی کرتی ہوں، اب تو بہت دیر ہو چکی، میرا ہمیشہ سے یہ اعتقاد رہا ہے کہ فرد واحد اور ناقابلِ تقسیم ہے، اور یہ پیٹی بورژوا ہی ہے جو اسے عوامی ذات اور نجی ذات میں منقسم کرتا ہے، میرا عقیدہ ہی یہ ہے، میں نے ہمیشہ سے اس پر عمل کیا ہے اور اُس بار بھی کچھ مختلف نہیں ہوا۔

جہاں تک میرے تلخ ہونے کا سوال ہے، میں یہ تسلیم کرنے کو پوری طرح تیار ہوں کہ میں ان نوجوان لڑکیوں، ان چھوٹی چھوٹی کتیاؤں کو بالکل برداشت نہیں کر پاتی جنھیں خود پر اور اپنی جوانی پر اس قدر اعتماد ہوتا ہے اور جو بڑی عمر کی عورتوں کا مطلق خیال نہیں کرتیں، کسی دن وہ بھی تیس برس کی ہوں گی، پینتیس برس کی، چالیس برس کی ہوں گی، اور جناب، مجھے یہ تو بالکل مت کہیے گا کہ وہ اس سے محبت کرتی تھی۔ جانتی کیا تھی وہ محبت کے بارے میں؟ وہ تو پہلی ہی رات کسی بھی مرد کے ساتھ سو جاتی، شرمندگی یا اخلاقی پابندی کا احساس ہی نہ ہوتا اسے، جب میرا اس جیسی لڑکیوں سے موازنہ کیا جاتا ہے، صرف اس وجہ سے کہ میرے، ایک شادی شدہ عورت کے، کچھ چکر چل چکے ہیں، تو مجھے سخت شرمندگی ہوتی ہے، فرق یہ ہے کہ میں تو ہمیشہ سے محبت کی متلاشی رہی ہوں اور اگر کبھی غلطی کرتی اور محبت کو نہ پاتی تو خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹ جاتی اور محبت کو کہیں اور پانے کی کوشش کرنے لگتی، اگرچہ اس

---

6 کیسار (commissar): کمیونسٹ پارٹی کا افسر جو سیاسی تلقین و ہدایت اور تنظیم پر مامور ہو۔

Scanned with CamScanner

سے کہیں آسان یہ ہوتا کہ میں محبت کے لڑکیوں جیسے خواب بھول جاتی اور انھیں بھول کر سب حدیں پھلانگ جاتی اور اس خوفناک آزادی کی سلطنت میں قدم رکھ دیتی جہاں شرم وحیا، پابندیوں اور اخلاقیات کا وجود ہی نہیں ہوتا، وہ حقیر اور خوفناک آزادی جہاں ہر چیز کی اجازت ہوتی ہے، جہاں واحد طاقتورترین قوت آدمی کے دل میں دھڑکتا ہوا جنس کا جانور ہوتا ہے۔

اور میں جانتی ہوں کہ اگر میں وہ حد پار کر جاتی تو میں اپنا آپ نہ رہتی، کچھ اور بن جاتی، کیا؟ یہ میں نہیں جانتی، لیکن میں اس ہیبت ناک کایا کلپ سے خوفزدہ رہتی ہوں، اسی لیے میں محبت کی تلاش جاری رکھتی ہوں، شدومد سے جاری رکھتی ہوں، محبت جسے میں یوں گلے لگا پاؤں جیسے وہ میری ذات ہو، اپنے تمام پرانے خوابوں اور آدرشوں کے ساتھ، کیونکہ میں نہیں چاہتی میری زندگی بیچ سے ترخ جائے؛ میں چاہتی ہوں کہ یہ اوّل تا آخر یکجان رہے، اسی لیے تو جس روز تم ملے، تم نے میری جان ہی نکال کر رکھ دی، لڈوک، پیارے، پیارے لڈوک...

3

میرے اس کے دفتر میں پہلی مرتبہ جانے کا قصہ بڑا دلچسپ ہے، اس نے مجھ پر کوئی خاص تاثر نہیں چھوڑا تھا، میں نے جاتے ہی پہلے کام کی بات کی، اسے بتایا کہ اپنی اسٹوری کے لیے مجھے اس سے کس قسم کی مدد درکار ہے اور میں نے اس کی آخری صورت کو کیسے متصور کیا ہے، لیکن جب اس نے مجھ سے گفتگو شروع کی تو میں نے اچانک خود کو گڑبڑایا ہوا سا محسوس کیا، ایسا لگا جیسے میری زبان کھنچ سی گئی ہو اور میں بولنے کے قابل نہ رہی ہوں، اور جب اس نے دیکھا کہ میں کتنی بے آرامی محسوس کر رہی ہوں تو اس نے فوری طور پر باتوں کا رخ نسبتاً عمومی موضوعات کی جانب موڑ دیا، پوچھا کیا میں شادی شدہ ہوں، کیا میرے بچے ہیں، میں چھٹیاں کہاں گزارتی ہوں، مجھے بتایا کہ میں کتنی جوان لگتی ہوں، کتنی حسین، بڑا اچھا رہا تھا وہ میرے ساتھ، وہ چاہتا تھا کہ میں اسٹیج پر آنے کے اپنے خوف سے نکل آؤں، جب مجھے خود سے ملنے والے ان تمام شیخی خوروں کا خیال آتا ہے جو آپ کو بات کرنے ہی نہیں دیتے، لڈوک کے سامنے تو ان کا چراغ جل ہی نہیں سکتا، پاول تو سارا وقت اپنے متعلق گفتگو کر سکتا ہے، مگر یہ سب تھا بڑا مزے دار، کہ میں نے اس کے ساتھ پورا ایک گھنٹہ گزارا اور مجھے اس کے

انسٹی ٹیوٹ سے متعلق اتنا ہی پتا چل سکا جتنا اس وقت پتا تھا جب میں آئی تھی، گھر واپس آ کر میں نے کاغذ پر کچھ اتارنے کی کوشش کی، مگر کچھ صحیح نہیں لکھا گیا، شاید میں خوش تھی، اس چیز نے مجھے ایک بہانہ فراہم کیا کہ میں اسے فون کروں اور پوچھوں کہ اگر وہ ناراض نہ ہو تو میں نے جو کچھ لکھا ہے اسے پڑھ کر سناؤں۔ ہم ایک کیفے میں ملے، میں نے چار صفحات کی ایک بے کار محض اسٹوری لکھی تھی، اس نے اس کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا، ایک جرأت مندانہ مسکراہٹ سے میری جانب دیکھا اور کہا، اسٹوری زبردست ہے، اس نے شروع ہی سے یہ واضح کر دیا تھا کہ میں اس کے لیے بطور رپورٹر سے زیادہ بطور عورت دلچسپی کا باعث ہوں، مجھے نہیں پتا تھا میں اسے اپنی تعریف خیال کروں یا تذلیل، مگر وہ اتنا بااخلاق تھا، اور ہم نے ایک دوسرے کو سمجھ لیا، وہ ہمارے ان سر کھانے والے لوگوں کی طرح نہیں تھا جنھیں دیکھ کر ابکائی آ جاتی ہے، اس کے پس پشت ایک بھرپور زندگی تھی، اس نے کانوں میں بھی کام کر رکھا تھا، ایسے ہی لوگ ہیں جو مجھے پسند ہیں، میں نے اسے بتایا، مگر جس شے نے مجھے سب سے زیادہ پُرجوش کیا وہ یہ تھی کہ اس کا تعلق موراویا سے تھا، حتیٰ کہ وہ سمبالوم [7] آرکسٹرا میں بھی شامل رہا تھا۔ مجھے تو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا، لگتا تھا میں اپنی زندگی کا لائیت موتیف پھر سے سن رہی ہوں، اپنی جوانی کو پرچھائیوں میں سے واپس آتے دیکھ رہی ہوں، میرا دل اور میری روح جسم سے نکل کر اس کے ہو گئے۔

اس نے مجھ سے پوچھا میں نے دن بھر کیا کیا، اور جب میں نے اسے بتایا تو اس نے کہا، میں اب بھی اس کی آواز سن سکتی ہوں، کچھ مذاق اڑاتے ہوئے اور کچھ ہمدردانہ، ''تم جیسی ہستی کے لیے یہ کوئی زندگی نہیں۔ تبدیلی کا وقت آ گیا ہے،'' اس نے کہا کہ مجھے ایک نیا باب شروع کرنا چاہیے، زندگی کی خوشیوں کو زیادہ وقت دینا چاہیے، میں نے کہا، میں ایسے ہی ٹھیک ہوں، خوشی ہمیشہ سے میرے نصب العین کا حصہ رہی ہے اور ان دنوں جو غصہ اور جو بوریت ہے اس سے زیادہ میں کسی شے سے نفرت نہیں کرتی، اس نے کہا نصب العین کوئی چیز نہیں، وہ لوگ جو چھتوں پر سے چلا چلا کر خوشی کا اظہار کر رہے ہوتے ہیں اکثر سب سے زیادہ غمگین ہوتے ہیں، ہاں کتنی سچ بات کہی! میرا جی چاہا کہ رونے لگوں، اور پھر اس نے مجھے صاف صاف بتا دیا، زیادہ آئیں بائیں شائیں نہیں کرتا وہ، کہ وہ

---

[7] سمبالوم (cimbalom): ایرانی ساز سنتور کا ایک قدرے مختلف مغربی روپ۔

Scanned with CamScanner

اگلے روز چار بجے اسٹیشن کے سامنے مجھے لینے کے لیے موجود ہوگا، ہم مل کر قصبے سے باہر ڈرائیو پر جائیں گے۔ لیکن میں ایک شادی شدہ عورت ہوں، میں نے احتجاج کیا، میں ایسا تو نہیں کرسکتی کہ اٹھوں اور اٹھ کر ایک اجنبی مرد کے ساتھ جنگل کی راہ لوں، اور لڈوک نے ہنستے ہوئے جواب دیا کہ وہ کوئی مرد نہیں، ایک دانشور ہے، لیکن ایسا کہتے ہوئے وہ کتنا اداس نظر آیا تھا، کتنا اداس! اسے یوں دیکھنے پر میرا بھیتر تمتما اٹھا، کیسی خوشی تھی، وہ مجھے چاہتا تھا، وہ مجھے اور بھی زیادہ چاہنے لگا جب میں نے اسے بتایا کہ میں شادی شدہ ہوں، کیونکہ اس سے میں کچھ اور نا قابلِ حصول بن گئی تھی، اور مرد جسے رسائی سے باہر سمجھتے ہیں اس کی خواہش زیادہ کرتے ہیں، میں نے اس کے چہرے پر موجود تمام اداسی پڑھ لی اور جان لیا کہ وہ مجھ سے محبت کرنے لگا ہے۔

اگلے روز ہم نے دریائے ولتاوا کو اپنے ایک جانب شور کرتے ہوئے سنا اور دوسری طرف ایک جنگل کو یکا یک بلند ہوتے ہوئے دیکھا، یہ سب اتنا رومانٹک تھا! مجھے زندگی کا رومانٹک ہونا پسند ہے، مجھے یقین ہے کہ میں ایک بے وقوف نوجوان لڑکی کی طرح سوچ رہی تھی، جو ایک بارہ سالہ بچی کی ماں کے لیے کچھ ایسا مناسب نہیں تھا، مگر میں ایسا کرنے سے رہ بھی نہیں سکی، میں نے قہقہے لگائے، اچھلی کودی، اسے اپنی جانب کھینچ کھینچ لیا اور جب ہم رکے تو میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا، وہاں ہم کھڑے تھے، ایک دوسرے کے آمنے سامنے، اور لڈوک ذرا سا جھکا اور مجھے ایک پیارا سا بوسہ دیا، میں خود کو اس سے چھڑا کر نکل گئی لیکن پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر دوبارہ بھاگنے لگی، کبھی کبھی میرے دل کے ساتھ عجیب مشکل ہو جاتی ہے، ذرا سی کوئی بات ہو تو یہ زور زور سے دھڑکنا شروع ہو جاتا ہے، ذرا سی سیڑھیاں چڑھ لوں تو عجیب حالت ہو جاتی ہے، اس لیے میں نے اپنی رفتار کم کی اور اپنی سانسیں بحال کیں اور اچانک میں نے خود کو اپنے پسندیدہ گیت کے ابتدائی دو بول دہراتے ہوئے سنا:

ہمارے باغ پر سورج / تمازت سے چمکتا ہے

اور یہ دیکھتے ہوئے کہ اس کو یہ گیت یاد آ گیا ہے میں نے اسے زور زور سے گانا شروع کر دیا، بنا کسی شرم وحیا کے، اور مجھے محسوس ہوا کہ میرے برس، پریشانیاں، دکھ اور ہزار ہا سفید کھپرے میرے جسم سے اتر رہے ہیں، پھر ہمیں ایک چھوٹی سی سرائے نظر آئی اور ہم نے روٹی اور ساسیج تناول کیا، ہر چیز بڑی معمول کے مطابق اور سادہ تھی، پُر اعتماد بیرا، داغدار میز پوش، اور اس کے باوجود یہ سفر کیسا حیرت ناک

Scanned with CamScanner

تھا۔ میں نے لڈوِک سے کہا، پتا ہے میں شاہوں کی سواری پر ایک فیچر کرنے کو تین روز کے لیے موراویا جا رہی ہوں، اس نے پوچھا موراویا میں کہاں، اور جب میں نے اسے بتایا تو وہ بولا، وہی تو اس کا آبائی قصبہ ہے، ایک اور اتفاق! اس نے میری جان ہی تو نکال لی، میں کچھ وقت نکال کر تمھارے ساتھ جاؤں گا، وہ بولا۔

میں ڈر رہی تھی، مجھے پاول کا خیال آیا، امید کی اس چنگاری کا جو اس نے مجھ میں روشن کی تھی، میں اپنی شادی سے متعلق سنکی نہیں، میں اسے بچانے کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار ہوں، چاہے فقط ننھی زدینا ہی کی خاطر، نہیں، یہ سچ نہیں ہے، زیادہ تر خود اپنی ہی خاطر، ماضی کی خاطر، اپنی جوانی کی یاد میں، مگر مجھ میں لڈوِک کو نہ کہنے کی طاقت نہیں، مجھ میں طاقت ہی نہیں، اور اب تو پانسا کھیلا جا چکا ہے، زدینا سو رہی ہے، میں ڈر رہی ہوں، عین اس لمحے لڈوِک موراویا میں ہے، اور صبح جب میری بس وہاں داخل ہوگی، وہ میرا انتظار کر رہا ہوگا۔

حصہ سوم: لُڈوِک

1

ہاں، میں آوارہ گردی کرنے نکل کھڑا ہوا۔ ایک لمحے کے لیے میں موراوا پر بنے پل پر رکا اور نیچے بہتے ہوئے پانی کو دیکھا۔ کیسا بھدا دریا تھا (اور اتنا بھورا کہ پانی سے زیادہ لگتا تھا منحوس کیچڑ ہے)۔ اور اس کے کنارے کیسے مایوس کن تھے: پانچ یک منزلہ ٹھس عمارتوں پر مشتمل گلی، ہر عمارت ایسے کھڑی ہوئی جیسے کوئی عجیب و غریب یتیم۔ بظاہر انھیں ایک پُر شکوہ منڈلی کا مرکزہ ہونا تھا، مگر ہوا کچھ نہیں۔ دو عمارتیں مٹی کے بنے فرشتوں اور چھوٹی چھوٹی ابھرواں شبیہوں سے سجائی گئی تھیں۔ یہ بات کہنے کی ضرورت نہیں کہ وہ بڑی بری طرح کٹی پھٹی اور تڑخی ہوئی تھیں: فرشتے پروں سے محروم ہو چکے تھے اور ابھرواں شبیہیں، جو جگہ جگہ سے جھڑ کر اینٹوں تک محدود ہو گئی تھیں، اپنے معنی کھو چکی تھیں۔ یتیم عمارتوں سے پرے گلی لوہے کے کھمبوں اور ہائی ٹینشن تاروں کی ایک قطار میں تحلیل ہوتی گئی تھی۔ پھر گھاس تھی جس پر ہنسوں کی کچھ ٹکڑیاں بکھری ہوئی تھیں۔ اور آخر میں کھیت، بے افق کھیت ــــ کھیت جو پھیلتے

Scanned with CamScanner

پھیلتے نجانے کہاں جارہے تھے، کھیت جو موراوا کی منحوس بھوری کیچڑ کو چھپارہے تھے۔

قصبوں میں عین اپنے ہی عکس پیدا کرنے کا ایک رجحان ہوتا ہے اوراس منظر نے (میں اسے بچپن سے جانتا تھا اور اس کی میرے لیے کسی طور کوئی اہمیت نہیں تھی) اچانک مجھے اوستراوا (Ostrava) کی یاددلادی، اس عظیم الجثہ، بورڈنگ ہاؤس کے سے کان کنوں کے قصبے کی جس میں کئی خالی مکان تھے اور گندی سڑکیں جو کہیں نہیں جاتی تھیں۔ مجھے لگا جیسے میں کسی پھندے میں گرفتار ہوگیا ہوں، پل پر ایسے کھڑا ہوں جیسے مشین گن کی کسی آوارہ گولی کا ہدف۔ میں ان پانچ تنہا مکانوں پر مشتمل اس مقہور گلی کو مزید دیکھتے رہنا برداشت نہ کرسکا، کیونکہ میں اوستراوا کے بارے میں سوچنا برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ اس لیے میں نے اس سے پیٹھ موڑی اور اس سمت چلنا شروع کیا جس سمت سے دریا کا پانی آرہا تھا۔

میں دریا کے کنارے ایک تنگ راستے پر چلنے لگا جس کے ایک جانب پوپلر کے درختوں کی گھنی قطار تھی۔ راستے کے دائیں جانب گھاس اور جڑی بوٹیوں کا ایک آمیزہ پھسلتا پھسلتا پانی کی سطح تک چلا گیا تھا۔ اور دریا کے پار دوسرے کنارے پر گودام، ورکشاپیں اور کئی چھوٹی چھوٹی فیکٹریوں کے احاطے تھے؛ راستے کے بائیں جانب درختوں سے پرے کوڑے کا ڈھیر پھیلا ہوا تھا۔ مزید آگے کھلے کھیت تھے جن میں مزید دھاتی کھمبوں اور ہائی ٹینشن تاروں سے وقفے پڑتے تھے۔ راستے پر آگے بڑھتے ہوئے مجھے لگا جیسے میں پانی کی ایک وسیع سطح کو پیدل چلنے والوں کے پل پر سے عبور کررہا ہوں، اور اگر میں اس قطعے کا پانی کے ایک پھیلاؤ سے موازنہ کررہا ہوں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اوّل تو اسے دیکھ دیکھ کر میں کانپ رہا تھا اور دوسرے یہ کہ میں ہمہ وقت اس راستے سے باہر جا پڑنے کو تھا۔ میں خوب جانتا تھا کہ یہ بدلتا ہوا منظر استعارہ ہے اس سب کا جسے لوسی سے اپنی مڈبھیڑ کے بعد سے میں نے کوشش کی ہے کہ یاد نہ کروں۔ لگتا تھا میں اپنے اردگرد جو چیز بھی دیکھ رہا ہوں — کھیتوں، احاطوں اور گوداموں کی ویرانی، دریا کی سیاہی، اور ہر شے پر پڑی ہوئی اوس جو اس سارے منظر کو یک جان کررہی تھی — اس پر اپنی دبائی ہوئی یادیں منطبق کررہا ہوں۔ مگر میں سمجھتا تھا کہ میں ان یادوں سے پیچھا نہیں چھڑا سکتا؛ وہ میرے گردوپیش ہر جگہ موجود تھیں۔

Scanned with CamScanner

2

مجھے میرے پہلے بڑے سانحے کی طرف لے جانے والے واقعات کو (اور اس سانحے کی غیر ہمدردانہ مداخلت کے براہِ راست نتیجے کے طور پر میری لوسی سے ملاقات کا باعث بننے والے واقعات کو) ایک لاتعلقی بلکہ ہلکے پھلکے انداز میں بھی بیان کیا جاسکتا ہے۔ بات شروع ہوتی ہے میری احمقانہ مذاق سے مہلک رغبت اور مارکیٹا کی کسی قسم کے مذاق کو نہ سمجھ پانے کی ازلی صلاحیت سے۔ مارکیٹا ایسی عورتوں میں سے تھی جو ہر چیز کو سنجیدگی سے لیتی ہیں (اور اس شے نے اسے اُس دور کی روح سے مکمل طور پر ہم آہنگ کر دیا تھا)۔ مقدر سے اسے سب سے بڑا تحفہ خوش اعتقادی کے رجحان کا ملا تھا— اور میں خوش اعتقادی کا لفظ حماقت کے کسی نرم مترادف کے طور پر استعمال نہیں کر رہا؛ بالکل بھی نہیں۔ وہ اوسط حد تک ذہین تھی اور ویسے بھی بہت نوعمر تھی (انیس سال کی، سال اوّل کی طالبہ) اور اس لیے اس کا ہر ایک پر اعتبار کر لینے والا بھولپن کسی عیب کے بجائے ایک طلسم سا لگتا تھا، اور پھر اس کے ساتھ طبیعی نوعیت کے کچھ طلسم بھی تھے جن سے انکار نہیں کیا جاسکتا تھا۔ یونیورسٹی میں ہر کوئی اسے پسند کرتا تھا اور ہم میں سے ہر ایک نے اسے لبھانے کی کم و بیش سنجیدہ کوششیں کی تھیں، تاہم اس چیز نے ہمیں (کم از کم ہم میں سے چند کو) اس سے شریفانہ اور مکمل طور پر معصومانہ چھیڑ چھاڑ سے باز نہیں رکھا۔

تاہم اس قسم کی چھیڑ چھاڑ کا مارکیٹا پر کوئی اچھا اثر نہیں ہوتا تھا اور اس دور کی روح کا تو کہنا ہی کیا۔ وہ فروری 1948 کے بعد کا پہلا سال تھا۔ ایک نئی زندگی شروع ہوئی تھی— ایک واقعتاً نئی اور مختلف زندگی— اور اس کے نقوش (وہ تو میری یادداشت پر ثبت ہیں) ٹھوس اور پائیدار تھے۔ عجیب چیز یہ تھی کہ ان نقوش کی سنجیدگی نے چینِ جبیں کے بجائے ایک مسکراہٹ کی شکل اختیار کی تھی۔ یہ صحیح ہے، اُن برسوں نے دنیا کو بتایا کہ وہ درخشاں ترین برس ہیں، اور ہر اس شخص پر جو خوش ہونے میں ناکام رہتا تھا، فوری طور پر شبہ کیا جاتا کہ وہ کارکن طبقے کی فتح پر رنجیدہ ہے، یا یہ کہ (اور یہ امر بھی انتہائی مجرمانہ تھا) اپنے اندرونی دکھوں کو— انفرادیت پرستی کے تحت— راہ دے رہا ہے۔

نہ صرف یہ کہ مجھے میرے اندرونی دکھوں نے غیر متحرک نہیں کیا تھا بلکہ مجھے قدرت سے خوش مزاجی بھی کافی مقدار میں ودیعت ہوئی تھی۔ تاہم اس کے باوجود میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں ان دنوں

Scanned with CamScanner

کی خوش باش ظاہری ٹیپ ٹاپ کا خول خود پر چڑھائے رکھتا تھا؛ میری خوش مزاجی کی حس بڑی غیر سنجیدہ اور آزاد تھی۔ نہیں، اُن دنوں جس مسرت کا چلن تھا وہ طنز اور عملی مذاق سے محروم تھی۔ وہ، جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں، بڑی ہی سنجیدہ قسم کی مسرت تھی، فاتح طبقے کی خود ساختہ تاریخی رجائیت،[8] ایک باضابطہ اور راہبانہ مسرت: مختصر لفظوں میں مسرت، جلی حرفوں میں۔

مجھے یاد ہے کیسے ہم سب کو 'مطالعاتی گروپوں' میں منظم کیا جاتا جو اکثر تنقیدی اور خود تنقیدی اجلاس منعقد کرتے جو ہر رکن کے باضابطہ تجزیے پر اختتام پذیر ہوتے۔ اس دور کے ہر کمیونسٹ کی طرح میرے ذمے بھی بہت سے کام تھے (میں یونیورسٹی کے طلبا کی لیگ کے ایک اہم عہدے پر فائز تھا) اور چونکہ میں ایک اچھا طالب علم بھی تھا، اس لیے مجھے بڑی حد تک یہ آسرا تھا کہ میرا تجزیہ مثبت ہی کیا جاتا ہوگا۔ اگر ریاست سے میری وفاداری، میری محنتِ شاقہ اور میرے مارکسیت کے علم کی عوامی گواہیوں کے ہمراہ عموماً اس قسم کا کوئی تبصرہ بھی ہوتا کہ ''اس کے ہاں کچھ کچھ انفرادیت کے جراثیم ہیں،'' تو اس پر اپنے کان کھڑے کرنے کی میرے لیے کوئی وجہ نہ تھی، کیونکہ معمول یہی تھا کہ مثبت ترین تجزیوں میں بھی کوئی تنقیدی تبصرہ شامل کر دیا جاتا تھا— کسی شخص کو 'انقلابی نظریے میں دلچسپی کے فقدان' پر برا بھلا کہا جاتا تو کسی اور کو 'ذاتی تعلقات میں گرم جوشی کی کمی' پر؛ کسی کو 'احتیاط اور دیکھ ریکھ کے فقدان'' پر مطعون کیا جاتا تو کسی کو ''خواتین کا احترام نہ کرنے'' پر۔ لیکن جس لمحے اس قسم کا کوئی تبصرہ واحد زیرِ غور امر نہ رہ جاتا (یعنی اس میں کوئی اور امر شامل کر دیا جاتا، یا جب ہم کسی حملے یا شک شبے کا شکار ہوتے) تو یہی ''انفرادیت کے جراثیم'' اور ''خواتین کے احترام کا فقدان'' ہماری تباہی کے بیج بو سکتے تھے۔ اور ہم میں سے ہر ایک پارٹی ریکارڈ کی صورت میں اپنے قاتل جرثومے اپنے ساتھ لیے پھرتا تھا— جی ہاں، ہم میں سے ہر ایک۔

کبھی کبھی (حقیقی تشویش سے زیادہ کچھ رواروی میں) میں انفرادیت پسندی کے الزام کے خلاف اپنا دفاع کرتا، کہتا کہ میرے ساتھی مجھ پر ثابت کریں کہ میں ایک انفرادیت پسند کیونکر ہوں۔ کوئی ٹھوس ثبوت نہ پا کر وہ کہتے، ''کیونکہ تم اسی طرح کی حرکتیں کرتے ہو۔'' ''کیسی حرکتیں کرتا

---

[8] کنڈیرا نے اس فقرے "historical optimism of the victorious class" بمعنی ''فاتح طبقے کی تاریخی رجائیت'' میں ''پرولتاری طبقے کی تاریخی مادیت'' کو pun کا نشانہ بنایا ہے۔

ہوں؟'' ''تمھاری مسکراہٹ ذرا اَور طرح کی ہے۔'' ''تو کیا ہوا؟ میں اپنی مسرت کا اظہار اسی طریقے سے کرتا ہوں۔'' ''نہیں تم ایسے مسکراتے ہو جیسے اندر ہی اندر کچھ سوچ رہے ہو۔''

جب کامریڈوں نے میرے برتاؤ اور میری مسکراہٹ کو ''دانشورانہ'' (اُن دنوں کا ایک اور سخت طعن آمیز فقرہ!) قرار دیا تو میں نے واقعتاً ان پر یقین کرلیا۔ میں تصور نہیں کرسکتا تھا (مجھ میں یہ تصور کرنے جتنی طاقت نہیں تھی) کہ دوسرے تمام لوگ غلط ہو سکتے ہیں؛ کہ خود انقلاب، زمانے کی روح غلط ہو سکتے ہیں اور میں، ایک فرد، درست ہو سکتا ہوں۔ میں نے اپنی مسکراہٹوں پر نظر رکھنی شروع کردی اور جلد ہی میں نے محسوس کیا کہ میں جو شخص ہوں اور مجھے جو شخص ہونا چاہیے (زمانے کی روح کے مطابق) اور جیسا بننے کی کوشش میں کر رہا تھا، ان دو شخصیتوں کے درمیان ایک دراڑ سی ابھرنی شروع ہوگئی ہے۔

مگر حقیقی 'میں' کون تھا؟ مجھے بالکل دیانتداری سے کہنے دیجیے: میں ایک ایسا آدمی تھا جس کے کئی چہرے تھے۔

اور ان چہروں کی تعداد میں اضافہ ہوتا ہی چلا جا رہا تھا۔ گرمیوں سے ایک ماہ قبل میں نے مارکیٹا کے قریب ہونا شروع کیا (وہ اپنے سال اوّل کے اختتام کے قریب تھی اور میں سال دوم کے)، اور ہر بیس سالہ نوجوان کی طرح میں نے بھی اسے ایک مکھوٹا پہن کر اور (تجربے میں اور جذبے میں) اس سے بڑا ہونے کی اداکاری کر کے اسے متاثر کرنے کی کوشش کی۔ میں نے ایک لاتعلقی، ایک بے پروائی کی ردا اوڑھ لی؛ میں اسے یہ یقین دلانے کے درپے ہوا کہ میری کھال کی ایک اور تہہ بھی ہے، غیرمرئی تہہ، جس سے کوئی شے پار نہیں جا سکتی۔ میں نے سوچا (جس میں میں کافی حق بجانب تھا) کہ میں مذاق وذاق کر کے اپنی لاتعلقی کو قائم کرسکتا ہوں، اور اگرچہ میں اس معاملے میں ہمیشہ سے ماہر رہا تھا لیکن مارکیٹا پر میں جو حربے آزماتا تو وہ ہمیشہ زبردستی کے، مصنوعی اور تھکا دینے والے ہوا کرتے تھے۔

میرا حقیقی 'میں' کون تھا؟ میں صرف یہی دُہرا سکتا ہوں: میں ایک ایسا شخص تھا جس کے کئی چہرے تھے۔

اجلاسوں میں میں پُرخلوص، جوشیلا، عزمِ مصمم کا مالک نظر آتا؛ دوستوں میں اشتعال انگیز، پنگے

باز؛ مارکیٹا کے ساتھ سنکی اور پاگل پن کی حد تک حاضر جواب؛ اور تنہائی میں (اور مارکیٹا کو سوچتے ہوئے) اپنے بارے میں بے یقین اور اسکول کے لونڈوں کی طرح خوش باش اور پُر جوش۔

کیا یہ آخری چہرہ میرا اصلی چہرہ تھا؟

نہیں، یہ تمام چہرے اصلی تھے۔ میں منافق نہیں تھا جس کا ایک اصلی چہرہ ہوتا اور کئی نقلی چہرے۔ میرے کئی چہرے تھے، اس لیے کہ میں نوجوان تھا اور نہیں جانتا تھا کہ میں کون ہوں یا کیا بننا چاہتا ہوں۔ (میں ایک چہرے اور دوسرے چہرے کے درمیان نظر آنے والے فرق پر خوفزدہ ہو جاتا؛ ان میں سے کوئی چہرہ ایسا نہیں تھا جو مجھ پر بالکل درست آ جاتا، اور میں ان تمام چہروں کے درمیان عجیب طریقے سے اپنا راستہ تلاش کرنے کی کوشش کرتا رہتا۔)

محبت کی نفسیاتی اور عضویاتی میکانیات اتنی پیچیدہ ہے کہ زندگی میں ایک مرحلے پر کسی نوجوان شخص کو اپنی تمام توانائی اسی پر قابو پانے کے لیے صرف کرنا پڑتی ہے اور اکثر اس کی خواہشوں کا محور اس کی آنکھوں سے دور ہو جاتا ہے؛ یعنی وہ عورت جس سے وہ محبت کر رہا ہوتا ہے۔ (اس سلسلے میں وہ کسی نوجوان وائلن نواز کی طرح ہوتا ہے جو موسیقی کے کسی ٹکڑے کے جذباتی مافیہ پر توجہ مرکوز نہیں کر پاتا، تا آنکہ اس مافیہ کو بجانے کے لیے درکار تکنیک خود بخود اس کے پلے پڑ جاتی ہے۔) چونکہ میں نے مارکیٹا کے لیے اپنی اسکول کے لونڈوں والی رغبت کا تذکرہ کیا ہے تو میں نشاندہی کرتا چلوں کہ میں جو جوش و خروش محسوس کیا کرتا تھا، وہ میرے محبت میں مبتلا ہونے سے زیادہ اس بات سے ابھرا تھا کہ میں ایک عجیب انداز سے خود پر یقین کی کمی کا شکار تھا۔ اس شے کا مجھ پر بہت بار تھا اور اس کا میری سوچوں اور محسوسات پر اثر مارکیٹا سے کہیں زیادہ تھا۔

اپنی اس الجھن کا دباؤ کم کرنے کے لیے میں اپنی علمیت کا رعب جماتا پھرتا؛ مارکیٹا کے ساتھ ہر دستیاب موقعے پر اختلاف کرتا؛ اس کی ہر رائے کا مذاق اڑاتا۔ یہ سب کرنا اتنا مشکل نہیں تھا کیونکہ اپنی تمام تر ذہانت (اور خوبصورتی جو، ہر خوبصورتی کے مانند، نارسائی کا ایک ہالہ اپنے گرد رکھتی تھی) کے باوجود وہ بڑی معصوم اور ہر کسی پر اعتبار کر لینے والی لڑکی تھی۔ وہ طبعاً اس قابل نہیں تھی کہ کسی شے کے پس پشت کچھ دیکھ سکے؛ وہ بس اس شے کو ہی دیکھ پاتی تھی۔ نباتیات کے لیے اس کا دماغ قابل تعریف تھا، لیکن وہ کسی ساتھی طالب علم کے مذاق کو سمجھنے میں عموماً ناکام ہی رہتی تھی۔ وہ اس دور کے

جوش وخروش میں خود کو بہنے دیتی تھی مگر جب اسے کسی ایسے سیاسی عمل کا سامنا ہوتا جو اس اصول پر مبنی ہوتا کہ نتیجہ ان ذرائع کو حق بجانب بنا دیتا ہے جن سے وہ حاصل کیا گیا ہو، تو وہ اسی طرح ہونق ہو جاتی جیسے کسی مذاق پر۔ اسی لیے کامریڈوں نے فیصلہ کیا کہ اسے اپنی امنگوں کو انقلابی تحریک کی تدابیر اور حکمت عملی کے ٹھوس علم سے مضبوط بنانے کی ضرورت ہے اور اسے موسم گرما میں دو ہفتے کے پارٹی تربیتی سیشن میں شرکت کے لیے بھیج دیا۔

اس تربیتی سیشن نے میرے منصوبوں پر کلیتاً پانی پھیر دیا۔ یہی تو وہ دو ہفتے تھے جو میں نے مارکیٹا کے ساتھ پراگ میں اکیلے گزارنے کا منصوبہ بنایا تھا، اس امید کے ساتھ کہ اپنے تعلقات کو (جو اس وقت تک اکٹھے چہل قدمی، بحث مباحثوں اور چند بوسوں پر ہی مشتمل تھے) کوئی ٹھوس شکل دی جا سکے۔ اور چونکہ وہی دو ہفتے تھے جن میں مجھے کوئی اور کام نہ تھا (ان سے اگلے چار ہفتے مجھے طالب علموں کے زراعتی بریگیڈ کے ساتھ گزارنے تھے اور آخری دو ہفتے میں نے اپنی ماں کے ساتھ موراویا میں گزارنے کا وعدہ کر رکھا تھا) اس لیے جب مارکیٹا میرے محسوسات میں شریک ہونا تو ایک طرف، برہمی کے ذرا سے احساس کے اظہار میں بھی ناکام رہی؛ بلکہ مجھے یہ تک کہا کہ وہ اس سیشن کے لیے بہت مشتاق ہے، تو میں نے بھی ایک تکلیف دہ حسد کے ساتھ اپنے ردِعمل کا اظہار کیا۔

تربیتی سیشن سے (جو وسطی بوہیمیا کے قلعوں میں سے ایک میں منعقد ہو رہا تھا) اس نے مجھے ایک خط بھیجا جو صد فی صد مارکیٹا کا نمونہ تھا: اپنے اردگرد موجود ہر شے کے لیے پُرخلوص جوش وخروش سے بھرا ہوا۔ اس نے لکھا تھا کہ وہ سب کچھ اس کے لیے کتنا حیرت افزا ہے — صبح سویرے کی ورزشیں، بحث مباحثے، حتیٰ کہ وہ گیت جو وہ لوگ گاتے تھے۔ اس نے اس ''صحت مند ماحول'' کی تعریف کی جس کا وہاں دور دورہ تھا اور مستعدی سے اس امر کے غماز کچھ الفاظ بھی بڑھا دیے کہ مغرب میں انقلاب کی آمد اب زیادہ دور نہیں رہی۔

اس نے جو کچھ کہا تھا در حقیقت میں اس سے اتفاق کرتا تھا؛ مجھے تو یہ بھی یقین تھا کہ مغربی یورپ میں انقلاب ناگزیر ہے۔ صرف ایک شے تھی جسے میں قبول نہیں کر سکتا تھا: میری خواہش کے بالمقابل اس کا خوش باش اور خوشگوار موڈ۔ اس لیے میں نے ایک پوسٹ کارڈ خریدا اور (اسے تکلیف دینے، حیران کرنے اور الجھن میں مبتلا کرنے کے لیے) لکھا: ''رجائیت عوام کے لیے افیون ہے!

صحت مند ماحول سے حماقت کی بو آتی ہے۔ ٹراٹسکی[9] زندہ باد! لڈوک۔''

3

مارکیتا نے میرے اشتعال انگیز پوسٹ کارڈ کا جواب ایک مختصر اور سرسری سے رقعے سے دیا۔ گرمیوں کے دوران میں نے اسے جو دیگر خطوط لکھے ان کا اس نے جواب نہیں دیا۔ میں اپنے طالب علموں کے زراعتی بریگیڈ کے ہمراہ پہاڑیوں پر سوکھی گھاس جمع کر رہا تھا اور مارکیتا کی خاموشی میرے لیے بہت سخت تھی۔ میں تقریباً ہر روز اسے التجائیہ اور ماتمی قسم کی شیفتگی سے چھلکتے ہوئے خطوط لکھتا: کیا ہم موسم گرما کے آخری دو ہفتوں کے دوران ذرا ایک دوسرے سے مل نہیں سکتے؟ میں نے اس سے التجا کی۔ میں اپنے گھر کا سفر، اپنی غریب تنہا چھوڑ دی گئی ماں سے ملاقات کا سفر ترک کرنے کو تیار تھا۔ میں کسی بھی جگہ جانے پر آمادہ تھا، صرف مارکیتا کے ساتھ رہنے کے لیے؛ اور اس کا باعث یہی نہیں تھا کہ مجھے اس سے محبت تھی؛ ہر دوسری شے سے زیادہ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ میرے افق پر موجود واحد عورت تھی اور مجھے لڑکی کے بغیر لڑکا ہونے کی حالت ناقابل برداشت لگتی تھی۔ مگر مارکیتا نے میرے خطوں کا جواب نہیں دیا۔

مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ ہوا کیا ہے۔ میں اگست میں پراگ واپس پہنچا اور اسے اس کے گھر پکڑنے میں کامیاب ہو گیا۔ ہم نے دریائے ولتاوا کے کنارے اور شاہی سبزہ زار میں (جو پوپلر کے درختوں اور کھیل کے متروک میدانوں کا ایک افسردہ سا جزیرہ تھی) معمول کے مطابق چہل قدمی کی اور مارکیتا نے نہ صرف یہ دعویٰ کیا کہ ہمارے درمیان کچھ بھی تبدیل نہیں ہوا ہے بلکہ اس کی حرکات و

---

[9] لیون ٹراٹسکی (Leon Trotsky): یوکرین میں 1879 میں پیدا ہونے والا ٹراٹسکی بولشیوک انقلابی اور مارکسی نظریہ ساز تھا۔ سوویت یونین کے قیام کے بعد اولین برسوں میں وہ ایک بااثر سیاست دان تھا، لیکن 1920 کے عشرے میں جوزف اسٹالن کی پالیسیوں اور سوویت یونین کی بے تحاشا طاقت کے خلاف بائیں بازو کی ناکام مزاحمتی تحریک چلانے پر اسے پارٹی سے نکال کر جلاوطن کر دیا گیا۔ 1940 میں اسے میکسیکو میں ایک سوویت ایجنٹ نے قتل کر دیا۔ سوویت یونین اور مشرقی یوروپ میں کسی شخص پر ٹراٹسکی وادی (Trotskyite) ہونے کا الزام اس کے لیے خاصے سنگین نتائج کا حامل ہو سکتا تھا۔

Scanned with CamScanner

سکنات سے بھی یہی مترشح تھا۔ مشکل یہ تھی کہ ہر شے کا انتہائی جمود کے ساتھ اور یکساں طور پر اسی طرح کا ہونا (اسی طرح کا بوسہ، اسی طرح کی گفتگو، اسی طرح کی مسکراہٹ) میرے ہر قسم کے بھیانک خوف سے زیادہ مایوس کن ثابت ہو رہا تھا۔ جب میں نے اس سے پوچھا کہ کیا میں اگلے روز اس سے ملاقات کر سکتا ہوں تو اس نے مجھے کہا کہ تم مجھے فون کر لینا، ہم کوئی وقت مقرر کر لیں گے۔

میں نے فون کیا؛ ایک غیر متعارف خاتون کی آواز نے مجھے مطلع کیا کہ مارکیٹا پراگ سے جا چکی ہے۔

میں بہت ناخوش تھا، جیسا کہ بائیس برس کا کوئی نوجوان ہو سکتا ہے جسے کوئی عورت نصیب نہ ہو؛ ایک قدرے شرمیلا نوجوان جسے جسمانی محبت کے چند ہی تجربات ہوئے ہوں، چند تجربات، فوری نوعیت کے اور غیر روایتی انداز کے، اور جسے ہر وقت اسی کے خیال آتے رہتے ہوں۔ دن ناقابلِ برداشت حد تک طویل اور بے مصرف تھے۔ میں نہ پڑھ پاتا تھا نہ کام کر سکتا تھا۔ ایک روز میں دن میں تین مختلف فلمیں دیکھنے گیا جو ایک کے بعد ایک شروع ہوتی تھیں، صرف وقت گزارنے کے لیے، اس منحوس الو کی خوفناک چیخیں دبانے کے لیے جو میرے اندر کہیں بھوں بھوں کرتا پھرتا تھا۔ اگرچہ میری تھکا دینے والی پیش دستیوں کے سبب مارکیٹا مجھے کوئی تجربہ کار مرد سمجھتی تھی جو عورتوں کے تجربات سے چھلکا پڑتا ہو، مگر میں خود میں اتنی ہمت نہ پاتا تھا کہ سڑک پر چلتی ان لڑکیوں سے بات وات ہی کر لیتا جن کی خوبصورت ٹانگیں میرے دل کو درد سے بھر دیتی تھیں۔

اور اس لیے جب آخر کار ستمبر آ پہنچا تو میں بہت مسرور تھا۔ یہ مہینہ اپنے ساتھ کلاسیں اور (کلاسیں شروع ہونے سے کئی روز قبل) طلبا کی لیگ میں میرا کام لے کر آ رہا تھا۔ میرا ایک دفتر تھا، بالکل میرا، اور میرے پاس خود کو مصروف رکھنے کے لیے ہر قسم کی چیزیں تھیں۔ تاہم میرے واپس آنے کے روز مجھے ایک کال موصول ہوئی جس میں مجھے پارٹی کے ضلعی مرکز میں طلب کیا گیا تھا۔ اس لمحے کے بعد سے ہر چیز مجھے پوری تفصیل کے ساتھ یاد ہے۔ وہ ایک دھوپ بھرا دن تھا اور جب میں طلبا کی لیگ کی عمارت سے باہر آ رہا تھا تو مجھے وہ دکھ تحلیل ہوتا ہوا محسوس ہوا جو تمام موسمِ گرما مجھے تنگ کرتا رہا تھا۔ میں تجسس کے ایک خوشگوار احساس کے ساتھ چل پڑا۔ میں نے گھنٹی بجائی اور پارٹی کی یونیورسٹی کمیٹی کے چیئرمین نے دروازہ کھول کر مجھے اندر آنے دیا۔ وہ ایک دبلا پتلا طویل قامت نوجوان تھا

Scanned with CamScanner

جس کے بال خوبصورت تھے اور نیلی برف جیسی آنکھیں تھیں۔ میں نے اسے اُس دور کے پارٹی کے مروجہ انداز میں خوش باش کہا، ''مزدور کی خیر!'' لیکن جواب دینے کے بجائے اس نے کہا، ''سیدھے پیچھے چلے جاؤ، وہ تمھارا انتظار کر رہے ہیں۔'' آخری کمرے میں میں نے کمیٹی کے تین اور ارکان کو پایا۔ انھوں نے مجھے بیٹھ جانے کو کہا۔

ان کا پہلا سوال تھا کہ کیا میں مارکیٹا کو جانتا ہوں۔ انھوں نے پوچھا، کیا میری اس سے خط و کتابت رہی ہے؟ میں نے کہا، رہی ہے۔ انھوں نے پوچھا، کیا مجھے یاد ہے میں نے اسے کیا لکھا تھا؟ میں نے کہا، نہیں، لیکن فوراً ہی اشتعال انگیز متن کا حامل وہ پوسٹ کارڈ میری نگاہوں کے سامنے گھوم گیا اور مجھے کچھ کچھ اندازہ ہونے لگا کہ ہو کیا رہا ہے۔ کیا تم کچھ بھی یاد نہیں کر سکتے؟ انھوں نے پوچھا۔ نہیں، میں نے کہا۔ اچھا تو مارکیٹا تمھیں کیا لکھتی تھی؟ میں نے یہ تاثر دیتے ہوئے کاندھے اچکائے کہ وہ باہمی امور سے متعلق لکھا کرتی تھی جنھیں دوسروں کے سامنے زیر بحث لایا نہیں جا سکتا۔ کیا اس نے تربیتی نشست سے متعلق کچھ نہیں لکھا تھا؟ انھوں نے پوچھا۔ جی ہاں، میں نے کہا۔ کیا کہا تھا اس نے؟ یہی کہ اسے وہ بڑی پسند آ رہی ہے، میں نے جواب دیا۔ اور؟ اور یہ کہ بحثیں بڑی اچھی ہوتی ہیں، میں نے جواب دیا، اور اجتماعیت کا جذبہ بھی۔ کیا اس نے یہ ذکر کیا تھا کہ وہاں صحت مند ماحول کا دور دورہ ہے؟ جی ہاں، میں نے کہا، میرا خیال ہے اس نے اس قسم کی کوئی بات کی تھی۔ کیا اس نے تذکرہ کیا تھا کہ وہ رجائیت کی قوت کو دریافت کر رہی ہے؟ جی ہاں، میں نے کہا۔ اور تمھارا کیا خیال ہے رجائیت کے بارے میں؟ انھوں نے پوچھا۔ رجائیت؟ میں نے کہا، کچھ خاص نہیں۔ کیا تم خود کو رجائی خیال کرتے ہو؟ وہ پوچھتے گئے۔ بالکل کرتا ہوں، میں نے گڑبڑاتے ہوئے کہا۔ اچھا وقت گزارنا، اچھے قہقہے پسند ہیں مجھے، میں نے تفتیش کا لہجہ دھیما کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ایک عدمیت پرست (nihilist) کو بھی اچھے قہقہے پسند ہوتے ہیں، ان میں سے ایک نے کہا۔ وہ ہنستا ہے ان لوگوں پر جو تکلیف سہہ رہے ہوں۔ ایک سنکی کو بھی اچھے قہقہے پسند ہوتے ہیں، وہ بولتا گیا۔ کیا تمھارا خیال ہے کہ اشتراکیت رجائیت کے بغیر تعمیر کی جا سکتی ہے؟ ان میں سے ایک اور نے پوچھا۔ نہیں، میں نے کہا۔ پھر تو تم ہمارے اشتراکیت کی تعمیر کرنے کے مخالف ہوئے، تیسرے نے کہا۔ آپ کا کیا مطلب ہے؟ میں نے احتجاج کیا۔ کیونکہ تم یہ سمجھتے ہو کہ رجائیت عوام کے لیے افیون ہے، انھوں نے

اپنی جارحیت آگے بڑھاتے ہوے کہا۔ عوام کے لیے افیون؟ میں نے دفاعی انداز میں پوچھا۔ بات ٹالنے کی کوشش مت کرو، یہی تم نے لکھا تھا۔ مارکس نے مذہب کو عوام کے لیے افیون کہا تھا، اور تم سمجھتے ہو کہ ہماری رجائیت افیون ہے! یہی تم نے لکھا تھا مارکیتا کو۔ مجھے تو حیرت ہے کہ ہمارے کارکن، ہمارے حیرت زدہ کارکن، کیا کہیں گے جب انھیں معلوم ہوگا کہ وہ رجائیت جو انھیں منصوبے سے زائد کام کرنے پر ابھار رہی ہے، افیون ہے۔ اس پر ایک اور نے گرہ لگائی، ایک ٹراٹسکی وادی کے لیے اشتراکیت کی تعمیر کرنے والی رجائیت افیون سے زیادہ کچھ ہو بھی نہیں سکتی، اور تم ایک ٹراٹسکی وادی ہو۔ خدا کے لیے! آپ کو یہ خیال آیا بھی تو کیسے؟ میں نے احتجاج کیا۔ تم نے یہ لکھا تھا کہ نہیں لکھا تھا؟ میں نے اس قسم کی کوئی بات مذاقاً لکھی ہو تو لکھی ہو، لیکن یہ تو دو مہینے پہلے کی بات ہے، مجھے یاد نہیں رہا۔ ہمیں تمھاری یادداشت تازہ کرنے پر مسرت ہوگی، انھوں نے کہا اور میرے سامنے میرا پوسٹ کارڈ باآوازِ بلند دُہرایا: ''رجائیت عوام کے لیے افیون ہے! صحت مند ماحول سے حماقت کی بو آتی ہے۔ ٹراٹسکی زندہ باد! لڈوِک۔'' یہ لفظ اس چھوٹے سے پارٹی مرکز میں اتنے ہیبت ناک سنائی پڑے کہ خوف سے میری کھوپڑی گھوم ہی تو گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ ان لفظوں میں ایک تباہ کن قوت ہے جس کا میں مقابلہ نہیں کرسکتا۔ لیکن کامریڈز، یہ تو مذاق کی خاطر تھا، میں نے کہا، یہ جانتے ہوے کہ وہ میری بات پر غالباً اعتبار نہیں کر سکتے۔ کیا آپ کو ہنسی آرہی ہے؟ ایک کامریڈ نے دوسرے دو حضرات سے پوچھا۔ دونوں نے نفی میں سر ہلائے۔ اس کے لیے آپ کو مارکیتا کو جاننا پڑے گا، میں نے کہا۔ ہم جانتے ہیں، انھوں نے جواب دیا۔ تو پھر آپ کیوں نہیں سمجھتے؟ مارکیتا ہر بات کو سنجیدگی سے لیتی ہے۔ ہمارا ہر وقت اس سے مذاق چلتا رہتا ہے۔ اسے حیران کرنے کی کوشش کرتے ہیں ہم۔ بڑی دلچسپ بات ہے، ایک کامریڈ نے کہا۔ تمھارے دیگر خطوط سے اس بات کا کوئی اشارہ نہیں ملتا کہ تم مارکیتا کو سنجیدگی سے نہیں لیتے۔ آپ کا مطلب ہے آپ نے مارکیتا کے نام میرے تمام خطوط پڑھ لیے ہیں؟ تو مارکیتا کا مذاق اڑانے کی وجہ یہ ہے، ایک اور بولا، کہ وہ ہر چیز سنجیدگی سے لیتی ہے؟ اب بتاؤ ہمیں، کیا چیز ہے جسے وہ سنجیدگی سے لیتی ہے؟ کیا یہ چیزیں مثلاً پارٹی، رجائیت، نظم و ضبط ہیں؟ کیا یہ ایسی چیزیں ہیں جن کے نام پر تمھاری ہنسی چھوٹتی ہے؟ سمجھنے کی کوشش کریں کامریڈز، میں نے کہا۔ مجھے تو یاد بھی نہیں کہ میں نے یہ لکھا تھا۔ میں نے اسے جلدی میں لکھ دیا ہوگا۔ بس چند جملے ہی تھے، ایک

Scanned with CamScanner

مذاق، میں نے تو اس پر دوسری نظر بھی نہیں ڈالی۔ اگر یہ لکھنے میں میری کوئی بدنیتی شامل ہوتی تو میں اسے پارٹی کی تربیتی نشست میں تو نہ بھیجتا! تم نے کیسے لکھا، یہ بیکار کی بات ہے۔ تم نے اسے جلدی سے لکھا ہو یا دھیرے دھیرے، گود میں رکھ کر لکھا ہو یا ڈیسک پر، تم وہی کچھ لکھ سکتے تھے جو کچھ تمھارے اندر تھا— صرف وہی، اور کچھ نہیں۔ اگر تم نے اس پر غور کیا ہوتا تو تم اسے نہ لکھتے۔ لیکن اب بات یہ ہے کہ تم نے جو کچھ محسوس کیا وہ لکھ دیا۔ اور بات یہ ہے کہ ہم اب جانتے ہیں کہ تم کون ہو۔ ہمیں پتا چل گیا ہے کہ تمھارے دو چہرے ہیں— ایک پارٹی کے لیے، دوسرا باقی دنیا کے لیے۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے پاس دلائل ختم ہو گئے ہیں اور میں پرانے والے دلائل پر ہی زور دیے چلا جا رہا ہوں: یہ کہ میں نے تو صرف مذاق کیا تھا، یہ کہ وہ لفظ تو بے معنی تھے، یہ کہ اس وقت میرا موڈ ہی کچھ ایسا تھا، وغیرہ وغیرہ۔ میں مکمل طور پر ناکام رہا۔ انھوں نے کہا کہ میں جو کچھ کہنا چاہ رہا تھا وہ میں نے ایک کھلے پوسٹ کارڈ پر لکھا تھا، اور وہاں سب نے اسے دیکھا ہے، اور میرے لفظوں کی ایک معروضی اہمیت ہے جس کی وضاحت یہ کہہ کر نہیں کی جا سکتی کہ جی میرا موڈ ہی اس وقت ایسا تھا۔ پھر انھوں نے مجھ سے پوچھا، ٹراٹسکی کو کتنا پڑھا ہے؟ بالکل نہیں پڑھا، میں نے کہا۔ انھوں نے مجھ سے پوچھا، کتابیں کون دیتا تھا تمھیں؟ کوئی نہیں، میں نے کہا۔ انھوں نے پوچھا، اور کن کن ٹراٹسکی وادیوں سے تمھاری ملاقات ہوئی ہے؟ کسی سے نہیں، میں نے کہا۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ وہ مجھے طلبا کی لیگ کے عہدے سے سبکدوش کر رہے ہیں اور یہ فیصلہ فوری طور پر نافذ العمل ہوگا، اور کہا کہ میں اپنے دفتر کی چابیاں انھیں دے دوں۔ میں نے چابیاں اپنی جیب سے باہر نکالیں اور ان کے حوالے کر دیں۔ پھر انھوں نے مجھ سے کہا کہ میرا کیس پارٹی کی سطح پر طے کیا جائے گا اور اسے شعبۂ سائنسی علوم کی پارٹی انتظامیہ حل کرے گی۔ وہ کھڑے ہوئے اور میرے آر پار دیکھا۔ میں نے کہا، ''مزدور کی خیر!'' اور باہر نکل آیا۔

مجھے بعد میں یاد آیا کہ لیگ کے دفتر میں میری بہت سی چیزیں ہیں۔ میری ڈیسک کی دراز میں میرے موزے اور ذاتی کاغذات رکھے تھے اور میری الماری میں میری ذاتی دستاویزات کے ساتھ میری ماں کے اون میں بنا، ادھ کھایا رم کیک بھی تھا۔ اگرچہ میں نے اپنی چابیاں پارٹی کے مرکز کے حوالے کر دی تھیں لیکن نچلی منزل کا چوکیدار مجھے جانتا تھا۔ اس نے مجھے دفتر کی چابی دے دی جو دوسری

چابیوں کے ساتھ لکڑی کی تختی پر لٹکی ہوئی تھی۔ مجھے ہر شے آخری تفصیل تک یاد ہے؛ چابی ایک مضبوط تار کے ساتھ ایک چھوٹی سی تختی پر لٹکی ہوئی تھی اور اس پر میرے دفتر کا نمبر سفید رنگ سے لکھا ہوا تھا۔ میں نے دروازہ کھولا اور اپنی ڈیسک کے سامنے بیٹھ گیا۔ میں نے دراز کھولی اور اپنی چیزیں باہر نکالیں۔ میں بڑا سست رفتار اور غائب دماغ سا ہو رہا تھا۔ نسبتاً سکون کے اس چھوٹے سے وقفے میں میں کوشش کر رہا تھا کہ جو کچھ میرے ساتھ ہو چکا ہے، اسے سمجھوں اور یہ سوچوں کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔

زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ دروازہ کھلا اور پارٹی مرکز والے تین کامریڈ اندر داخل ہو گئے۔ اس مرتبہ ان کا انداز کم گوئی اور ضبط کا حامل نہیں تھا؛ اس مرتبہ ان کی آوازیں اونچی اور جارحانہ تھیں، خصوصاً ان تین میں سے سب سے چھوٹے والے کی، جو پارٹی کارکنوں کا افسر انچارج تھا۔ میں یہاں آیا کیسے؟ وہ میری جانب لپکا۔ کیا حق تھا مجھے یہاں آنے کا؟ کیا میں یہ چاہتا ہوں کہ مجھے پولیس کی نگرانی میں وہاں سے نکلوایا جائے؟ میں ڈیسک میں کیا کرتا پھر رہا ہوں؟ میں نے اسے بتایا کہ میں اپنا رم کیک اور موزے لینے آیا تھا۔ اس نے کہا کہ اگر میرے موزے یہاں ہر طرف بکھرے ہوئے بھی ہوتے تب بھی مجھے وہاں آنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ پھر وہ ڈیسک تک آیا اور ہر ہر کاغذ کا جائزہ لیا، ہر ہر نوٹ بک کو ٹٹولا۔ چونکہ وہ واقعی میری ذاتی چیزیں تھیں، لہٰذا اس نے آخرکار مجھے اجازت دے دی کہ انھیں سوٹ کیس میں ڈال لوں، جبکہ اس دوران وہ نگرانی کرتا رہا۔ میں نے انھیں اپنے گندے اور مڑے تڑے موزوں کے ساتھ ہی ٹھونس دیا۔ پھر ایک چکنے سے کاغذ میں جو الماری میں پڑا پڑا کٹ پھٹ گیا تھا، کسی طرح رم کیک کو بھی گھسیڑنے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ میری ایک ایک حرکت کا جائزہ لیتا رہا اور جب میں نکلا تو اس کے الوداعی لفظ یہ تھے: دوبارہ کبھی یہاں اپنی شکل مت دکھانا۔

جیسے ہی میں ضلعی مرکز کے کامریڈوں کے سحر سے، ان کی تفتیش کی ناقابلِ شکست منطق سے باہر نکلا، مجھے محسوس ہوا کہ میں بے گناہ ہوں، کہ میں نے جو کچھ کہا تھا اس میں کوئی ایسی ہیبت ناک بات نہیں، کہ میرے لیے سب سے بہتر کام یہ ہوگا کہ کسی ایسے آدمی سے بات کروں جو مارکیتا کو اچھی طرح جانتا ہو، جسے میں اعتماد میں لے سکوں، جو مجھے یہ بتا سکے کہ یہ سارا چکر ہی لایعنی ہے۔ میں نے ایک ہم مکتب دوست ڈھونڈا، ایک کمیونسٹ کو، اور جب میں اسے تمام داستان شروع سے آخر تک سنا چکا تو اس نے کہا کہ ضلعی مرکز کٹر اور حسِ مزاح سے عاری ہونے کے لیے معروف ہے اور وہ مارکیتا کو

جاننے کے باعث اس بات کا واضح ادراک رکھتا ہے کہ سارا معاملہ ہے کیا۔ بہر حال وہ شخص جس سے مجھے ملاقات کرنا چاہیے، زمانیک ہے۔ وہ سائنسی علوم کے شعبے کا پارٹی چیئر مین بننے والا تھا اور مجھے اور مارکیٹا دونوں کو اچھی طرح جانتا تھا۔

4

مجھے بالکل پتا نہیں تھا کہ زمانیک کو پارٹی چیئر مین منتخب کیا گیا ہے اور مجھے اس میں اپنی خوش قسمتی دکھائی دی: نہ صرف یہ کہ میں اسے اچھی طرح جانتا تھا، بلکہ مجھے اعتماد تھا کہ وہ مجھ سے ہمدردی کرے گا، اور کسی وجہ سے نہیں تو میرے موراویائی پس منظر ہی کی وجہ سے، کیونکہ زمانیک موراویائی لوک گیت گانا پسند کرتا تھا اور اُن دنوں لوک گیتوں کو اسکول کے بچوں کی سی آواز کے بجائے کھردری آواز میں اور ایک بازو اوپر کر کے گانے کا بڑا چلن تھا، یعنی 'عوامی آدمی' کے روپ میں جو رقص کے فرش کے آس پاس ہی پیدا ہوا ہو۔

سائنسی علوم کے شعبے کے واحد اصلی موراویائی ہونے کے باعث مجھے کئی استحقاق بھی حاصل تھے۔ ہر خاص موقعے پر، اجلاسوں میں، جشن میں، یکم مئی کو، ہر موقعے پر مجھے اپنا کلارنیٹ پکڑ کر اپنے دو یا تین غیر پیشہ ور ہم مکتبوں کے ساتھ کسی فوری طور پر بنائی گئی موراویائی سنگت میں شامل ہو جانے کو کہا جاتا۔ ہم تینوں سنگتی گزشتہ دو برس کی یومِ مئی کی پریڈ میں مارچ کر چکے تھے اور زمانیک، جو دیکھنے میں خوبصورت تھا اور توجہ کا مرکز رہنا پسند کرتا تھا، کہیں سے ایک لوک پوشاک منگوا کر ہمارے ساتھ شامل ہوا تھا۔ اس نے رقص کیا، اور اپنی بانہیں ہوا میں لہراتے ہوئے گانے گائے۔ اگرچہ وہ پراگ میں پیدا ہوا اور پروان چڑھا تھا اور اس نے موراویا کی سرزمین پر پاؤں بھی نہیں دھرا تھا، پھر بھی وہ دہقانی عاشق کا کردار ادا کر کے خوش ہوتا تھا، اور میں اسے پسند کیے بنا رہ نہیں سکا۔ مجھے خوشی تھی کہ وہ علاقہ جہاں میں پلا بڑھا، روزِ ازل سے لوک فن کی ایک جنت، وہاں کی موسیقی اتنی ہر دلعزیز ہے، اتنی پسند کی جا رہی ہے۔

ایک اور فائدہ یہ تھا کہ زمانیک مارکیٹا کو جانتا تھا۔ ہم تینوں اکثر طلبا کی تقریبوں میں اکٹھے شریک ہوتے۔ ایک موقعے پر (جب ہمارا ایک بڑا سا گروہ وہاں تھا) میں نے چیک پہاڑیوں پر بسنے

والے بونے قبائلیوں سے متعلق ایک کہانی گھڑی اور اس کی سند ایک مبینہ تحقیقی مقالے میں درج مقولات کے حوالے سے فراہم کی جو اسی موضوع پر تحریر کیا گیا تھا۔ مارکیتا حیران رہ گئی کہ اس نے تو ان کے بارے میں سنا ہی نہیں تھا۔ یہ حیرت کی کوئی بات نہیں، میں نے کہا، بورژوا محققین نے جان بوجھ کر ان کی موجودگی کو چھپائے رکھا تھا کیونکہ انھیں سرمایہ پرست لوگ غلام بنا کر خریدتے اور بیچتے تھے۔

لیکن کسی کو یہ بات سامنے تو لانی چاہیے! مارکیتا نے چلاّ کر کہا۔ کوئی اس بارے میں لکھتا کیوں نہیں؟ یہ تو سرمایہ داری نظام کے خلاف ایک زبردست کیس بنے گا۔

شاید کوئی اس لیے اس کے بارے میں نہیں لکھتا، میں نے متفکرانہ لہجے میں کہا، کہ یہ سارا معاملہ ہے بڑا نازک۔ پتا ہے ان بونوں میں محبت کے عمل کی حیرت انگیز صلاحیت پائی جاتی ہے اور اسی لیے ان کی طلب اتنی زیادہ ہے اور اسی لیے ہماری جمہوریہ اسے زرِنقد کے بدلے برآمد کرتی تھی، خصوصاً فرانس کو جہاں کی بڑھتی ہوئی عمر کی خواتین انھیں گھریلو ملازم کے طور پر رکھ لیتی تھیں، اگرچہ ظاہر ہے وہ انھیں بالکل دیگر مقاصد کے لیے استعمال کرتیں۔

باقی لوگ دبی دبی ہنسی ہنسنے لگے جو میری اختراع کی ذہانت سے زیادہ مارکیتا کے متوجہ ہونے کے ڈھنگ کا، اس کے کسی بھی ہاتھ آئے ہوئے معاملے کی حمایت (یا مخالفت) کرنے کے جنون کا نتیجہ تھی۔ وہ اپنے ہونٹ کاٹ رہے تھے کہ کہیں مارکیتا کے ایک نئی چیز کو جاننے کے لطف کو غارت نہ کر بیٹھیں، اور ان میں سے چند (خصوصاً زمانیک) اس بحث میں شامل ہوئے اور بونوں سے متعلق میرے بیان کی تصدیق کی۔

جب مارکیتا نے پوچھا کہ وہ لگتے کیسے ہیں، تو مجھے یاد ہے زمانیک نے اسے اپنے سپاٹ چہرے کے ساتھ بتایا کہ پروفیسر چچورا، جسے مارکیتا اور وہاں موجود سنگت کو تواتر سے لیکچر ہال کے پوڈیم پر دیکھنے کا اعزاز حاصل تھا، بونوں کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ امکان غالب ہے کہ نجیب الطرفین ہیں، لیکن یہ بات تو بالکل یقینی ہے کہ ایک جانب سے تو ضرور ہی اس قبیلے کے ہیں۔ زمانیک نے دعویٰ کیا کہ اسے یہ بات چچورا کے معاون سے معلوم ہوئی جس نے ایک موسم گرما اسی ہوٹل میں گزارا تھا جہاں پروفیسر اور ان کی بیگم موجود تھیں اور جس نے یہ تصدیق کی تھی کہ وہ دونوں ملا کر بھی دس فٹ کے نہیں بنتے تھے۔ ایک صبح اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ سو رہے ہیں تو وہ ان کے کمرے میں داخل ہوا

Scanned with CamScanner

اور یہ دیکھ کر حیران ہو گیا کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ نہیں بلکہ ایسے سوئے ہوئے ہیں کہ ایک کا سر دوسرے کے پیروں سے جڑا ہے۔ پروفیسر چچورا بستر کے زیریں حصے پر گمڑی مارے دراز تھے جب کہ بیگم چچورا بالائی حصے پر۔

جی ہاں! میں نے تصدیق کرنے کے لیے کہا۔ پھر تو یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ چچورا اوران کی بیگم دونوں بونوں کی نسل سے ہیں، کیونکہ سر سے پاؤں جوڑ کر سونا اس علاقے کے تمام بونوں کی نسلی روایت ہے اور گئے دنوں میں وہ اپنے جھونپڑے بیضوی یا چوکور کے بجائے زمین کے لمبوترے اور مستطیل قطعوں کی صورت میں بناتے تھے، کیونکہ نہ صرف میاں بیوی بلکہ قبیلے کے تمام ارکان لمبی زنجیروں کی شکل میں سویا کرتے، ایک دوسرے کے نیچے۔

اپنی اس من گھڑت داستان کو یاد کرتے ہوئے اس روزِ سیاہ میں بھی مجھے امید کی ایک ہلکی سی کرن دکھائی دیتی ہوئی محسوس ہوئی۔ زمانیک، جس کا حکم میرے معاملے میں سب سے اولیٰ ہونا تھا، مارکیٹا کو بھی جانتا تھا اور میری حسِ مزاح کو بھی۔ وہ سمجھ جائے گا کہ پوسٹ کارڈ اس لڑکی کو بس ایک ذرا سا اشتعال دلانے کی احمقانہ کوشش کے سوا کچھ نہیں تھا جسے ہم سب پسند کرتے تھے اور جس کو (شاید اسی وجہ سے) اڑنگیاں دینے میں ہمیں لطف آتا تھا۔ سو پہلی فرصت میں میں نے اسے اپنی بدقسمتی کی ساری داستان جا سنائی۔ اس نے بڑی توجہ سے سنا، وہ سارا وقت تیوری پر بل ڈالے رہا اور پھر بولا کہ وہ دیکھے گا اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہے۔

اس دوران میں ایک معطل شدہ زندگی جی رہا تھا؛ پہلے کی طرح لیکچروں میں شرکت کرتا اور انتظار کرتا رہا۔ مجھے پارٹی کے کئی کمیشنوں کے روبرو بلایا گیا جن کا کام یہ طے کرنا تھا کہ میں کسی ٹراٹسکی وادی گروہ سے تعلق رکھتا ہوں یا نہیں؛ میں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ مجھے خفیف سا بھی اندازہ نہیں کہ ٹراٹسکی کا موقف کیا تھا؛ میں اپنے تفتیش کاروں کی آنکھوں سے آنکھیں ملا کر بات کرتا؛ مجھے تلاش تھی اعتبار کی، اور جب کبھی مجھے یہ نظر آتا، میں اس کی دید کو ایک لمبے عرصے تک اپنے ساتھ لیے لیے پھرتا، اسے پالتا پوستا اور بڑے تحمل سے کوشش کرتا کہ اس سے امید کی کوئی کرن روشن کر سکوں۔

مارکیٹا نے مجھ سے گریز کرنا جاری رکھا۔ مجھے احساس ہو گیا کہ اس کی وجہ وہی پوسٹ کارڈ

Scanned with CamScanner

ہے، اور میں اتنا مغرور اور حساس تھا کہ اس سے کسی شے کی بابت پوچھ بھی نہیں سکتا تھا۔ پھر ایک روز اس نے خود مجھے یونیورسٹی کی ایک راہداری میں روکا اور کہا، ''میں تم سے ایک چیز کے بارے میں بات کرنا چاہتی ہوں۔''

اس طرح چند مہینوں کے تعطل کے بعد ہم نے دوبارہ اپنی وہی چہل قدمی کی۔ اس وقت تک خزاں آچکی تھی اور ہم دونوں نے ٹرنچ کوٹ زیب تن کر رکھے تھے — جی ہاں بہت لمبے، گھٹنوں سے بھی نیچے جاتے ہوئے، جیسا کہ ان ناشستہ ذوق والے دنوں میں رواج تھا۔ بوندا باندی ہو رہی تھی اور کناروں پر لگے درخت بے برگ و بار اور سیاہ ہو چکے تھے۔ مارکیٹا نے مجھے بتایا کہ یہ سارا معاملہ وجود میں کیسے آیا۔ وہ تربیتی نشست میں ہی تھی کہ اسے انچارج کامریڈوں نے طلب کیا اور پوچھا کہ کیا وہ کسی قسم کے خط وصول کرتی رہی ہے۔ اس نے کہا، ہاں۔ کس کی طرف سے؟ انھوں نے پوچھا۔ اس نے کہا، اس کی ماں نے اسے خط لکھے ہیں۔ کوئی اور؟ ہاں ایک دوست کبھی کبھار لکھ بھیجتا ہے، اس نے کہا۔ کیا تم اس کا نام ہمیں بتا سکتی ہو؟ انھوں نے پوچھا۔ اس نے انھیں میرا نام بتا دیا۔ اور کامریڈ جان لکھتا کن چیزوں سے متعلق ہے؟ اس نے اپنے کندھے اچکا دیے، کیونکہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ میرے کارڈ کی تحریر دُہرائے۔ کیا تم اسے جواب بھی دیتی ہو؟ انھوں نے پوچھا۔ دیتی ہوں، اس نے کہا۔ تم کیا لکھتی ہو؟ انھوں نے پوچھا۔ بس، زیادہ کچھ نہیں، تربیتی نشست سے متعلق، اسی طرح کی چیزیں۔ کیا تم نشستوں سے لطف اندوز ہو رہی ہو؟ انھوں نے اس سے پوچھا۔ جی ہاں بالکل، میں تو عاشق ہوں ان کی، اس نے جواب دیا۔ اور اس نے کیا ردِعمل ظاہر کیا تھا اس پر؟ وہ بولتے گئے۔ اس کا ردِعمل؟ اس لڑکی نے ایک مختصر وقفے کے بعد پوچھا۔ بات یہ ہے کہ وہ ذرا مختلف سا ہے۔ آپ اسے جانتے نہیں نا۔ ہم جانتے ہیں اسے، انھوں نے کہا، اور ہم یہ جاننا چاہیں گے کہ اس نے کیا لکھا۔ کیا تم ہمیں اس کا کارڈ دکھا سکتی ہو؟

''تمھیں مجھ پر تو غصہ نہیں ہے، ہے نا؟'' مارکیٹا نے کہا۔ ''مجھے وہ انھیں دکھانا ہی پڑا۔''

''تمھیں معذرت خواہی کی کوئی ضرورت نہیں،'' میں نے کہا۔ ''وہ تم سے بات کرنے سے پہلے ہی اس کے متعلق سب کچھ جانتے تھے، ورنہ وہ تمھیں طلب ہی نہ کرتے۔''

''میں معذرت طلب نہیں کر رہی،'' اس نے احتجاج کیا، ''اور مجھے ان کو کارڈ دینے پر بھی کوئی

شرمندگی نہیں۔ میرے کہنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔ تم پارٹی کے رکن ہو اور پارٹی کو یہ جاننے کا حق ہے کہ تم آخر ہو کون اور سوچتے کیا ہو۔'' میں نے جو کچھ لکھا تھا اسے پڑھ کر اسے حیرت اور صدمہ ہوا تھا، اس نے مجھے بتایا۔ آخر سب لوگ جانتے نہیں تھے کہ ٹراٹسکی ہر اس چیز کا سب سے بڑا دشمن ہے جس کے لیے ہم جدوجہد کر رہے تھے، جس کے لیے ہم جنگ کر رہے تھے؟

میں کیا کہہ سکتا تھا؟ میں نے اسے کہا کہ بتائے اس کے بعد کیا ہوا۔

اس کے بعد انھوں نے کارڈ پڑھا اور ششدر رہ گئے۔ انھوں نے اس سے پوچھا کہ اس کا اس کے بارے میں کیا خیال ہے۔ اس نے کہا، یہ ذلت آمیز ہے۔ انھوں نے اس سے پوچھا کہ وہ خود اسے ان کے پاس لے کر کیوں نہیں آئی۔ اس نے کندھے اچکا دیے۔ انھوں نے اس سے پوچھا، کیا وہ جانتی ہے کہ نظر رکھنے اور احتیاط کرنے سے کیا مراد ہے؟ اس نے اپنا سر جھکا دیا۔ انھوں نے اس سے پوچھا، کیا وہ جانتی ہے پارٹی کے دشمن کتنے ہیں؟ اس نے کہا، ہاں وہ جانتی ہے مگر کبھی اس کا یقین نہیں کر سکتی کہ کامریڈ جان... انھوں نے اس سے پوچھا، وہ مجھے کتنی اچھی طرح جانتی ہے؟ انھوں نے اس سے پوچھا، میں لگتا کیسا ہوں؟ اس نے کہا، میں کچھ مختلف ہوں۔ میں ایک کٹر کمیونسٹ تو ہوں مگر وہ وقت بھی آتے ہیں جب میں ایسی چیزیں سامنے لاتا ہوں جنھیں کہنے سے کسی کمیونسٹ کا کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ انھوں نے اس سے کہا، کوئی مثال دے۔ اس نے کہا، وہ کوئی خاص چیز تو یاد نہیں کر پا رہی مگر یہ کہ میرے نزدیک کوئی بھی چیز مقدس نہیں۔ انھوں نے کہا، یہ تو میرے پوسٹ کارڈ سے ظاہر ہی ہے۔ اس نے انھیں بتایا کہ ہماری اکثر چیزوں پر بحث ہوتی اور میں اجلاس میں ایک چیز کہتا اور جب اس کے ساتھ ہوتا تو دوسری۔ اجلاس میں میں جوش و جذبے سے بھرپور ہوتا جبکہ اس کی ہمراہی میں ہر شے کا مذاق اڑاتا اور ہر چیز کو مضحکہ خیز بنا ڈالتا۔ انھوں نے اس سے پوچھا، کیا مجھ جیسا شخص پارٹی کی رکنیت کا حقدار ہے؟ اس نے کندھے اچکا دیے۔ انھوں نے اس سے پوچھا، کیا پارٹی اشتراکیت کی تعمیر کی حوصلہ افزائی کر سکتی ہے جب اس کے ارکان یہ دعوے کرتے پھر رہے ہوں کہ رجائیت عوام کے لیے افیون ہے؟ اس نے کہا، نہیں، اس طرح تو اشتراکیت کی تعمیر کبھی نہیں ہو سکے گی۔ وہ دیکھنا چاہتے تھے کہ میں اسے اور کیا کیا لکھتا ہوں۔ اس نے انھیں بتایا کہ وہ مجھ سے مزید ملاقات نہیں کرنا چاہتی۔ انھوں نے جواب دیا کہ یہ اس کی غلطی ہوگی اور اسے چاہیے کہ مجھے خط لکھتی رہے تاکہ وہ

Scanned with CamScanner

میرے متعلق مزید جانکاری حاصل کرسکیں۔

اور پھر تم نے انھیں میرے خطوط دکھا دیے؟ میں نے مارکیتا سے پوچھا اور اپنی رومانوی خرافات کا خیال آنے پر میرا چہرہ سرخ ہوگیا۔

''اور کیا کرسکتی تھی میں؟'' مارکیتا نے کہا۔ ''لیکن جو کچھ ہوا اس کے بعد میں تمھیں خط لکھنا جاری نہیں رکھ سکتی تھی۔ میں صرف اس مقصد سے خط نہیں لکھ سکتی تھی کہ تمھارے لیے پھندا تیار کروں۔ اس لیے میں نے تمھیں صرف ایک اور کارڈ بھیجا اور یہ سلسلہ بند کردیا۔ میں تمھیں ملنا جو نہیں چاہ رہی تھی اس کی وجہ یہ تھی۔ مجھ سے یہ توقع کی گئی تھی کہ تمھیں کچھ نہ بتاؤں، اور مجھے ڈر تھا کہ تم مجھ سے پوچھو گے اور پھر مجھے تمھارے منھ پر جھوٹ بولنا پڑے گا۔ مجھے جھوٹ بولنا پسند نہیں۔''

میں نے مارکیتا سے پوچھا، آج کس بات نے اسے مجھ سے ملنے کے لیے ابھارا ہے؟

اس نے کہا، کامریڈ زمانیک نے۔ وہ اسے یونیورسٹی کی راہداری میں ملا تھا اور اسے ایک چھوٹے سے کیبن نما کمرے میں لے گیا تھا جہاں شعبۂ سائنسی علوم کی پارٹی انتظامیہ کا دفتر واقع تھا۔ اس نے اسے بتایا کہ اس نے سنا ہے میں نے اسے کوئی پوسٹ کارڈ بھیجا تھا جس پر کوئی پارٹی مخالف بیانات درج تھے۔ اس نے پوچھا، وہ کیا تھے؟ اس نے بتادیا۔ اس نے پوچھا کہ اس کا ان کے بارے میں کیا خیال ہے۔ اس نے کہا، وہ ان کی مذمت کرتی ہے۔ اس نے اسے بتایا کہ اسے یہی کرنا چاہیے، اور پوچھا کہ کیا وہ اب بھی مجھ سے مل رہی ہے۔ وہ پریشان ہوگئی اور اس نے اس سوال کو نظرانداز کردینا چاہا۔ اس نے اسے بتایا کہ شعبے کو تربیتی نشست والوں کی جانب سے اس کے بارے میں بڑی مثبت رپورٹ ملی ہے اور پارٹی انتظامیہ اسی پر (مارکیتا پر) انحصار کررہی ہے۔ اس نے کہا کہ اسے یہ سن کر مسرت ہوئی۔ اس نے اسے بتایا کہ وہ اس کے نجی معاملات میں دخل دینا نہیں چاہتا لیکن جہاں تک اس کا خیال ہے آدمی اپنی سنگت سے جانا جاتا ہے، اور یہ کہ میں اس کے لیے کوئی بہت اچھی سنگت نہیں ہوں۔

اس کے بعد سے کئی ہفتے تک، اس نے مجھے بتایا، اس کے لفظ اس کے کانوں میں گونجتے رہے۔ چونکہ ہم ایک دوسرے سے ملنا مہینوں پہلے ترک کرچکے تھے، اس لیے زمانیک کی فہمائش بنیادی طور پر غیرضروری تھی۔ تاہم اسی فہمائش کے باعث اس نے یہ سوچنا شروع کردیا کہ کیا یہ ظالمانہ

Scanned with CamScanner

اور اخلاقی لحاظ سے ناقابل قبول امر نہیں کہ ایک شخص کو محض اس لیے اپنی دوستی توڑنے پر مجبور کیا جائے کہ اس کا دوست ایک غلطی کر بیٹھا ہے، اور کیا خود اس کے لیے یہ بات غیر منصفانہ نہیں کہ مجھ سے دوستی توڑ دے۔ وہ تربیتی نشست چلانے والے کامریڈ کے پاس گئی اور اس سے پوچھا کہ کیا اس پر مجھ سے پوسٹ کارڈ والے واقعے کی بابت بات کرنا ابھی تک ممنوع ہے۔ اور یہ جان کر اب رازداری کی کوئی وجہ نہیں رہ گئی، اس نے مجھے روکا اور بات کرنے کا موقع طلب کیا۔

اس کے بعد اس نے مجھے ان چیزوں کے بارے میں اعتماد میں لیا جو اسے پریشان کر رہی تھیں، اسے تکلیف دے رہی تھیں۔ ہاں، اس نے مجھ سے مزید نہ ملنے کا فیصلہ کر کے برا کیا تھا؛ کوئی شخص کیسی ہی بڑی غلطی کر لے وہ ہر لحاظ سے تباہ نہیں ہوتا۔ اسے سوویت فلم ''کورٹ آف آنر'' یاد آئی (جو اُن دنوں پارٹی حلقوں میں بے حد مقبول تھی) جس میں ایک سوویت طبی محقق اپنی دریافت کو اپنے ملک سے پہلے دوسرے ملکوں کے سامنے پیش کر دیتا ہے — ایک ایسا کام جو غداری کی سرحدوں کو چھوتا ہے۔ وہ خصوصاً فلم کے اختتام سے متاثر ہوئی تھی: اگرچہ سائنس دان کو آخر میں اس کے ساتھیوں پر مشتمل کورٹ آف آنر کی جانب سے معتوب کر دیا جاتا ہے، اس کی بیوی اس کا ساتھ نہیں چھوڑتی۔ وہ اپنی پوری کوشش کرتی ہے کہ اس کے اندر وہ طاقت بھر دے کہ وہ اپنی انتہائی غیر معمولی غلطی کا کفارہ ادا کر پائے۔

''تو تم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ تم مجھے نہیں چھوڑو گی؟'' میں نے کہا۔

''ہاں،'' مارکیٹا، میرا ہاتھ تھامتے ہوئے بولی۔

''لیکن مجھے بتاؤ مارکیٹا، کیا تم واقعی یہ سمجھتی ہو کہ میں نے کوئی بڑا جرم کیا ہے؟''

''ہاں بالکل،'' مارکیٹا نے کہا۔

''اور کیا تم سمجھتی ہو کہ مجھے پارٹی میں رہنے کا حق ہے؟ ہے یا نہیں؟''

''نہیں، لڈوک، میں نہیں سمجھتی۔''

میں سمجھ گیا کہ اگر میں اس کھیل میں داخل ہو جاؤں جسے مارکیٹا حقیقت سمجھ رہی ہے (اور یہ کہ مارکیٹا جس قدر اچھائی کے قابل تھی، اتنی کر رہی تھی) تو میں وہ سب کچھ حاصل کر لوں گا جسے پانے کے لیے میں نے مہینوں بے سود کوشش کی ہے۔ مکتی پانے کے جذبے سے قوت یاب، جیسے کوئی دُخانی کشتی

Scanned with CamScanner

بھاپ سے قوت یاب ہوتی ہے، وہ خود کو میرے حوالے کر دینے کے لیے تیار تھی، جسم اور روح سمیت؛ واحد شرط یہ تھی کہ اس کی روح اطمینان پا جائے۔ اس کے لیے اس کی مکتی کے معروض کو (جو، افسوس، میں خود تھا) اپنا بھرپور اور داخلی ترین قصور ماننا پڑتا، اور یہ وہ چیز تھی جسے کرنے کے لیے میں رضامند نہیں تھا۔ میں اس کے جسم کے، طویل عرصے سے مطلوب مقصد سے منٹوں ہی کے فاصلے پر تھا، لیکن اسے اس قیمت پر قبول نہیں کر سکتا تھا۔ میں وہ قصور نہیں مان سکتا تھا جو مجھے محسوس ہی نہ ہوتا تھا۔ میں ایک ناقابلِ برداشت فیصلے کو حق بجانب نہیں سمجھ سکتا تھا۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ کسی کو، بالفرض میری قریبی ہستی کو، وہ قصور مانتے ہوئے، اس فیصلے کو تسلیم کرتے ہوئے سنوں۔

میں مارکیٹا کے چکر میں نہیں آیا اور میں نے اسے کھو دیا۔ لیکن کیا یہ حقیقت ہے کہ میں خود کو بالکل بے قصور سمجھتا تھا؟ میں خود کو اس تمام معاملے کے لایعنی پن کا یقین دلاتا رہتا، ظاہر ہے، لیکن ایسا کرتے ہوئے بھی (اور اب ہم پہنچتے ہیں اس شے کے نزدیک جو اَب، پیچھے مڑ کر دیکھتے ہوئے، مجھے سب سے زیادہ پریشان کن اور سب سے زیادہ انکشاف انگیز معلوم ہوتی ہے) میں نے پوسٹ کارڈ پر موجود تین جملوں کو اپنے تفتیش کاروں کی آنکھوں سے دیکھنا شروع کر دیا۔ میں نے ان کے اس خوف کو محسوس کرنا شروع کیا کہ میرے مزاح کے پردے کے پیچھے کوئی سنجیدہ شے واقعی گھوم رہی ہے، کہ میں پارٹی کے جسم میں پوری طرح کبھی ضم نہیں ہوا تھا، کہ میں کبھی ایک سچا پرولتاری انقلابی نہیں رہا، کہ میں ایک سادہ سے (!) فیصلے کی بنا پر ''انقلابیوں سے جا ملا تھا۔'' (ہم محسوس کرتے تھے کہ پرولتاری انقلابی تحریک میں شمولیت، کیا کہنا چاہیے، انتخاب کا معاملہ نہیں، اہمیت کا معاملہ تھا۔ ایک شخص یا تو انقلابی ہوتا، اور اس صورت میں تحریک میں مکمل طور پر مدغم ہو کر ایک اجتماعی ہستی بن جاتا، یا انقلابی نہیں ہوتا تھا اور انقلابی بننے کی توقع بھی نہیں کر سکتا تھا اور یوں انقلابی نہ ہونے کا گناہ مسلسل محسوس کرتا رہتا۔)

اپنی اس وقت کی حالت کو پیچھے مڑ کر دیکھتے ہوئے مجھے مطابقت کے طور پر عیسائیت کی وہ عظیم قوت یاد آتی ہے جو کسی اہلِ ایمان سے اس کے بنیادی اور نا مختتم قصور کو تسلیم کرا لیتی ہے۔ چونکہ میں (ہم سب دوسروں کی طرح) انقلاب اور اس کی پارٹی کے سامنے مستقل طور پر سرِ تسلیم خم کیے ہوئے کھڑا تھا، اس لیے میں آہستہ آہستہ اس خیال کو تسلیم کرتا گیا کہ میرے لفظ، اگرچہ درحقیقت ان کا مقصد مذاق تھا، فی الواقع کسی قسم کی خلاف ورزی تھے، اور تنقیدِ ذات کے مجروح کرنے والے جھونکے

میرے دماغ میں جھکڑ چلانے لگے۔ میں نے خود کو بتایا کہ یہ محض حادثہ نہیں تھا کہ وہ خیالات میرے دماغ میں آئے، کہ کامریڈوں نے مجھے بہت عرصہ پہلے میری ''انفرادیت پرستی کی علامات'' اور ''دانشورانہ رجحانات'' پر مطعون کیا تھا (کتنے درست تھے وہ!)۔ میں نے خود سے کہا کہ میں اپنی تعلیم، یونیورسٹی میں اپنے مقام اور دانشور طبقے کے رکن کی حیثیت سے اپنے مستقبل کو دیکھتے ہوئے خوش فہمی میں مبتلا ہو گیا تھا، کہ میرا باپ — ایک مزدور جو جنگ کے دوران تعزیری کیمپ میں مر گیا — میرے سنکی پن کو کبھی نہ سمجھ پاتا۔ میں نے خود کو مطعون کیا کہ میں نے اپنے اندر اس کی مزدور والی ذہنیت کو مر جانے دیا۔ میں نے خود کو ہر ممکن بہانے سے مطعون کیا اور بالآخر کسی نہ کسی قسم کی سزا کی ضرورت کو قبول کر لیا۔ ایک چیز کی میں نے مزاحمت کی، فقط ایک ہی چیز کی: پارٹی سے بے دخلی اور اس سزا سے ہی منسلک، 'دشمن' کا رتبہ پانے کی۔ ہر وہ شے جس کی خاطر میں اپنے بچپن کے اوائل سے اب تک جدوجہد کر رہا تھا اور جس سے میں اب بھی جڑا ہوا تھا، اس کے جانے مانے دشمن کی حیثیت سے زندہ رہنا مجھے ناقابلِ برداشت حد تک مایوس کن محسوس ہوتا تھا۔

یہ تھی وہ تنقیدِ ذات (اور رحم کی اپیل) جو میں نے اپنے سامنے سیکڑوں مرتبہ اور مختلف کمیٹیوں اور کمیشنوں کے روبرو کم از کم دس مرتبہ دُہرائی، اور بالآخر شعبہء سائنسی علوم کے افتتاحی اجلاس میں، جہاں زمانیک نے ابتدائی خطبہ دیا (بڑا ہی موثر، شاندار اور ناقابلِ فراموش خطبہ) اور اپنے کمیشن کی جانب سے سفارش کی کہ مجھے پارٹی سے نکال دیا جائے۔ یہ بحث اور اس کے بعد سب کے سامنے میرا خود کو قصور وار ٹھہرانا بڑے ٹھوس طریقے سے میرے خلاف گیا؛ میرے حق میں کوئی نہ بولا اور وہاں موجود ہر شخص (اور وہاں اس وقت تقریباً ایک سو لوگ تھے، میرے اساتذہ اور میرے قریب ترین دوستوں سمیت) وہاں ان میں سے ایک ایک شخص نے ہاتھ اٹھا کر نہ صرف پارٹی سے میری بے دخلی کی تائید کی بلکہ (اور یہ میرے لیے مکمل طور پر حیران کن تھا) مجھے یونیورسٹی سے نکالنے کی بھی منظوری دی۔

اس رات میں نے موراویا، اپنے آبائی گھر جانے کے لیے ریل گاڑی پکڑی۔ وہاں مجھے کوئی سکون نہ ملا؛ کئی روز تک کوشش کے باوجود میں خود میں یہ ہمت پیدا نہ کر سکا کہ یہ خبر اپنی ماں کو سنا دوں، جو میری تعلیم پر بہت فخر کرتی تھی۔ لیکن میرے آنے کے ایک روز بعد یاروسلاو، میرا اسکول کے زمانے

کا دوست جو میرے ساتھ سمبالوم آرکسٹرا میں ساز بجایا کرتا تھا، میرے گھر آیا اور مجھے قصبے میں پا کر بہت خوش ہوا۔ پتا یہ چلا کہ دو روز بعد اس کی شادی ہے اور اس نے فوری طور پر مجھ سے کہا کہ میں اس کا شہ بالا بن جاؤں۔ چونکہ میں ایک پرانے دوست کے سامنے انکار نہیں کر سکتا تھا اس لیے میں نے خود کو اپنا زوال شادی کی ایک تقریب کے ذریعے مناتے ہوئے پایا۔

اور اس سب سے بڑھ کر یہ کہ یاروسلاو اپنی جڑوں تک ایک موراویائی محبِ وطن اور مقامی روایات کا ماہر تھا اور لوک روایات سے اپنے بے انتہا لگاؤ کے باعث اپنی شادی کو روایتی رسومات کا شوکیس بنانے چلا تھا — سمبالوم سنگت، 'بادشاہ' اور اس کی پھولدار تقریریں، دلہن کو دہلیز تک لے جانے کی رسم، ملبوسات اور اس پورے دن کو بھرنے کے لیے دیگر تفاصیل جو سب زندہ یادداشت کے بجائے علم بشریات کی کسی درسی کتاب سے اخذ کردہ تھیں۔ ایک چیز البتہ مجھے کھٹکی: یاروسلاو، جو گیت گانے اور رقص کرنے والی نئی اور ابھرتی ہوئی سنگت کا سربراہ تھا، تمام پرانی رسموں سے جڑا ہوا تھا، لیکن (غالباً اپنے کیریئر کا خیال کرتے ہوئے اور اُن دنوں کے ملحدانہ نعروں کے احترام میں) اس نے گرجے کو پرے ہی رکھا تھا، اگرچہ ایک روایتی بیاہ کا کسی پادری اور خدا کی برکت کے بغیر تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس نے بادشاہ کو تمام رسمی تقریریں کرنے دیں مگر ان میں سے بائبل کے تمام حوالے نکلوا دیے، اگرچہ یہ بائبل ہی کا تمثالیہ تھا جس نے اسے اس کی بیوی سے باندھا تھا۔ وہ دکھ جو مجھے اس نشے میں چور شادی کی دعوت میں شرکت سے روکے ہوئے تھا، یہ دیکھ کر انگیخت ہو گیا کہ ان لوک رسومات کے صاف پانی میں کیسا کلوروفام گھلتا جا رہا ہے۔ اور جب یاروسلاو نے مجھ سے کہا (ان دنوں کو جذباتی طور پر یاد دلاتے ہوئے جب میں سنگت میں اس کے ساتھ ساز بجاتا تھا) کہ ایک کلارنیٹ پکڑوں اور دوسرے سنگت کرنے والوں کے ساتھ بیٹھ جاؤں تو میں نے انکار کر دیا۔ میں نے اچانک خود کو یومِ مئی کی آخری دو پریڈوں میں پراگ میں جمے موراویائی نژاد زمانیک کے ساتھ ساز بجاتے دیکھا، زمانیک جو گا رہا تھا، رقص کر رہا تھا اور میرے ساتھ ساتھ باہیں ہلا رہا تھا، اور میرا وہ ساز اٹھانے کو جی نہ کر سکا۔ اچانک لوک گیتوں کی اس تمام چرچراہٹ سے مجھے گھن آنے لگی، میری طبیعت مالش کرنے لگی۔

5

اپنی تعلیم جاری رکھنے کا حق کھو دینے کے بعد میں لازمی فوجی سروس ملتوی کرنے کے حق سے بھی محروم ہو چکا تھا اور مجھے یقین تھا کہ مجھے اسی خزاں میں حکم نامہ موصول ہو جائے گا۔ درمیانی وقت پورا کرنے کے لیے میں نے دو ورک بریگیڈز میں اپنا نام درج کرا دیا؛ ایک کے تحت گوتوالدوو (Gothwaldov) میں سڑکوں کی مرمت کی جاتی تھی اور دوسری کے تحت گرمیوں کے اختتام کے قریب پھلوں کے ایک پراسیسنگ پلانٹ میں موسمی مزدوری میں مدد دینا تھی۔ لیکن خزاں بالآخر آئی اور ایک صبح (جب میں ریل گاڑی میں ایک بے خواب رات کے بعد تھک چکا تھا) میں اوستراوا کے بھدے، غیر معروف اور مرکزی راستوں سے پرے واقع ضلع میں حاضر ہو گیا۔

میں ایک صحن میں اپنی یونٹ کے دوسرے نوجوان رنگروٹوں کے ہمراہ کھڑا تھا۔ یہ سب اجنبی تھے۔ اوّل اوّل کی اجنبیت کی اداسی میں جو چیز نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے، وہ کھردرا پن اور مختلف ہونے کا احساس ہوتا ہے، اور ہم سب کے لیے بھی ایسا ہی تھا۔ اگر کوئی انسانی تعلق ہمیں جوڑے ہوئے تھا تو وہ تھا ہمارا غیر یقینی مستقبل، اور وہاں ظن وتخمین کی بہتات تھی۔ کچھ لوگ یہ دعویٰ کر رہے تھے کہ انھیں سیاہ نشان جاری کیا جانے والا ہے جبکہ دوسرے اس کی تردید کرتے پھر رہے تھے۔ کچھ اور لوگ بھی تھے جنھیں اس چیز کا پتا ہی نہ تھا۔ میں اس کا مطلب خوب اچھی طرح سمجھتا تھا اور ایسے کسی امکان پر ہیبت زدہ تھا۔

پھر ایک سارجنٹ اور آیا اور ہمیں بیرکوں میں سے ایک کی طرف لے گیا۔ ہم سب ایک صحن میں داخل ہوئے اور پھر صحن کے ساتھ واقع ایک بڑے سے کمرے میں جس کی دیواروں پر ہر طرف بڑے بڑے پوسٹر، فوٹو گراف اور زمانہ قدیم کی ڈرائنگز ٹنگی ہوئی تھیں۔ تعمیرات میں کام آنے والے کاغذ کے حرفوں سے سرخ رنگ میں ایک جملہ لکھا تھا: ''ہم اشتراکیت کی تعمیر کر رہے ہیں''، جس نے دیوار کے زیادہ تر حصے کو چھپا رکھا تھا اور جس کے باعث اس جملے کے نیچے ہی ایک کرسی کے ساتھ کھڑا، سوکھے ہوئے چہرے کا ایک بوڑھا آدمی بونا نظر آ رہا تھا۔ سارجنٹ نے ہم میں سے ایک شخص کی طرف اشارہ کیا اور اسے کہا کہ وہ جا کر کرسی پر بیٹھ جائے۔ بوڑھے آدمی نے اس لڑکے کی گردن کے گرد ایک سفید کپڑا باندھ دیا، کرسی کے ایک پائے کے ساتھ کھڑے بریف کیس میں ہاتھ ڈال کر ٹٹولا،

Scanned with CamScanner

ایک برقی بال تراش آلہ کھینچ کر باہر نکالا اور اسے لڑکے کے بالوں میں ڈال دیا۔

وہ نائی تھا اور اب اس کی کرسی ایک ایسی پیداواری لکیر کا افتتاح کر چکی تھی جو ہمیں سپاہیوں میں تبدیل کر دیتی تھی۔ اپنے بالوں سے محروم کیے جانے کے بعد ہمیں جلدی سے اگلے کمرے میں بھیج دیا گیا، جہاں ہمیں اپنی جلد پر موجود تمام کپڑے اتارنے کے بعد انھیں ایک کاغذی تھیلے میں لپیٹ کر رکھنے، انھیں ایک رسی سے باندھنے اور پھر ایک کھڑکی سے کسی کے حوالے کرنے کو کہا گیا۔ اس چھنائی کے بعد ہم برہنہ ایک ہال کو پار کرتے ہوئے ایک اور کمرے میں داخل ہوئے جہاں ہمیں شبینہ قمیصیں جاری کی گئیں۔ یہ شبینہ قمیصیں پہن کر ہم اگلے دروازے میں داخل ہوئے جہاں ہم نے اپنے فوجی بوٹ حاصل کیے۔ بوٹوں اور شبینہ قمیصوں میں ملبوس ہم صحن سے مارچ کرتے ہوئے ایک اور بیرک میں گئے جہاں ہمیں قمیصیں، زیر جامے، پیروں پر لپیٹنے کی پٹیاں، ایک بیلٹ اور ایک یونیفارم (جس پر مجرم بٹالین کا نشانِ سیاہ بھی موجود تھا) فراہم کیے گئے۔ اور آخرکار ہم آخری بیرک کی طرف آئے جہاں ایک نان کمیشنڈ افسر نے ہمارے نام دُہرائے، ہمیں اسکواڈوں میں تقسیم کیا اور ہمیں کمرے اور دیواروں سے لگے سونے کے تختے تفویض کیے۔

اس روز ایک مرتبہ پھر ہماری قطاریں لگوائی گئیں۔ ہم رات کے کھانے کو اور پھر بستر کو گئے۔ صبح ہمیں جگایا گیا اور باہر کانوں کی جانب، اور پھر ایک کان کے سرے پر لے جایا گیا۔ ہمیں اسکواڈوں کے لحاظ سے مزدور گروپوں میں تقسیم کیا گیا اور اوزار دیے گئے (ڈرل، کرچھا اور ایک لیمپ) جنھیں استعمال کرنا ہم میں سے کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ پھر ایک پنجرے کے ذریعے ہمیں زیرزمین پہنچا دیا گیا۔ جب ہم وہاں سے اپنے درد زدہ جسموں کے ساتھ باہر نکلے تو باہر منتظر کھڑے نان کمیشنڈ افسروں نے ہمیں جمع کیا اور مارچ کراتے ہوئے بیرکوں کی جانب لے گئے۔ دوپہر کے کھانے کے بعد ہم ڈرل کرنے گئے۔ اور ڈرل کے بعد ہماری سیاسی تعلیم، لازمی گانے بجانے اور اپنی کٹ کے دھونے دھلانے کا سلسلہ شروع ہوا۔ ہمارا واحد تخلیہ ایک کمرہ تھا جس میں بیس بنک (bunks) تھے۔ اور یہ سلسلہ دن بدن یوں ہی چلتا چلا گیا۔

ان ابتدائی ایام کے دوران انفرادیت شکنی کا یہ دھندلا سایہ مجھے بالکل غیر شفاف محسوس ہوتا تھا۔ وہ غیر شخصی احکامات جن پر ہم عملدرآمد کرتے تھے انھوں نے ہمارے لیے تمام انسانی محسوسات کی

جگہ لے لی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ غیر شفافیت محض ایک اضافی چیز تھی، کیونکہ یہ نہ صرف اس صورتِ حال سے پھوٹی تھی بلکہ اس کی ابتدا ہماری اس مشکل سے بھی ہوئی تھی جو ہمیں اپنی آنکھوں کی اپنے سامنے موجود مناظر سے مطابقت پیدا کرنے میں پیش آ رہی تھی (یہ ایسا ہی تھا جیسے کوئی دن کی وسیع و عریض روشنی سے کسی اندھیرے کمرے میں داخل ہو جائے)۔ وقت کے ساتھ ساتھ ہماری نظر بہتر ہو گئی اور ہم آدم زادوں میں موجود انسانوں کو دیکھنے کے قابل ہو گئے ہر چند کہ یہ نظارہ ہم نے ایک دھندلے سائے میں ہی سے دیکھا تھا۔ مجھے یہ اعتراف کرنا ہوگا کہ میں ان آخری لوگوں میں سے تھا جو اپنے اندر ضروری تبدیلیاں اور مطابقتیں پیدا کر سکے۔

وجہ یہ تھی کہ میرے پورے وجود نے اپنی تقدیر کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ سیاہ نشان یافتہ سپاہی — وہ سپاہی جن کی تقدیر میری تقدیر جیسی تھی — صرف نہایت ہی رسمی سی ڈرل کرتے تھے اور انھیں اسلحہ بھی نہیں دیا جاتا تھا۔ ان کا بنیادی کام کانوں میں کام کرنا تھا۔ انھیں اپنے اس کام کے پیسے دیے جاتے تھے (اور اس لحاظ سے وہ دوسرے سپاہیوں سے بہتر ہی تھے) لیکن میں نے یہ دیکھا کہ یہ ایک معمولی سا دلاسا ہی تھا، کیونکہ کچھ بھی ہو، یہ سپاہی مکمل طور پر ان عناصر پر مشتمل تھے جن پر اشتراکی جمہوریہ اسلحہ دینے کا اعتماد نہیں کر سکتی تھی اور انھیں اپنا دشمن گردانتی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ان سے بڑی رُکھائی کا برتاؤ کیا جاتا اور انھیں اس خطرے کے ساتھ زندگی گزارنا پڑتی تھی کہ ان کی اس خدمت کا عرصہ دو سال کی لازمی میعاد سے بڑھایا بھی جا سکتا ہے۔ لیکن جس شے سے مجھے سب سے زیادہ ہول آتا تھا وہ یہ تھی کہ مجھ پر زندگی بھر کے لیے ایک داغ لگا دیا گیا ہے اور مجھے (بیک جنبشِ قلم، بڑے طے شدہ اور محکم انداز میں اور میرے اپنے کامریڈز کے ہاتھوں) ان لوگوں کے درمیان رہنے کی ذلت سہنے پر مجبور کر دیا گیا ہے جنھیں میں اپنا جیتا جاگتا دشمن سمجھتا تھا۔ میں نے ان سیاہ نشان یافتہ سپاہیوں کے درمیان اپنے ابتدائی ایام ایک سخت نظریات رکھنے والے گوشہ گیر سنیاسی کی طرح گزارے اور اپنے دشمنوں سے دوستیاں پیدا کرنے سے اور ان کے لیے اپنے آپ کو ذرا سا بھی تبدیل کرنے سے مکمل طور پر احتراز کیا۔ اُن دنوں باہر نکلنے کے اجازت نامے بڑی مشکل سے ملا کرتے تھے (کسی سپاہی کو یہ اجازت نامہ حاصل کرنے کا حق حاصل نہ تھا؛ یہ اسے صرف ایک احسان کی صورت ملا کرتا تھا اور اس کا مقصد صرف یہ ہوا کرتا تھا کہ اسے ہر دو ہفتے بعد ایک مرتبہ، سنیچر کے روز،

Scanned with CamScanner

باہر نکالا جاتا تھا) لیکن اس وقت بھی جب یہ سپاہی لڑکیوں کی خاطر شراب خوانوں پر دھاوا بولنے کے لیے گروہوں کی صورت چھوڑ دیے جاتے، میں اپنی تنہائی کو ہی فوقیت دیتا۔ میں پیٹھ کے بل لیٹ جاتا اور کچھ پڑھنے بلکہ کچھ مطالعہ کرنے کی بھی کوشش کرتا اور اس دوران اپنی تقدیر کو تسلیم نہ کرنے کے فیصلے سے خوراک حاصل کرتا۔ میرا یہ پختہ یقین تھا کہ صرف ایک چیز ہے جو مجھے حاصل کرنی ہے۔ مجھے ایک دشمن نہ ہونے کا جو حق ہے، اسے حاصل کرنے کے لیے مجھے جنگ لڑنی ہے۔ یہاں سے باہر نکلنے کے لیے مجھے جنگ لڑنی ہے۔

میں نے کمپنی کے سیاسی کمیسار کو یہ باور کرانے کے لیے کئی مرتبہ اس سے ملاقات کی کہ میری وہاں موجودگی کا باعث صرف ایک غلطی ہے، کہ مجھے صرف دانشوری جھاڑنے اور سنکی ہونے کے باعث پارٹی سے برخاست کیا گیا ہے نہ کہ اشتراکیت کے دشمن کی حیثیت سے۔ ایک مرتبہ پھر (نہ جانے کون سی ویں مرتبہ) مجھے پوسٹ کارڈ کی مضحکہ خیز داستان اسے سنانا پڑی۔ لیکن وہ داستان اب درحقیقت اتنی مضحکہ خیز محسوس نہیں ہوتی تھی بلکہ درحقیقت میرے سیاہ نشان کی موجودگی کے باعث اب کچھ زیادہ ہی مشکوک لگتی تھی؛ ایسا لگتا تھا جیسے کوئی اس سے بھی بری چیز ہے جسے چھپانے کے لیے یہ داستان گھڑی گئی ہو۔ سچی بات کروں تو اس نکتے کی نشاندہی بھی کروں گا کہ کمیسار نے میری بات بڑے صبر سے سنی اور انصاف کے حصول کے لیے میری خواہش کے لیے ایک غیر متوقع سی فہم کا مظاہرہ کیا۔ بلکہ درحقیقت اس نے بالائی سطح پر میرے کیس کے متعلق تفتیش وغیرہ بھی کرائی (اُف یہ اونچی نیچی سطحوں پر مشتمل ناقابل فہم جغرافیہ!) لیکن آخر کار جب اس نے مجھے طلب کیا تو اپنی خلش نہ چھپاتے ہوئے صرف یہی کہنے کے لیے کہ "تم نے کیوں کوشش کی تھی مجھے بے وقوف بنانے کی؟ انھوں نے مجھے تمھارے متعلق سب کچھ بتا دیا ہے۔ جانا مانا ٹراٹسکی وادی!"

آہستہ آہستہ مجھے یقین آتا چلا گیا کہ انسانی تقدیروں کی عدالت عظمیٰ میں میری سی شخصیت کا جو تصور درج کر دیا گیا ہے، اسے تبدیل کرنے کی طاقت کسی میں نہیں۔ مجھے یقین آ گیا کہ میری شخصیت کا یہ تصور (چاہے اس کی مجھ سے مماثلت بالکل نہ ہو) میری حقیقی شخصیت سے کہیں زیادہ حقیقی ہے۔ مجھے یقین آ گیا کہ یہ تصور میری شخصیت کا سایہ نہیں بلکہ میری شخصیت ہی اس تصور کا ایک سایہ ہے۔ مجھے یقین آ گیا کہ مجھے اپنے اس تصور پر یہ الزام دھرنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ چونکہ میری شخصیت

Scanned with CamScanner

اس تصور سے مماثلت نہ رکھنے کی مجرم ہے اس لیے یہ تصور میری شخصیت سے کوئی مطابقت نہیں رکھتا۔ مجھے یہ یقین آ گیا کہ مماثلت کا یہ فرق میری صلیب ہے جسے میں نے خود اٹھانا ہے۔

اس کے باوجود میں نے حوصلہ تج دینے سے انکار کر دیا۔ میں چاہتا تھا کہ اپنی شخصیت اور اس شخصیت کے تصور کے مابین جو فرق تھا، اس کے بوجھ کو برداشت کروں، اور وہ شخص بنوں جو انھوں نے فیصلہ کر رکھا ہے کہ میں نہیں ہوں۔

مجھے خود کو کانوں میں سخت مشقت کا کچھ نہ کچھ عادی بنانے میں تقریباً دو ہفتے لگے، اس ہوائی برمے (pneumatic drill) کا عادی بنانے میں جس کا ارتعاش میں سوتے میں بھی اپنے جسم کے اندر محسوس کیا کرتا تھا۔ لیکن میں نے ایک جنون کے ساتھ سخت محنت کی۔ میں ہر ریکارڈ توڑ دینا چاہتا تھا اور زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ میں اسی راستے پر چل رہا تھا۔

مشکل یہ تھی کہ اس طرزِ عمل کو کسی نے بھی میرے سیاسی ایقانات کا اظہار نہ سمجھا۔ چونکہ ہم سب کو اپنے اپنے حصے کا کام کرنے کی اجرت ملتی تھی (یہ سچ ہے کہ وہ لوگ کمرے اور شب خوابی کے تختے کے پیسے کاٹ لیتے تھے لیکن پھر بھی کافی کچھ بچ رہتا تھا)، کچھ اور لوگ ایسے بھی تھے جو اپنی سیاست وغیرہ سے قطع نظر قابلِ ذکر توانائی کے ساتھ کام کرتے تھے تاکہ ان ضائع شدہ برسوں سے کوئی قابلِ قدر چیز چھین سکیں، چاہے وہ تھوڑی بہت ہی قابلِ قدر ہو۔

حالانکہ ہر شخص ہمیں حکومت کے بڑے سخت دشمن ہی سمجھتا تھا لیکن ہم سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ ہم اشتراکی اجتماعیتوں کی عوامی زندگی کے جملہ لوازمات کی پابندی کریں گے۔ ہم جو دشمن تھے، حریف تھے، ہم حالاتِ حاضرہ پر بحث مباحثے کیا کرتے (سیاسی کمیسار کی کڑی نگاہوں کے سامنے)، ہم روزانہ کی سیاسی بحث میں حصہ لیتے، ہم خبروں والے بورڈ پر اشتراکی سیاست دانوں کی تصویریں چسپاں کرتے اور اس پر اپنے تابناک مستقبل سے متعلق نعرے درج کرتے۔ شروع شروع میں تو میں نے التزام رکھا کہ ان کاموں کے لیے خود کو رضا کارانہ طور پر پیش کروں، لیکن کسی نے بھی اس چیز کو میری سیاسی بلوغت کی علامت تصور نہ کیا؛ دوسرے لوگ بھی جب شام کی چھٹی پانے کی غرض سے کمپنی کمانڈر کی توجہ حاصل کرنا چاہتے تو ان کاموں کے لیے خود کو رضا کارانہ طور پر سامنے لاتے تھے۔ ان میں سے کوئی بھی اس سیاسی سرگرمی کو سیاسی نہیں سمجھتا تھا؛ یہ ایک خالی خولی اقدام تھا جس کی مقتدر

Scanned with CamScanner

قوتوں کو ان سے توقع ہوا کرتی تھی۔

مجھے یہ اندازہ لگانے میں زیادہ عرصہ نہیں لگا کہ میری یہ مزاحمت مجھے کہیں نہیں لے جانے والی، یہ کہ میں وہاں موجود واحد شخص ہوں جس نے خود میں یہ 'عدم مماثلت' دیکھی ہے، جو دوسروں کو نظر ہی نہیں آتی۔

ہم نان کمیشنڈ افسروں کے رحم و کرم پر ہوا کرتے تھے لیکن ان میں سے ایک پستہ قد اور سیاہی مائل رنگت کا ایک سلوواک کارپورل بھی تھا جس کے نرم خو انداز و اطوار اور سادیت پسندی سے یکسر گریز اسے دوسروں سے ممتاز کرتے تھے۔ اسے عمومی طور پر پسند کیا جاتا تھا، تاہم ایسے لوگ بھی تھے جن کا دعویٰ تھا کہ اس کی نرم دلی صرف چالاکی اور ہوشیاری پر مبنی ہے، اور کچھ نہیں۔ ہمارے برخلاف نان کمیشنڈ افسروں کے پاس ہتھیار ہوتے تھے اور وقتاً فوقتاً وہ نشانہ بازی کی مشق کے لیے نکل جایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ وہ سیاہی مائل کارپورل اپنی مشق سے واپس آیا تو نشانہ بازی میں اوّل رہنے پر اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ ہم میں سے کافی لوگ اسے مبارکباد دیتے ہوئے جان بوجھ کر غل غپاڑا کرنے لگے (کچھ اس کی ہمدردی میں اور کچھ اس کا مضحکہ اڑانے کی خاطر) لیکن کارپورل محض شرماتا ہی رہ گیا۔

اسی روز بعد میں ایسا ہوا کہ میں اور وہ اکیلے بیٹھے تھے۔ بس بات جاری رکھنے کی خاطر میں نے اس سے پوچھا کہ وہ اتنا اچھا نشانہ باز کیونکر ہے۔ میری جانب دلچسپی اور کچھ مخمصے سے دیکھتے ہوئے اس نے کہا، ''یہ ایک چال ہے جو میں نے اپنے لیے تیار کر رکھی ہے۔ میں یہ فرض کرتا ہوں کہ میری بندوق کا ہدف کوئی شہنشاہیت پسند ہے، اور میں اس پر اتنے طیش میں آجاتا ہوں کہ میرا نشانہ کبھی خطا نہیں جاتا۔'' اس سے پہلے کہ میں اس سے پوچھتا کہ اس کے یہ شہنشاہیت پسند کیسے نظر آتے ہیں، اس نے ایک سنجیدہ اور پُر تفکر انداز میں اپنے جملے پر اضافہ کیا، ''مجھے نہیں معلوم کہ تم سب لوگ مجھے مبارکباد کیوں دے رہے ہو۔ اگر آج جنگ ہو رہی ہوتو میں تمھی لوگوں پر گولیاں برسا رہا ہوں گا۔''

یہ چھوٹا سا اچھا آدمی ہم پر چیخنے چلانے کی بالکل صلاحیت نہیں رکھتا تھا، اس لیے بعد میں اس کا تبادلہ کر دیا گیا، لیکن اس کے منھ سے یہ الفاظ سن کر مجھے اندازہ ہوا کہ پارٹی اور کامریڈوں سے مجھے باندھے رکھنے والے رشتے ایسے ٹوٹے ہیں کہ اب جڑ بھی نہیں سکتے۔ اب میں اس راہ کو چھوڑ چکا تھا جو کبھی میری زندگی ہوتی۔

Scanned with CamScanner

6

ہاں، تمام رشتے ٹوٹ چکے تھے۔

ہر چیز ٹوٹ چکی تھی۔ مطالعہ، تحریک کے لیے کام، دوستیاں، محبت، اور محبت کی تلاش بھی۔ زندگی کا سارا کا سارا بامعنی راستہ کہیں کھو چکا تھا۔ میرے پاس اب کچھ بچا تھا تو وہ تھا وقت۔ اور وقت کے ساتھ میرا کچھ ایسا یارانہ ہوا کہ پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ یہ وقت اُس وقت سے بہت مختلف تھا جس سے میں اس سے پہلے متعارف رہا تھا: خود کو کام، محبت اور مشقت میں تبدیل کرتا ہوا وقت، ایک ایسا وقت جسے میں نے سوچے سمجھے بغیر قبول کر لیا تھا کیونکہ یہ بڑے امتیازی طور پر میرے اعمال کے پیچھے چھپا رہتا تھا۔ اب یہ ایک برہنہ کیا ہوا وقت تھا—— خود اپنے آپ میں، خود اپنے لیے، اپنے بالکل بنیادی، بالکل ابتدائی انداز میں وقت۔ اور اس نے مجھے مجبور کیا کہ میں اسے اس کے حقیقی نام سے پکاروں (کیونکہ اب میں خالص وقت جی رہا تھا—— خالص، خلاء سے مملو وقت) تاکہ اسے کسی بھی لمحے فراموش نہ کر بیٹھوں، اسے مستقلاً اپنے روبرو رکھوں اور اس کا بار محسوس کرتا رہوں۔

جب موسیقی بجتی ہے تو ہم صرف میلوڈی سنتے ہیں اور بھول جاتے ہیں کہ یہ وقت کے بہت سے چہروں میں سے ایک چہرہ ہے۔ جب اسکور میں کسی وقفے کے دوران آرکسٹرا خاموش ہو جاتا ہے تو ہم وقت کو، خالص وقت کو سماعت کرتے ہیں۔ ہاں، میں ایسا ہی ایک وقفہ جی رہا تھا لیکن اس قسم کا نہیں جس کی طوالت کسی روایتی قسم کے نشان سے طے کی جا چکی ہو۔ میں ایک ایسا وقفہ جی رہا تھا جس کا کوئی اختتام نہ تھا۔ ہم دوسری بٹالینوں کی مثال پر عمل پیرا ہوتے ہوئے، کسی ٹیپ پر لکیروں کو ناپتے ہوئے کاٹ نہ سکتے تھے جو ہمارے دو سال کے اس عرصے سے ایک ایک دن کو گھٹتا ہوا دکھا سکیں۔ وجہ یہ کہ سیاہ نشان یافتہ سپاہیوں کو غیر متعین عرصے تک کے لیے وہاں رکھا جا سکتا تھا۔ چالیس سالہ ایمبروس، جو سیکنڈ کمپنی سے متعلق تھا، وہاں اپنا چوتھا برس کاٹ رہا تھا۔

اس دوران فوجی سروس کرنا یا پھر گھر پر بیوی یا منگیتر کا ہونا بلاشبہ ایک تلخ مقدر تھا۔ اس کا مطلب تھا اس بیوی یا منگیتر کے ناقابلِ نگرانی وجود پر دور دراز سے مستقل نگاہ رکھنا۔ اس کا مطلب تھا اس مستقل خوف کے ساتھ زندگی گزارنا کہ کمانڈنگ افسر وہ چھٹی منسوخ کر دے گا جس کا اس نے اس بیوی یا منگیتر کے کبھی کبھار ملاقات کے لیے آنے کے موقعے پر دینے کا وعدہ کر رکھا ہوتا۔ اور اس خوف

Scanned with CamScanner

کے ساتھ کہ ایسا ہوا تو اس بے چاری کو فضول میں کیمپ کے دروازے پر انتظار کرتے رہنا ہوگا، وہاں لوگ اپنے سیاہ نشان کی مانند سیاہ مزاح کے ساتھ یہ داستانیں سناتے کہ کیسے افسران ان پریشان حال عورتوں کی گھات میں رہتے اور ان سے وہ فوائد لوٹ لیتے جن کے اصل حقدار بیرکوں میں بند کیے جانے والے سپاہی ہوا کرتے تھے۔

اور تب بھی، تب بھی وہ لوگ جن کے گھر میں کوئی عورت ان کی منتظر ہوتی، ان کے پاس ایک تاگا تو ہوتا تھا جو انھیں بیرکوں میں موجود دیگر لوگوں کے پار ان کے گھر تک سے جوڑے رکھتا۔ چاہے کتنا ہی باریک، کتنا ہی تکلیف دہ حد تک باریک اور مہین کیوں نہ ہوتا ہو یہ تاگا، آخر یہ تاگا تو تھا نا۔ میرے پاس ایسا کوئی تاگا نہ تھا۔ میں مارکیتا سے اپنے تمام تعلقات منقطع کر چکا تھا اور مجھے اگر کوئی خط موصول ہوتا تھا تو میری ماں کی جانب سے۔ اچھا، تو کیا یہ کوئی تاگا نہ تھا؟

نہیں۔ اگر گھر سے مراد ماں باپ کا گھر ہو تو یہ کوئی تاگا تو نہ ہوا؛ یہ تو صرف ماضی ہوا۔ ماں باپ کی جانب سے لکھے ہوئے خطوط کسی ایسے ساحل سے آئے ہوئے پیغامات ہوتے ہیں جسے ہم چھوڑ کر جا رہے ہوں۔ اگر یہ خطوط کچھ کر سکتے ہیں تو بس یہی کہ ہمیں یہ احساس دلا دیں کہ ہم نے جو بندرگاہ چھوڑی تھی اس سے ہم کس قدر دور نکل آئے ہیں۔ ہمارے پیاروں کی بے غرض محبت میں ملفوف یہ خطوط۔ ہاں یہ خطوط یہ ضرور کہتے ہیں کہ وہ بندرگاہ اب بھی موجود ہے، وہ اب بھی وہیں اپنے تمام تر دلاسا دینے والے قدیمی حسن کے ساتھ قائم ہے، لیکن واپسی کی سڑک، واپسی کا راستہ کھو چکا ہے۔

آہستہ آہستہ میں اس خیال سے ہم آہنگ ہونے کا عادی ہوتا گیا کہ میری زندگی اپنا تسلسل کھو بیٹھی ہے، کہ یہ میرے ہاتھوں سے نکال لی جا چکی ہے، اور یہ کہ اب میرے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں کہ جس بیرونی حقیقت کو میں واقعتاً اور نہ چاہتے ہوئے بھی جیتا چلا جا رہا ہوں اس کی اندرونی حقیقت کو بھی جینے لگوں۔ میری آنکھیں میری شخصیت کے تڑخنے کے عمل سے ہم آہنگ ہوتی چلی گئیں، اور میں نے اپنے اردگرد لوگوں کی موجودگی کو محسوس کرنا شروع کیا۔ تاہم اس سے پہلے ہی وہ ایک دوسرے کی موجودگی کو محسوس کرنا شروع کر چکے تھے۔ لیکن خوش قسمتی سے مجھے اتنی دیر نہ ہوئی کہ میں خود کو ان سب کے لیے اجنبی ہی کر بیٹھتا۔

Scanned with CamScanner

اس دھند لے سائے سے سب سے پہلے جو شخص باہر نکلا وہ ہونزا تھا، جو برنو (Brno) شہر کے گلی محلوں میں بولی جانے والی تقریباً نا قابلِ فہم سی بولی بولتا تھا اور جسے ایک پولیس اہلکار پر حملہ آور ہونے کے جرم میں سیاہ نشان جاری کیا گیا تھا۔ اس نے اپنی کہانی یوں سنائی تھی کہ وہ پولیس والا اسکول میں اس کا پرانا ساتھی تھا اور اس نے ایک ذاتی جھگڑے کی بنیاد پر اس کو مار لگائی تھی۔ لیکن عدالت نے اس معاملے کو یوں نہیں دیکھا اور وہ چھ ماہ کی جیل کاٹ کر سیدھا ہمارے پاس آ پہنچا۔ وہ اوّل درجے کا میکینک تھا لیکن اب اس بات سے قطعاً بے پروا تھا کہ وہ میکینک کا کام کرتا ہے یا کوئی اور۔ اس کا کسی سے کوئی تعلق تھا نہ اسے اپنے مستقبل کی پروا تھی اور اسی چیز نے اسے آزادی کا ایک بے فکر سا احساس عطا کر رکھا تھا۔

ہم میں سے اگر کسی اور کو اس اندرونی آزادی کا احساس ہوتا تھا تو وہ بیڈرچ تھا۔ وہ ہمارے بیس کے قریب بیرکوں میں موجود سب سے زیادہ انوکھے مزاج کا شخص تھا۔ ستمبر میں لوگوں کا ایک نیا انبوہ ان بیرکوں میں در آتا لیکن بیڈرچ اس وقت سے دو ماہ بعد ہمارے پاس آیا۔ شروع میں اسے ایک انفنٹری بٹالین کے سپرد کیا گیا تھا، لیکن پہلے تو اس نے خالصتاً مذہبی بنیادوں کا سہارا لے کر ہتھیار اٹھانے سے ہی انکار کر دیا اور اس کے بعد حکام نے اس کے وہ خطوط پکڑ لیے جو اس نے ٹرومین اور اسٹالن کے نام لکھے تھے اور جن میں دونوں سے پُرخلوص اپیل کی گئی تھی کہ اشتراکی بھائی چارے کے نام پر دنیا میں موجود تمام افواج ختم کر دی جائیں۔

حکام نے غلط فہمی کی بنا پر اسے قواعد میں حصہ لینے کی بھی اجازت دے ڈالی جہاں اگرچہ وہ اسلحے کے بغیر واحد آدمی ہوتا تھا لیکن فرضی ہتھیار کو اوپر نیچے کرنے اور احکامات دینے کی حرکات بڑی صفائی اور چابک دستی سے بجا لاتا تھا۔ وہ سیاسی سیشن میں بھی حصہ لیتا اور سرمایہ پرست جنگ پسندوں پر بڑے جوش و جذبے سے حملہ آور ہوتا تھا۔ لیکن جب اس نے خود اپنی صوابدید پر ایک پوسٹر پر اسلحے سے مکمل دستبرداری کا مطالبہ تحریر کر کے اسے بیرکوں میں چپکایا تو بغاوت کے الزام میں اس کا کورٹ مارشل کر دیا گیا۔ اس کے امن پسندانہ بھاشنوں سے تنگ آئے ہوئے ججوں نے حکم دیا کہ ماہرین نفسیات سے اس کا معائنہ کرایا جائے؛ پھر بے انتہا غور و فکر کے بعد اس کے خلاف الزامات واپس لے کر اسے ہماری طرف بھجوا دیا۔ بیڈرچ بہت خوش تھا۔ وہ واحد شخص تھا جس نے جان بوجھ کر یہ سیاہ تمغہ

Scanned with CamScanner

کمایا تھا اور وہ اسے زیب تن کر کے لطف لیتا تھا۔ اسی لیے وہ خود کو آزاد محسوس کرتا، اگرچہ ہونزا اور اس کی بدتمیزیوں کے برخلاف، وہ اپنی آزادی کا اظہار خاموش نظم وضبط اور محنت مشقت سے کرتا۔

دیگر تمام لوگ خوف اور مایوسی کے مارے ہوئے تھے۔ جنوبی سلوواکیہ سے تعلق رکھنے والا تیس سالہ ہنگیریائی باشندہ وارگا تھا جو اپنے قومی تعصبات بھلا کر کئی افواج کی طرف سے لڑ چکا تھا اور سرحد کے دونوں جانب موجود قیدیوں کے کیمپوں میں آتا اور وہاں سے نکلتا رہا تھا۔ پھر وہ تھا، گاجر جیسے سر والا پٹران، جس کا بھائی فرار ہو کر سرحد پار چلا گیا تھا اور اس دوران اس نے پہرے دار سپاہی کو گولی مار دی تھی۔ پراگ میں مزدور طبقے کے علاقے زرکوف سے تعلق رکھنے والا بیس سالہ کھلنڈرا چھوکرا استانا تھا جس کی اٹکھیلیاں مقامی کونسل کا غصہ مول لے چکی تھیں۔ وہ نہ صرف نشے کی حالت میں یومِ مئی کی پریڈ میں مارچ کر چکا تھا بلکہ اس نے ایک رکاوٹ پر جان بوجھ کر پیشاب بھی کیا تھا اور عام لوگ اس سے خوش ہو رہے تھے۔ قانون کا طالب علم پاول پیکنی تھا جس نے فروری کی اشتراکی بغاوت کے دوران اپنے چند ساتھی طلبا کے ساتھ اشتراکیوں کے خلاف مظاہرہ کیا تھا۔ (جلد ہی اسے پتا چل گیا کہ میں انھی لوگوں کے کیمپ میں تھا جنھوں نے بغاوت کے بعد اسے یونیورسٹی سے دھکے دے کر نکال باہر کیا تھا اور صرف وہی تھا جس نے اس بات پر ایک کینہ توز اطمینان کا مظاہرہ کیا کہ ہم دونوں بالآخر ایک ہی کشتی میں جا سوار ہوئے۔)

میں ان بہت سے سپاہیوں سے متعلق بتا سکتا ہوں جن کی تقدیر میرے جیسی تھی لیکن اس کے بجائے میں اپنی توجہ اس شخص پر مرکوز کروں گا جسے میں سب سے زیادہ پسند کرتا تھا، اور وہ تھا ہونزا۔ ہمارے درمیان ہونے والی اولین گفتگوؤں میں سے ایک مجھے یاد ہے۔ یہ ملاقات ایک کان کی راہداری میں کام کے وقفے کے دوران ہوئی جہاں ہم اتفاق سے ایک ساتھ بیٹھے تھے (راشن میں ملنے والی کوئی روٹی ووٹی چباتے ہوئے)۔ اچانک ہونزا نے میرے گھٹنے پر ہاتھ مارا اور کہا، ''ابے او! تو گونگا بہرا ہے یا کیا ہے؟ تجھے ہلاتا جلاتا کون ہے؟'' چونکہ میں اس وقت واقعی گونگا بہرا ہی تھا (خود کو حق بجانب ثابت کرنے کی لامحدود کوششوں میں بالکل مشغول) میرے لیے یہ وضاحت کرنا بڑا مشکل تھا کہ میں ان کانوں میں کیوں آن پہنچا تھا اور کیوں درحقیقت مجھے یہاں اصل میں ہونا نہیں چاہیے تھا (اچانک مجھے لگا کہ میرے الفاظ کا انتخاب اسے کتنا مصنوعی اور زور زبردستی سے نکالا ہوا لگا

Scanned with CamScanner

ہوگا)۔ ''کیوں بے حرامی! تجھے لگتا ہے کہ ہم سب کو یہیں ہونا چاہیے تھا؟'' میں نے اپنی پوزیشن زیادہ واضح کرنے کی کوشش کی (اور نسبتاً قدرتی لگنے والے الفاظ کا انتخاب کیا) لیکن ہونزا نے اپنا آخری منہ بھر لقمہ چباتے ہوئے قطع کلامی کی، ''تجھے پتا ہے کہ تو جتنا بے وقوف ہے اتنا ہی لمبا بھی ہوتا تو سورج تیری کھوپڑی میں ایک سوراخ کر چکا ہوتا۔'' عامیوں کی زبان میں اس چھوٹے موٹے نیک نیت مضحکے سے مجھے اس بات پر شرم محسوس ہوئی کہ میں جن استحقاقات سے محروم ہو چکا ہوں، ان پر اپنی خود مشغول کھوپڑی کو پریشان رکھتا ہوں — میں جس نے ہمیشہ استحقاق اور خود مشغولی کے خلاف مضبوط موقف اپنایا تھا۔

وقت کے ساتھ ساتھ ہونزا اور میں اچھے دوست بن گئے۔ (ہونزا میرے دماغی حساب کتاب کی مہارت کے سبب میری عزت کرتا تھا۔ میرے تیز رفتار حساب کتاب کے سبب ہم تنخواہ کے موقعے پر ایک سے زائد مرتبہ کم پیسے وصول کرنے سے بچے تھے۔) ایک رات اس نے مجھے کیمپ میں ہی چھٹیاں گزارنے پر بے وقوف پکارا اور اپنے گینگ کے دیگر ساتھیوں کے ساتھ مجھے بھی گھسیٹ لیا۔ میں اس واقعے کو کبھی فراموش نہ کرسکوں گا۔ ہمارا گروپ خاصا بڑا تھا۔ تقریباً آٹھ تھے ہم سب، جن میں استانا، وارگا اور سینک (Cenek) نام کا ایک آدمی بھی تھا جو اطلاقی فنون کے شعبے کا ایک سابق طالب علم تھا۔ (سینک کو ہمارے ساتھ اس لیے ڈالا گیا تھا کہ اس نے اسکول میں کیوبسٹ[10] فن پارے بنانے پر اصرار کیا تھا؛ اب اس سے کبھی کبھار کی جانے والی رعایت کے نتیجے میں، اس نے بیرکوں کی دیواروں کو کوئلے سے بنائے جانے والے بڑے سائز کی ڈرائنگز سے مزین کر دیا تھا جن میں ازمنۂ وسطیٰ کے جنگجو ہوتے، حیاباختہ لڑکیاں ہوتیں اور یہ سب چپوؤں اور کانٹے دار ڈنڈوں سے مسلح ہوتے۔) ہمارے پاس کہیں جانے کے لیے انتخاب کی راہ زیادہ کھلی ہوئی نہ تھی۔ قصبے کا قلب

---

10 کیوبسٹ: کیوبزم (Cubism) سے متعلق جو مصوری اور مجسمہ سازی میں بیسویں صدی کی تحریک تھی اور جس نے ادب اور موسیقی میں بھی اپنے اثرات مرتب کیے۔ مختصراً کیوبسٹ فن پاروں میں کسی شے کو ایک متعین زاویۂ نظر سے دیکھنے کے بجائے اسے توڑا پھوڑا اور تجزیہ کر کے دوبارہ جوڑا جاتا ہے اور اس میں متعدد زاویہ ہائے نظر سے کام لیا جاتا ہے۔ کیمونسٹ معاشروں میں اس قسم کے رجحان کو مضر سمجھا جاتا تھا اور اس کی حوصلہ شکنی کی جاتی تھی۔

Scanned with CamScanner

ہماری حدود سے آگے تھا، اور جو علاقے ہم پر کھلے تھے ان میں بھی ہم مخصوص جگہوں تک محدود کر دیے گئے تھے۔ لیکن اس رات ہماری قسمت اچھی تھی، قریب ہی واقع ایک ہال میں ایک رقص جاری تھا اور وہاں ہم پر عائد کردہ پابندیاں عامل نہیں تھیں۔ ہم نے معمولی سی داخلہ فیس ادا کی اور اندر گھس گئے۔ ہال میں بہت سی میزیں تھیں، بہت سی کرسیاں تھیں، لیکن لوگ زیادہ نہیں تھے۔ لڑکیاں دس سے زیادہ نہ تھیں اور مرد تقریباً تیس تھے۔ ان میں سے نصف توپ خانے سے وابستہ مقامی بیرکوں کے سپاہی تھے۔ جیسے ہی انھوں نے ہمیں دیکھا، وہ مستعد ہو گئے۔ ہم خود پر ان کی نگاہیں محسوس کر سکتے تھے۔ وہ ہماری تعداد گن رہے تھے۔ ہم ایک لمبی سی خالی میز کے گرد بیٹھے اور ایک بوتل ووڈکا طلب کی۔ لیکن بدشکل ویٹرس نے مصمم طریقے سے اعلان کیا کہ الکحل نہیں دی جائے گی، اس لیے ہونزا نے ہم سب کے لیے سافٹ ڈرنکس کا آرڈر دے دیا۔ پھر اس نے ہم سب سے رقم اکٹھی کی اور تھوڑی دیر بعد رم کی تین بوتلوں کے ساتھ واپس آ گیا۔ ہم نے اپنی سافٹ ڈرنکس کو میز کے نیچے لے جا کر یہ رم ان میں ملا دی۔ ہمیں حد درجہ احتیاط کے ساتھ قدم اٹھانے تھے، کیونکہ ہمیں معلوم تھا کہ وہ توپچی ہمیں دیکھ رہے ہیں اور وہ الکحل ملے مشروبات کے غیر قانونی استعمال کے الزام میں ہماری شکایت بھی کر سکتے ہیں۔ یہ بتانا ضروری ہوگا کہ مسلح افواج کی ہم سے مخاصمت بہت زیادہ تھی۔ ایک طرف تو وہ ہمیں مشکوک عناصر (مجرم، قاتل اور منحوس بھوت — جیسا کہ پروپیگنڈا کے طور پر لکھے جانے والے جاسوسی ناولوں میں مذکور ہوتا) سمجھتے جو ہر وقت ان کے معصوم اہلِ خانہ کی گردنیں کاٹنے پر تلے ہوں، تو دوسری جانب (اور غالباً یہ بات زیادہ اہم تھی) وہ اس بات پر ہم پر رشک کرتے کہ ہماری آمدنی ان سے پانچ گنا زیادہ تھی۔

اسی حقیقت نے ہماری پوزیشن اتنی غیر معمولی بنا ڈالی تھی۔ ہمیں صرف بیل کی طرح کام کرنے اور تکان کا علم تھا؛ ہمیں ہر دو ہفتے بعد اپنے سر منڈوانا پڑتے تھے تاکہ انھیں ہر قسم کے تفاخرِ ذات سے چھٹکارا دلا سکیں۔ ہم مٹی کے لاوارث بیٹے تھے جو آئندہ زندگی میں کسی بھی امید کی طرف نہیں دیکھ سکتے تھے؛ لیکن پیسہ ہمارے پاس تھا۔ ارے کچھ زیادہ نہیں، لیکن ایک ایسے سپاہی کے لیے یہ ایک خزانہ تھا جسے مہینے میں صرف دو راتوں ہی کی فراغت حاصل ہوتی ہو۔ ان چند گھنٹوں میں (اور ان چند مقامات پر جو حدود سے باہر نہیں تھیں) وہ سپاہی ایک لکھ پتی جیسے افعال پر قادر ہوتا اور دیگر سارے ایام کی طول

Scanned with CamScanner

طویل پریشانیوں کا مداوا کر سکتا تھا۔

پلیٹ فارم پر ایک قابلِ رحم بینڈ فرش پر موجود چند جوڑوں کے لیے پولکا اور والز کے درمیان کے کسی رقص کی دھن بجانے میں مصروف تھا۔ اس دوران ہم نے لڑکیوں کو دیکھ کر اپنی آنکھیں ٹھنڈی کیں اور اپنے مشروب کی چسکیاں لیں جن میں موجود الکحل نے ہمیں جلد ہی ہال میں موجود دوسرے تمام لوگوں کی سطح سے بلند تر کر ڈالا۔ ہم اچھے موڈ میں تھے۔ میں نے یار باشی کی ایک زوردار کیفیت کو خود پر غلبہ پاتے محسوس کیا اور ساتھیوں کی سنگت کا ایسا احساس مجھے تب سے اب تک نہ ہوا تھا جب میں یاروسلاو کے ساتھ سمبالوم کی سنگت میں ساز بجایا کرتا تھا۔ اسی دوران ہونزا کو ایک منصوبہ سوجھا کہ ان تو پچیوں کے ہاتھ سے جس قدر ممکن ہو اتنی لڑکیاں اڑا لی جائیں۔ یہ منصوبہ اپنی سادگی میں بہت پسندیدہ تھا اور ہم نے اس پر عملدرآمد میں کوئی وقت ضائع نہ کیا۔ سینک، کہ بروں میں مسخرا تھا، اس میں توانائی بھی سب سے زیادہ تھی۔ اور ہمارے لطف کی حد نہ رہی جب اس نے اپنا یہ کردار بھرپور طریقے سے نبھایا: ایک سیاہ مو اور بھرپور میک اپ والی لڑکی کے ساتھ رقص کرنے کے بعد وہ اسے ہماری میز پر لے آیا، ہمارے گھولے ہوئے مشروب سے دو پیالے انڈیلے اور کہا، ''اچھا! تو چلو یہ پیتے ہیں۔'' لڑکی نے رضامندی میں سر ہلایا اور انھوں نے گلاس ٹکرائے۔ اسی لمحے توپ خانے کی وردی پہنے، جس پر دو فیتے بھی کاڑھے ہوئے تھے، ایک منحنی سا شخص چلتا ہوا لڑکی تک آیا اور جتنی بدتمیزی سے بول سکتا تھا سینک سے بولا، ''یہ لڑکی فارغ ہے؟'' ''ہاں ہاں، بالکل، میرے پیارے،'' سینک نے کہا، ''یہ ساری کی ساری تمھاری ہے۔'' اور اس دوران جب وہ لڑکی اپنے محبت کے بھوکے کارپورل کے ساتھ تھرک رہی تھی اور پولکا کی لغو اور نامعقول دھن پر رقص کناں تھی، ہونزا ٹیکسی منگانے کے لیے فون کرنے چلا گیا۔ جیسے ہی ٹیکسی آئی، سینک گیا اور ٹیکسی کے پاس کھڑا ہو گیا۔ لڑکی نے رقص ختم کرتے ہی کارپورل سے کہا کہ اسے لیڈیز روم جانا ہے اور کچھ دیر بعد ہم نے ٹیکسی کے چل پڑنے کی آواز سنی۔

اگلا اسکور بی کمپنی کے گھاگ ایمر وس نے کیا (یہ حقیقت کہ اس کی منتخب کردہ لڑکی اپنی زندگی کے اچھے برس گزار چکی تھی اور ہمیشہ پُرکشش سے ذرا کم ہی رہی تھی، چار عدد توپچیوں کو اس لڑکی کا محاصرہ کرنے سے نہ روک سکی)۔ دس منٹ بعد ایمر وس، وہ لڑکی اور وارگا (جسے یقین تھا کہ کوئی لڑکی

اس کے ساتھ جانے کا خواب نہیں دیکھے گی) ایک ٹیکسی پر سوار ہوئے اور قصبے کے دوسرے سرے پر موجود ایک شراب خانے میں سینک سے ملاقات کے لیے بھاگ لیے۔ زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ ہمارے گروپ میں سے مزید دو نے ایک اور لڑکی کو اپنے ساتھ چلنے کے لیے آمادہ کرلیا جس کے بعد صرف استانا، ہونزا اور میں ہی رہ گئے۔ اب توپچی ہم لوگوں کو زیادہ سے زیادہ وحشیانہ طریقے سے دیکھ رہے تھے: ہماری کم ہوتی ہوئی تعداد اور ان کے درمیان سے تین عدد لڑکیوں کے غائب ہو جانے کے درمیان جو تعلق تھا وہ بالآخران پر واضح ہونا شروع ہو چکا تھا۔ ہم نے معصوم نظر آنے کی بڑی کوشش کی لیکن یہ واضح تھا کہ ایک فساد کا لاوا پک رہا ہے۔ ایک سفید رنگ حسینہ تھی جس کے ساتھ میں اس شام ایک مرتبہ رقص کرنے میں کامیاب رہا تھا، تاہم یہ حوصلہ نہیں کر پایا تھا کہ اسے اپنے ساتھ بھاگ نکلنے کی تجویز پیش کرسکوں۔ میں نے اسے شہوت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے اپنے ساتھیوں سے کہا، ''کیا خیال ہے، ایک اور ٹیکسی لے کر باعزت طریقے سے پسپا نہ ہو جائیں؟'' مجھے امید تو تھی کہ اس لڑکی تک رسائی کا بعد میں موقع مل جائے گا لیکن توپچی حضرات اتنے عزم سے اس کے گرد حلقہ ڈالے ہوئے تھے کہ میں دوبارہ اس کے قریب جا ہی نہیں سکا۔ ''اس کے سوا ہم کچھ کر بھی نہیں سکتے،'' ہونزا نے فون کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔ لیکن جیسے ہی وہ فرش کے آر پار گزرا تمام توپچی اپنی میزوں سے کھڑے ہو گئے اور اس کے گرد گھیرا ڈالنے کے لیے تیزی سے متحرک ہوئے۔ اب لڑائی لازمی نظر آنے لگی تھی اور میرے اور استانا کے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا کہ اپنی میز سے اٹھ کر خطرے میں گھرے ہوئے اپنے ساتھی کی سمت راستہ بناتے چلیں۔ کچھ دیر تو پچیوں کا گروہ ایک وحشت ناک سکوت کے ساتھ آرام سے کھڑا رہا لیکن پھر ان میں سے ایک، جو کم ہوش میں لگتا تھا (شاید اس نے بھی اپنی میز کے نیچے کوئی بوتل رکھ کر پی ہوگی)، اس موضوع پر ایک زبردست تقریر جھاڑنے لگا کہ کیسے اس کا باپ سرمایہ دارانہ نظام کے تحت بے روزگار رہا تھا اور اب اسے ان سیاہ نشان والے بورژوا لونڈوں کو دیکھ کر کیسی وحشت ہو رہی ہے، اس لیے اگر اس کے سنگی ساتھی اسے نہ روکیں تو وہ اس حرامزادے (یعنی ہونزا) کے جبڑے پر کوئی لات وات مار کر دیکھے۔ اس توپچی کی تقریر میں پہلا وقفہ آتے ہی ہونزا نے بڑے مہذب طریقے سے پوچھا کہ توپخانے کے ساتھی اس سے چاہتے کیا ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ تم یہاں سے نکل جاؤ اور وہ بھی ڈبل کر کے، انھوں نے کہا۔ اس پر ہونزا نے جواب دیا کہ ہم بھی

Scanned with CamScanner

وہی کرنا چاہتے ہیں اور کیا وہ مہربانی کر کے اسے ٹیکسی کو فون کرنے کی اجازت دے سکتے ہیں۔ اس مرحلے تک آتے آتے ایسا لگتا تھا جیسے اس تو بچی کو دورہ پڑنے والا ہو۔ ''حرام زادو!'' وہ بہت اونچی آواز میں چلایا، ''چودوؤ! یہاں دن رات کام کر کر کے ہماری پیٹھ ڈھیلی پڑ جاتی ہے اور ہمارے پاس دکھلانے کو دھیلا نہیں ہوتا، اور ان سرمایہ داروں، ان غیر ملکی ایجنٹوں، ان غلیظ حرامیوں کو دیکھو کہ ٹیکسیوں پر سواریاں کرتے پھرتے ہیں۔ لیکن اب کے نہیں؛ بتادوں تمھیں! اگر مجھے ان کی گردن کو اپنے ان ہاتھوں سے گھونٹ دینا پڑا تب بھی نہیں!''

❊❊

پاکستانی اردو کتابیں

خاک کا رتبہ (کہانیاں)
حسن منظر
قیمت:120روپے

العاصفہ (ناول)
حسن منظر
قیمت:180روپے

خواب نامہ (ناول)
نجیب محفوظ
قیمت:120روپے

یادوں کی بازگشت (آپ بیتی)
نجیب محفوظ
قیمت:1400روپے

جوش اور خامہ بگوش (کالم)
مشفق خواجہ
قیمت:90روپے

یادوں کا دسترخوان
ذاکر علی خاں
قیمت:250روپے

جوش ملیح آبادی: ایک مطالعہ
ڈاکٹر محمد علی صدیقی
قیمت:200روپے

ادراک (تنقیدی مضامین)
ڈاکٹر محمد علی صدیقی
قیمت:200روپے

یادوں کی سرگم (خاکے)
مظفر علی سیّد
قیمت:200روپے

سعادت حسن منٹو
(پچاس برس بعد)
مرتبہ: شمشیر حیدر شجر، نوید الحسن
قیمت:200روپے

یہ صورت گر کچھ خوابوں کے
(ادیبوں کے انٹرویوز)
ڈاکٹر طاہر مسعود
قیمت:400روپے

سعادت حسن منٹو
(پچاس برس بعد)
مرتبہ: شمشیر حیدر شجر، نوید الحسن
قیمت:200روپے

Scanned with CamScanner

ارون پرکاش

ہندی سے ترجمہ: بشیر عنوان

گج پُران

ویدوں میں اُپنشدوں[1] کا زمانہ متعین ہے؛ وہ اپنے زمانے کے باہر بالعموم نہیں لکھے گئے۔ لیکن پُران[2] ویدوں یا اُپنشدوں کے زمانے کے بعد لکھے جاتے رہے۔ اس بھارتی دھرتی پر شاید آج بھی کوئی پُران لکھا جا رہا ہو۔ شاستروں کے لیے عقیدت ایسی ہے کہ جدید عہد میں لکھا پُران بھی قدامت کی عظمت حاصل کر لیتا ہے۔ یہ تحریر اکیسویں صدی کے آغاز میں پیش آنے والے ایک واقعے کو مرکز میں رکھ کر تخلیق کیے گئے ایک اُپ پُران[3] کی مختصر کتھا اور تفسیر ہے۔ اس کے اصل تخلیق کار کا نام نامعلوم ہے۔

''تین سمتوں میں سمندر سے گھرے اور ایک سمت میں کوہِ عظیم ہمالیہ کی حفاظتی چھتری میں بسے بھارت دیس میں پُران تخلیق کرنے کا حق ہر وِدوان[4] کو ہے، لہٰذا میں یہ پُران تصنیف کرتا ہوں۔ اس آریاورت[5] میں، جو زمین کا ہی مترادف ہے، ہاتھیوں کی بڑی دھوم رہی ہے۔ قدرت کے عظیم الجثہ جانوروں میں ایک، کالے پہاڑ کی طرح بھیانک اور بچوں جیسا گول مٹول اور خوبصورت ہاتھی۔ ہاتھی

---

[1] اُپنشد: ویدوں کی فلسفیانہ تفسیر کے سلسلے میں لکھے گئے سنسکرت متن۔

[2] پُران: ہندوستانی تاریخ، دیومالا یا مذہب کے کسی پہلو کے بارے میں لکھا گیا کوئی قدیم سنسکرت متن۔

[3] اُپ پُران: ضمنی اہمیت رکھنے والا پُران، جس میں کسی ذیلی قصے کی تفصیل بیان کی گئی ہو۔

[4] وِدوان: عالم۔

[5] آریاورت: آریاؤں کی سرزمین۔ قدیم ہندوستان جو بہت وسیع و عریض خطے پر محیط تھا۔

Scanned with CamScanner

اور مگر مچھ کی کتھا مختلف پُرانوں میں مذکور ہے۔ لیکن اُن کتھاؤں میں وشنو کی عظمت بیان کی گئی ہے، اندر کے سواری کے ہاتھی کی بے توقیری کی گئی ہے۔ لہٰذا کوہِ عظیم ہمالیہ کی وسعت کے گن والے ہاتھی کی عظمت کا بکھان کرنے کی غرض سے میں گج پُران[6] کی تخلیق شروع کرتا ہوں۔ تمام وِدوان آتمائیں مجھے ذہنی صلاحیت عطا کریں۔''

اصل سنسکرت سے ہندی ترجمے کی اپنی حدود ہیں، اس لیے پُران کی مختصر کتھا قارئین جان لیں:

دلّی شہر کے درمیان میں جمنا بہا کرتی تھی۔ اُس پر بنے متعدد پلوں میں سے ایک کو آئی ٹی او پل کہا جاتا تھا۔ پل کے دوسری طرف شہر کا نیا بسا ہوا حصہ نئی دلّی اور جمنا ندی کے پار پرانی دلّی کا حصہ ہوا کرتا تھا۔

آئی ٹی او پل پر طرح طرح کی گاڑیاں دوڑی جارہی تھیں۔ گاڑیوں پر لدی تھی دلّی کے جمنا پار رہنے والے دکھیا لوگوں کی بھیڑ۔ دو اکتوبر کو راشٹر پتا[7] کے جنم دن پر چھٹی ہوا کرتی تھی، پھر بھی وہ کمانے کے لیے دلّی جارہے تھے۔ جمنا پار والے دلّی کو غیر سمجھتے تھے، کیونکہ جمنا پار میں نہ بیس منزلہ عمارت کا تموّل تھا، نہ ہی عام شہری سہولیات۔

اُدھر دلّی میں روٹی کی اونچی اونچی عمارتیں بنی تھیں، اس لیے جمنا پار والوں کو روٹی کمانے کے لیے دلّی جانا ہی پڑتا تھا۔ سب دلّی جارہے تھے۔

اُدھر آئی ٹی او پل کے نیچے ایک بھیانک واقعہ ہورہا تھا۔ اُس بھیانک واردات کو دیکھنے کے حوصلے کی نہیں، بچوں جیسے فطری تجسّس کی ضرورت تھی۔ لیکن شہر میں بالپن کو صرف اشتہار دیکھ کر بھکنے کی چھوٹ تھی۔ دلّی شہر میں زیادہ تر لوگوں کا بچپن کچلا، دبایا اور دفنایا ہوا سا تھا۔ ہر کسی کو سیدھا دوڑنا تھا، گھوڑے کی طرح آنکھوں پر اندھیری چڑھائے۔ پیچھے بھی نہیں دیکھنا تھا — نہ ماضی میں، نہ تاریخ میں، یہاں تک کہ گزرے بچپن میں بھی نہیں۔ لیکن ہر تہذیب میں کچھ مستثنیات ہوتی ہیں۔ سائیکل پر سوار پُران کار[8] کو پل کے نیچے سے ایک چیخ سنائی دی اور وہ بچوں جیسے فطری تجسّس کے ساتھ قطار توڑ

---

6 گج: ہاتھی۔

7 راشٹر پتا: بابائے قوم۔

8 پُران کار: پران کا مصنف۔

Scanned with CamScanner

کر پل کے کنارے چلا گیا اور سائیکل کھڑی کر کے نیچے دیکھنے لگا۔ اُسے پل کے نیچے دکھائی دیا ایک گوشت کا لوتھڑا، جو گرگٹ کی کٹی پونچھ جیسا پھڑک رہا تھا، بچے کھچے جیون کے ساتھ۔ کچھ لمحے پہلے وہ لوتھڑا نہیں، پچّو نام کا نوجوان تھا۔ خون کی الٹی کرتا، تپ دق کا مریض۔ کھانسی امڈی تو کتے کی طرح ہانپنے لگا۔ اس کا گلا سوکھ رہا تھا۔ اس نے چاروں طرف دیکھا، مہاوت نورالوٹا نہیں تھا۔ پاس میں کوئی اور نہیں، بس مستان ہاتھی تھا۔ پچّو گھسٹتا ہوا پانی پینے بڑھا۔ پانی کا گھڑا الاؤ کے پاس تھا۔ پاس ہی رکھی تھی لالٹین، جس کے کیروسین تیل سے رات الاؤ جلایا گیا تھا۔ ہانپتا ہوا پچّو خود کو نہیں سنبھال پایا۔ گرا تو لالٹین الٹ گئی اور الاؤ بھک سے بھڑک اٹھا۔ پیپل کے سوکھے ڈنٹھلوں کے بوتے اونچی اونچی لپلپاتی لپٹیں۔ پاس ہی پیپل کے ہرے پتے چباتا مستان اُن گراں ڈیل لپٹوں کو دیکھ کر خوفزدہ ہو گیا۔ وہ بھڑکا، تبھی اس کی سونڈ شعلوں سے گھر گئی۔ نازک سونڈ میں تیز تپش اور جلن کے احساس سے بچنے کے لیے مستان بھاگا تو اس کا پاؤں خون کی الٹی کرتے پچّو پر پڑا۔ کئی ٹن وزن کے دباؤ کو پچّو کیسے سنبھالتا؟ اس کا پیٹ لوتھڑا بن گیا۔ بس چھاتی اور سر بچے تھے۔ آگ سے خوفزدہ، بھاگتے مستان کے پاؤں تلے اس کا پرانا مداح، اسی کے ذریعے اپنی ترقی کی امید رکھنے والا، یا یوں کہیں کہ اس کا دیوانہ، پچّو کچلا گیا۔ امید کیسی بھی اونچی ہو، چھوٹے جانداروں کو بڑے جانداروں کی قربت سے بچنا چاہیے۔ بڑا جاندار بغیر مطلب کے کروٹ بھی لے تو قریب رہنے والا چھوٹا جاندار مارا جاتا ہے۔ اصول یہ کہتا ہے۔ پھر یہ ہاتھی تو خوفزدہ تھا۔ خوف طاقت سے بڑا ہوتا ہے۔ ہاتھی سے بھی بڑا۔

جنگلی ہاتھی کو آگ سے ڈر لگتا ہے۔ سب سے بڑا ڈر۔ ادھر انسان آگ پیدا کر سکتا ہے، اسے قابو کر سکتا ہے، یہاں تک کہ انسان آگ سے کھیل سکتا ہے۔ اس لیے انسان پالتو بنانے سے پہلے ہاتھی میں آگ کا ڈر کم کرتا ہے۔ مستان بھی جورہاٹ (آسام) کے جنگل میں اس عمل سے گزرا تھا۔ اس کے چاروں پاؤں موٹے موٹے رسوں کے سہارے پیڑ سے باندھ دیے گئے تھے۔ وہ ہل بھی نہیں سکتا تھا۔ مہاوتوں نے ہاتھوں میں لمبی لمبی مشعلیں لیں۔ وہ روشنی اور آگ سے دہکتی مشعل کو مستان کی آنکھوں کے پاس لے جاتے۔ مستان تپش بھری روشنی سے ڈرتا، چنگھاڑتا، رسّی تڑا کر بھاگنے کے لیے وہ پوری طاقت لگاتا۔ لیکن وہ بے بس تھا۔ اندھیرے، ٹھنڈے، سایہ دار جنگل میں کم روشنی اور تپش کے عادی مستان کی آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا۔ اس نے ماں سے سیکھا تھا، جنگل میں آگ دیکھتے ہی

Scanned with CamScanner

بھاگ لو۔ بے بس مستان قریب مہینے بھر تہذیب کی روشنی اور تپش جھیلتا رہا۔

کچھ عرصے کے بعد مستان پالتو تو بنا، لیکن خوف اس کے اندر زندہ رہا۔ انتہائی باریک، نظر نہ آنے والے جراثیم کی طرح۔ اصول ہے— خوف کبھی مرتا نہیں۔ جاندار کہیں بھی جائے، کچھ بھی کرلے، خوف اس کے ساتھ رہتا ہے۔ جاندار پر مصیبت آتے ہی خوف جاگ اٹھتا ہے۔ مستان کے خوف کو اس لپلپاتی آگ نے جگا دیا۔ جان بچانے کے لیے وہ پتو کو کچلتا ہوا بھاگا۔

مستان کا پاؤں جسم پر پڑتے ہی پتو چیخ پڑا تھا۔ اس کی چیخ دور دور تک گئی، اڑیسہ کے کالا ہانڈی، سنتھال پرگنہ کی سوکھی پہاڑیوں اور راجستھان کے جیسلمیر تک میں سنی گئی۔ آئی ٹی او پل پر شور اور رفتار ایسی تیز تھی کہ کچھ نہیں سنا جا سکا۔ پُران کار کو پل کے نیچے لوتھڑا نظر آیا، تب چیخ مدھم پڑتی جا رہی تھی۔ آخر وہ مہذب اور عام کانوں کے سننے کے قابل نہ رہ گئی۔ وہ چیخ ابھی بھی کہیں ہوگی— زمین کے کسی نامعلوم کونے میں یا آسمان کے ہمارے پڑوسی چاند کی منڈیر پر۔ آواز کبھی ختم نہیں ہوتی۔ اس کی لہریں بھٹکتی رہتی ہیں، ادھورے خوابوں اور خواہشوں کی طرح۔ وہ لہریں بھٹکتے بھٹکتے تھک جاتی ہیں۔ ان میں ایسی تیزی نہیں رہتی کہ وہ ہمارے کانوں کو سنائی دے جائیں۔ آدمی ہو یا دیس، اندر کا گریہ وہ کہاں سن پاتا ہے؟ اس گریہ پنہاں کو پُران کار نہیں سن پا رہا تھا۔

چیخ کے معدوم ہونے کے بعد پتو گوشت کا لوتھڑا تھا۔ کہنا مشکل تھا کہ اس میں جیون تھا یا نہیں۔ یہ طے تھا کہ پتو ساکت تھا اور اسے ساکت کرنے والا تھا مستان۔

آئی ٹی او چوراہے پر مستان نے ہنگامہ کر رکھا تھا۔ اس کے آگے بجاج، کائینیٹک ہونڈا، کائینیٹک ہیرو جیسی دو پہیہ گاڑیاں کھڑی تھیں۔ چاروں طرف سینٹرو، میٹزو، ہونڈا اٹی، پھسڈی ماروتی، ایسٹیم اور ہانپتی بُڑھیا ایمبیسڈر کار تک نظر آ رہی تھی۔ کار والے ہارن بجائے جا رہے تھے۔ ٹریفک سپاہی ہکا بکا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ ہاتھی اپنے آپ راستہ چھوڑ دے گا۔ لیکن ہارن کے اتنے شور کے باوجود وہ ہل نہیں رہا تھا۔ البتہ بیچ بیچ میں چنگھاڑ اٹھتا تھا۔

مستان کے چوراہے پر پہنچتے ہی ٹریفک سگنل بند ہو گئے۔ پتا نہیں مستان کو کدھر جانا تھا، مگر جب تک وہ کچھ سمجھ پاتا، ہر راستہ گاڑیوں کے رکنے سے بند ہو گیا۔ گاڑیاں رکتی گئیں۔ چوراہے، تراہے جام ہوتے گئے۔ آئی ٹی او سے آگے بہادر شاہ ظفر مارگ کا چوراہا، تلک مارگ، دلی گیٹ، راج گھاٹ

Scanned with CamScanner

کا چوراہا، سب بند۔ شہر کے دیگر چوراہے بھی ٹریفک جام کے شکار ہوتے گئے۔ مستان اپنے آس پاس کی خالی جگہ میں منڈلاتا، غصے سے چنگھاڑ رہا تھا۔

گاڑیوں میں لدے لوگ سڑک پر چلنے کے اپنے خصوصی اختیار کے قتل پر چیخ رہے تھے۔ ایک نے ٹریفک پولیس پر ہاتھ اٹھا دیا۔ دو چار اور لوگ اس سپاہی کو مارنے لپکے تو وہ گاڑیوں کے بیچ سے بچتا بچاتا پولیس ہیڈ کوارٹر میں جا گھسا۔

وہاں پہلے سے ہی افراتفری مچی تھی۔

''جا کر کچھ کرو۔ اپنی تھنگ۔ پریزیڈنٹ اور پی ایم کو گاندھی جی کی سمادھی پر ہونے والے پروگرام میں پہنچنا ہے۔ ہاتھی کے مہاوت یا مالک کو پکڑ کر لاؤ۔'' بڑی نفیس وردی غصے میں تھر تھر کانپ رہی تھی۔

مستان بھالے کی نوک سی تیز للکار کی طرح کھڑا تھا۔ اس کے دکھاؤ دانت ایک میٹر لمبے تھے۔ ان پر چمچماتے پیتل کے موٹے چھلے چڑھے تھے۔ قریب دو مرد اونچے مستان کا سلیٹی رنگ اور اس پر قریب دو میٹر لمبی سونڈ۔ وہ چنگھاڑتا تو سونڈ کو تُرئی کی طرح آسمان کی طرف اٹھا دیتا۔ اس کی چنگھاڑ سے اطراف کانپنے لگتے۔

مہاوت نورا آئی ٹی او پہنچا تو مستان کے تیور دیکھ کر اس کے گلے میں اچھو لگ گیا۔ اس نے چاروں اطراف کا جائزہ لیا۔ گاڑیوں کی لمبی قطاریں، سہمتے، چیختے، گالیاں دیتے لوگ۔ پریشان نورا چوکنا ہوا تو مستان کو قابو کرنے آگے بڑھا۔ مستان ناراض لگتا ہے، دڑیل (پاگل) تھوڑے ہی ہوا ہے۔ گاڑیوں کے بیچ سے بچتا بچاتا وہ مستان کی طرف بڑھنے لگا تو پولیس والے باتیں کرتے دکھائی دیے۔

کانسٹیبل دھیان سنگھ چڑ کر بول رہا تھا، ''اس ہاتھی کا مہاوت... فرار ہے۔ صاحب کہتے ہیں، مالک کو ہی پکڑ لاؤ۔ وہی مہاوت کو ڈھونڈے گا۔ اب اتنی جلدی کہاں سے اس کے مالک کا پتا کریں؟ یہ ہاتھی تھوڑے ہی بتائے گا۔''

دوسرے کانسٹیبل نے سوچتے ہوئے کہا، ''معاملہ ایسا ویسا نہیں ہے۔ یہ ہاتھی صدر اور وزیر اعظم کی راہ روکے کھڑا ہے، اور نوکری ہماری جائے گی! یہ معاملہ کیسے بھی نپٹ جائے تو اس کے مالک اور

مہاوت کو بھس بھر دیں گے۔''

نورا وہیں ٹھٹھک گیا۔ مستان اگر قابو میں نہ آیا تو پولیس والے ابھی اس کی چمڑی ادھیڑ دیں گے۔ مستان قابو میں آ گیا، تب بھی ہاتھی کھلا چھوڑنے کے لیے پیٹیں گے۔ مستان کے نئے مالکان اَنڈ کمپنی والے اسے پریشان کریں گے۔

اَنڈ کمپنی؟ اصل میں نورا کے لیے 'گلوبل ایڈورٹائزنگ کمپنی' جتنا بڑا نام بولنا مشکل تھا۔ اینڈ کمپنی چھوٹی شکل تھی۔ نورا نے اسے اور چھوٹا کر کے 'انڈ کمپنی' کر لیا ہے۔ اسی کمپنی نے مستان کو تین لاکھ میں خریدا تھا۔ مستان کی وجہ سے انڈ کمپنی کو پریشانی ہوگی تو کمپنی والے بھی نورا کو پریشان کریں گے۔ مستان نے زیادہ اُدھم مچایا تو پولیس اسے مار دے گی۔ یہ سوچتے ہی نورا میں مستان کے لیے محبت نے زور مارا، لیکن مستان کی آنکھوں میں لالی دیکھ کر وہ پھر پیچھے ہٹ گیا۔ آنکس کو انگوچھے میں چھپائے وہ لوٹ کر ریلنگ پر بیٹھ گیا۔

''یا اللہ! اس کی آنکھوں میں پھر مُسہری[9] واردات والے دن جیسا غصہ ہے۔ اس نے پتو کو بھی کچل دیا... اتنے سال اسے پالا، اس سے روزی کمائی، اسے بچانا چاہیے۔ نورا کا نام مستان سے ہی چلتا ہے۔ اس کا مالک میں ہی ہوں... کاہے کا مالک؟ انڈ کمپنی والے جانیں، وہ بچائیں اپنے ہتیارے مستان کو! میں پتو کی نانی کو کیا جواب دوں گا؟ ہو کتنا بھی پالتو، ہے تو یہ جانور ہی۔ آگ اور تیز روشنی آنکھوں کے رستے اس کے دماغ میں گھس جاتی ہے۔ پھر وہ قیامت لانے پر اتر آتا ہے۔ یہ مسہری واردات والی جھلسن ہی ہے۔ اتنے سال بعد بھی وہ جھلسن ٹھنڈی نہیں ہوئی کیا...؟''

مستان آسام میں پیدا ہوا تھا۔ سات سال کا تھا، تبھی انسانی پکڑ میں آ گیا۔ ایک سال تک وہ پالتو بنایا جاتا رہا، پھر بک گیا۔ بہر حال، مستان کا بچپن مہذب دنیا میں بھی گزرا تھا۔ دلّی شہر سے ایک ہزار کلومیٹر دور منجھول گاؤں میں۔ بوڑھی گنڈک ندی کے کنارے بسے اس گاؤں کے قلعہ بابو نے اسے سن 1955 میں سون پور مویشی میلے سے خریدا تھا۔

قلعہ بابو نے اسے اپنے جیسا ہی منفرد نام دیا تھا۔ ورنہ ہاتھیوں کے نام رام کلی، گدا، بھیم وغیرہ

---

9 مُسہر: موس (چوہا) + آہار (غذا)، یعنی چوہے کھانے والے، نچلی ذات کے جانگلی، جانگلو قوم۔

Scanned with CamScanner

ہوتے تھے۔ ویسے مستان کہیں سے منفرد نہیں، عام ہاتھی تھا۔ منفرد تو قلعہ بابو تھے...

سانولے سوکھے پتوں والی اینٹھی ہوئی ڈالی جیسا جسم، ٹھگنا قد۔ چپٹی ناک پر چڑھا چشمہ، پان سے ایک دم کالے پڑ گئے دانت۔ ہنستے تو لگتا، پریت ہنس رہا ہے۔ جسم میں طاقت نہیں تھی، مگر تکڑم اور غصے سے بھرا جسم، سفید براق دھوتی، کرتا، ٹوپی میں بھرا بھرا نظر آتا تھا۔ بابو شری جنگ نارائن پرساد سنگھ! یہی ان کا اصلی نام تھا۔ ان کے ساتوں بیٹے 'ست بھیا' کہے جاتے تھے۔ وہ اپنے پتا کو بھگوان جیسا سمجھتے، اس لیے ان کے نام کے آگے 'بابو شری' ضرور لگاتے۔ لیکن دوسرے لوگ انھیں قلعہ بابو ہی کہا کرتے۔ اس اختصار کا بھی دلچسپ قصہ ہے۔

قلعہ بابو تب کے ضلع شہر مونگیر میں ایک راجا کے یہاں نوکری کیا کرتے تھے۔ مونگیر میں دو چار گاؤں والے راجاؤں نے بھی اپنے محل بنوا رکھے تھے۔ وہ بھی مونگیر کے راجا کہلانے میں اپنی شان سمجھتے تھے۔ یہ راجا اصل میں مال گذاری وصولنے والے ٹھیکیدار جیسے تھے، جو اس علاقے کی روایت کے مطابق زمیندار کہلاتے تھے۔ انگریز حاکم ان کے مالک تھے۔ ایسے ہی مونگیر کے راجاؤں میں سے ایک راجا کے یہاں قلعہ بابو نوکری کیا کرتے تھے۔ اس راجا کے قلعے پر انگریزوں نے قبضہ کر رکھا تھا۔ قلعہ راجا یا بنگال کے نواب میر قاسم کے اخلاف کا تھا، اس پر کافی تنازع رہا۔ میر قاسم تو انگریزوں سے لڑائی میں ہار گیا، لیکن اس راجا نے انگریزوں کے ساتھ لمبی مقدمے بازی کی۔ لندن کی پریوی کونسل میں جا کر فیصلہ ہوا کہ قلعے کے اندر کچھ حصہ راجا کو ملے۔ پورے قلعے میں انگریزوں کا راج تھا، سو راجا قلعے والے محل میں رہنے نہیں گیا۔ کافی توڑ پھوڑ اور ڈیزائننگ کے بعد اسے آرام گاہ بنا دیا گیا۔ اب وہ قلعہ ہاؤس کہا جانے لگا۔

قلعہ ہاؤس کی دیکھ بھال کے لیے بابو شری جنگ نارائن پرساد سنگھ جیسے پرانے معتمد کو تعینات کیا گیا۔ بنگالی رسوئیے چرن اور بٹلر جابر میاں کی بحالی ہوئی۔ بابو شری جنگ نارائن پرساد سنگھ قلعہ ہاؤس کے صدر رہتے تھے، لہٰذا انھیں قلعہ بابو کہا جانے لگا۔

قلعہ بابو کا کام تھا، مالک اور ان کے دوستوں کے لیے شراب اور شباب کا انتظام کرنا۔ وہ نہ صرف راجا کے بلکہ رَنی واس[10] کے بھی خاص تھے۔ بڑی خفیہ خبریں ان کے پاس ہوتی تھیں۔ بیکار

---

[10] رنی واس: زنانہ خانہ۔

Scanned with CamScanner

خبروں کے لیے رَنی واس سے انعام پاتے تو منھ بند رکھنے کے لیے راجا سے بخشش۔ وہ تنخواہ سے گھر چلاتے۔ قلعہ ہاؤس کی خالی پڑی سات ایکڑ زمین میں کھیتی سے آمدنی ہوتی۔ چھنالوں اور رنڈیوں سے ملے کمیشن کو جوڑ دیں تو اس زمانے میں بھی قلعہ با کی آمدنی دو ہزار روپیہ مہینہ بیٹھتی تھی۔

ان کی سیدھی پہنچ راجا تک تھی۔ وہ اس کا فائدہ اٹھاتے۔ ہر مہینے ایک نقلی کسان اور رشتے دار راجا صاحب کے سامنے کھڑا کروا دیتے۔ وہ فریاد کرتا، ''سرکار! آپ کے راج میں بسنے کے لیے زمین مل جائے تو ہماری کئی پشتیں احسان مند رہیں گی۔'' وہ پانچ سو روپے کا نذرانہ رکھ دیتا۔ راجا خوش ہو کر رعایا کو آشیرواد دیتا۔ زمین کسان کو دینے کا حکم ہو جاتا، لیکن دیوان جی کی ملی بھگت سے زمین بابو شری جنک نارائن پرساد سنگھ کے نام ہو جاتی۔ دیوان جی شوقین تھے۔ کبھی کبھار وہ چھپ کر قلعہ ہاؤس میں اپنی رکھیل کے ساتھ رات گزارتے۔ خیر، اس طرح قلعہ بابو کے پندرہ سو بیگھے جڑ گئے۔ آزادی کے بعد زمینداری روایت کا خاتمہ ہوا تو راجا برباد ہو گئے، لیکن قلعہ بابو کی حیثیت دھنی کسان والی ہو گئی۔ پھر بھی راجاؤں والی شہرت وہ کہاں سے لاتے؟ راجاؤں کی شان و شوکت دیکھ کر ویسی شہرت کی خواہش فطری طور پر ان میں بھی تھی۔ بعد میں وہ گاؤں میں رہنے لگے۔ کب تک من مار کر رہتے؟ آخر علاقے کا سب سے دھنی کسان ہونے کا ڈنکا بجانے کے لیے قلعہ بابو نے ہاتھی خریدا۔

پچاس گاؤوں میں ہاتھی کسی کے پاس نہیں تھا۔ ہاتھی کے آتے ہی ان کے دروازے پر دیکھنے والوں کی بھیڑ جٹ گئی۔ علاقے میں ہاتھی آنے کا شور ہو گیا۔ خاندانی پروہت بچو مسر نے کہا، ''ججمان! اس کا نام ایراوت رکھ دیجیے۔''

قلعہ بابو دستخط کرنے لائق ہی پڑھے تھے۔ انھیں کیا پتا، ایراوت کیا ہوتا ہے۔ تب بچو مسر نے سمجھایا، ''سرکار، اِندر سورگ کے راجا ہیں۔ ان کے ہاتھی کا نام ہے ایراوت۔ یہ پُران میں لکھا ہے... کابر جھیل کے آس پاس گاؤوں کو زمین کا سورگ سمجھ لیجیے۔ آپ ہیں یہاں کے راجا، اس لیے ہاتھی کا نام ایراوت ہی ہونا چاہیے۔''

قلعہ بابو متفق ہوتے نہیں نظر آئے تو بچو مسر نے اپنے سنسکرت گیان کے بوتے پر 'امر کوش' کا پٹارا ہی کھول دیا، ''سرکار، ناموں کی کیا کمی ہے؟ دنتی، دنتاوَلو، ہستی، دوِردو نیکپو دوپاہ۔ ہاتھی کے تو

Scanned with CamScanner

بہت نام ہیں۔ اِبھ، کُنجر، کری، کمبھی، چندر، چکر پاد، چل کرن، دَنتال، دوؤکا...''

قلعہ بابو نے جھڑکی دی، ''ای کیا سب بول رہے ہیں، مسر جی؟ آپ تو پورا بید پران ہی کھول کر بیٹھ گئے۔ ارے، ہاتھی کا نام رکھنا ہے، کوئی انسان کا نہیں۔ نام رکھنے کی بخشش آپ کو مل جائے گی۔ لیکن نام رہے گا— مستان!''

''سرکار، ایراوت کے سامنے... ویسے سرکار بہتر جانتے ہیں۔ مستان نام کی اپنی خوبی ہوگی۔''

قلعہ بابو کھل گئے، ''مونگیر میں ایک پہلوان دادا تھا۔ ٹھگنا، مگر طاقتور، پھرتیلا اور غضب کا ہمتی۔ ہمارے مشکل کام وہی کرتا تھا۔ اس کا نام تھا مستان۔ اسی لیے اس ہاتھی کا بھی نام رہے گا مستان!''

پنڈت بچّو مسر کو قلعہ بابو سے بخشش مل گئی۔ قلعہ بابو نے نہایت انکسار سے ہاتھ جوڑے۔ پنڈت جی کے جاتے ہی قلعہ بابو معمول پر لوٹ آئے۔ پاس کھڑے اپنے قابلِ اعتماد نوکر 'حرامی' سے بولے، ''ارے حرامی، یہ پنڈت سالا آدھا گھنٹہ ماتھا چاٹ گیا۔ اب چائے بنا کر لے آؤ۔''

قلعہ بابو کی یہ خصوصیت مشہور تھی۔ کوئی سامنے آتا تو وہ نہایت خلیق ہو جاتے۔ ویسے ان کی کنجوسی مشہور تھی۔ وہ کسی سے چائے شربت تک نہ پوچھتے۔ مہمان کو بس ایک لوٹا پانی مل جاتا۔ وہ اپنی عاجزانہ باتوں سے مہمان کا پیٹ بھر دیتے— ''اہاہا، ہمارے نصیب جو آپ ہمارے یہاں تشریف لائے۔ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بتایئے۔'' خوش و خرم مہمان کے جاتے ہی اپنے قابلِ اعتماد ہلکو (اسے وہ حرامی نام سے بلایا کرتے) کو بلا کر اپنی گالی گلوچ والی پھوہڑ عقل کا اظہار کرتے۔ ''ارے حرامی، یہ... تو آدھے گھنٹے میرا ماتھا چاٹ گیا...'' مستان کے آنے کے بعد ان کی لنگڑی مارنے کی یہ روش اور تند ہو گئی تھی۔

منجھول آنے کے بعد مستان کو دو چار راتیں کھلے میں گزارنی پڑیں۔ قلعہ بابو کے احاطے میں برگد کا گھنا پیڑ تھا۔ اسی کی پھیلی جڑوں سے اسے زنجیر سے باندھ دیا گیا تھا۔ اس کے پاؤں میں کنٹاہی بیڑی[11] تھی اور اس سے زنجیر جڑی تھی۔ اسے گھومنے نہ دیا جاتا، بس مکئی اور چنے کا دلیا گنے کے ٹکڑے اور پیپل کے پتے سامنے ڈال دیے جاتے۔

---

11 کنٹاہی بیڑی: نوکیلی بیڑی تا کہ ہاتھی بھاگ نہ سکے۔

جوان مستان کم گو تھا۔ وہ ہفتے میں تین چار بار ہی بولتا۔ جوانی میں انسان کتنی بک بک کرتا ہے! مگر وہ اداس بوڑھوں کی طرح چپ رہتا۔ کوئی شرارتی بچہ پتھر پھینک دیتا تو وہ غصہ کرنے کے بجائے معتدل ہو جاتا۔ اسے بچوں پر غصہ کرنا اچھا نہ لگتا، کیونکہ بچے ہی اس کے سب سے بڑے مداح تھے۔ اور بچوں سے کیا ڈرنا؟

مستان عام طور پر نڈر رہتا تھا۔ لیکن وہ کبھی آسام کے جنگل میں تیندوے اور گینڈے سے ڈرا کرتا تھا۔ رہائشی علاقے میں اسے بس چیونٹی اور آگ سے ڈر لگتا تھا۔ جورہاٹ کے جنگل میں اس نے اپنی ماں کو چیونٹیوں کے حملے سے تڑپ تڑپ کر مرتے دیکھا تھا۔ ہوا یہ کہ ایک بانس کے جنگل میں چیونٹیاں بھری پڑی تھیں۔ اس کی ماں بانس کی کونپلیں کھانے اس بن میں گئی تھی، وہیں وہ چیونٹیاں اس کی سونڈ میں گھس گئیں۔ گدگدی کے مارے وہ پاگلوں کی طرح چنگھاڑتی رہی۔ چھٹکارا پانے کے لیے جوہڑ اور گڑھوں کے پانی کو بلوتی رہی۔ سونڈ میں پانی بھر کر ماتھے تک لے گئی۔ پانی کو پچکاری کی سی تیزی سے باہر پھینکا۔ مگر چیونٹیاں باہر نہ نکلیں۔ وہ تب تک ماتھے تک پہنچ گئی تھیں۔ لاعلاج بیماری دیکھ کر اس کے جھنڈ نے اسے چھوڑ دیا۔ لیکن ننھا مستان اپنی ماں کے پاس منڈلاتا رہا اور آخر وہ مر گئی۔ بعد میں شکاریوں نے اسے اکیلا دیکھ کر، جال ڈال کر پکڑ لیا۔ اسے مہینوں تک گڑھے میں رکھا گیا۔ بھوکا رکھ کر اسے تربیت یافتہ اور انسانی تہذیب کے مطابق 'مہذب' بنایا گیا۔ وہ مہاوت کے اشارے سیکھتا، تبھی اسے کھانا ملتا۔

مستان زیادہ دور تک نہیں دیکھ پاتا تھا۔ سوجھ بوجھ اور ضبطِ نفس میں انسانوں سے تین پیڑھی پیچھے تھا۔ لیکن انسان سے وہ نہیں ڈرتا۔ وہ انسان سے دشمنی اور دوستی، دونوں کر سکتا تھا۔ بکتے وقت ہی نورا سے اس کی ملاقات ہوئی تھی۔ وہ اسے گڑ کھلاتا اور پچکارتا۔ نورا اُسے پہلی نظر میں ہی بھلا لگا تھا۔ درخت ڈھوانے والے آسامی مہاوتوں کی آواز میں غصہ بھرا ہوتا تھا۔ وہ اپنی مایوسی اور غصہ ہاتھیوں پر اتارتے تھے۔ وہ بات بات میں گجارا[12] گھونپتے، مارتے پیٹتے۔ مستان بھاگتا بھی تو کہاں جاتا؟ ہاتھی کا کوئی جھنڈ اسے اپناتا نہیں اور جنگل میں اکیلے جینا دوبھر ہو جاتا۔ مستان من مار کر وہیں رہتا رہا۔ خیر، نورا کی آواز میں غصہ نہیں ہوتا تھا۔ نورا صابر قسم کا انسان تھا۔ گھر میں بس بیوی تھی، کوئی بچہ ہوا

12 گجارا: گج (ہاتھی) + آر (ڈنک)۔ ہاتھی کے جسم میں چبھونے کا نوکیلا آلہ۔

Scanned with CamScanner

نہیں۔ایک بھانجے کو آس لگا کر پال رہا تھا۔زیادہ خرچ تھا نہیں، اس لیے جو مل جائے، نورا کے لیے وہی ٹھیک تھا۔خدا جدھر لے جائے، وہی لیک۔

فیل: ۔تیار ہوا تو پوجا پاٹھ کے بعد مستان نے گرہ پرویش[13] کیا۔نورا کو بھی قلعہ بابو کی طرف سے نئے کپڑے ملے۔وہ فیل خانے سے بڑی بڑی لید اٹھاتا۔دھواں کر کے مچھروں کو بھگاتا۔چارا دیتے، نہلاتے یا پاس بیٹھ کر بیڑی پھونکتے ہوئے وہ مستان کے سامنے اپنے سکھ دکھ کی باتیں بڑبڑایا کرتا، گویا مستان اس کی زبان جانتا ہو۔اس طرح مستان نورا کا رازدار بن گیا۔دراصل مستان انسانی آواز کے پیچھے چھپے احساسات کو سمجھ لیتا تھا۔وہ نورا کی خفگی، دکھ، پچھتاوے، لاڈ، مایوسی اور پیار کو محسوس کر لیتا۔اسی کے مطابق ردِعمل بھی کرتا۔اسے مایوس دیکھ کر اپنی سونڈ سے اسے سہلانے لگتا۔کبھی نورا رو پڑتا تو مستان سونڈ سے چھیڑ خانی کر کے اسے ہنسانے کی کوشش کرتا۔

مستان اپنی دیو قامتی سے دوسروں میں خوف پیدا کرتا تھا۔وہ دیو قامتی اور بے پناہ طاقت کی علامت تھا۔وہ ایک ایسا طلسم تھا جو ایک چابی سے کھل جاتا تھا۔وہ مسحور کرنے والا جادو تھا، جو خوفزدہ ہوتے ہی حقیقت بن جاتا، خوف کے ہٹتے ہی اپنی لمبی سونڈ اور دلکش، نرم دل جسم کے بوتے پر مسحور کرنے والا حقیقت سے جادو بن جاتا۔آنکس اور گجارا اس میں علامتی خوف جگاتے تھے۔پلک جھپکتے میں جادو سے حقیقت اور حقیقت سے جادو میں اس کی آمدورفت انٹرنیٹ کی رفتار سے بنی رہتی۔آنکس یا گجارا ہی اس کے اس اسرار کی چابی تھے۔یوں تو یہ چابی نورا کے پاس رہتی، مگر نورا پر قلعہ بابو کا قبضہ تھا۔سو مستان پر قلعہ بابو کا ہی پورا دخل تھا۔

ویسے قلعہ بابو مستان کے مالک تھے، لیکن اس پر کبھی اکیلے سواری نہ کرتے۔کہتے: ''جانور، بچے اور عورت پر کون بھروسا کرے؟'' سواری کے وقت نورا ضرور ساتھ رہتا۔انسان جانوروں کے موڈ کا بھروسا نہیں کرتا، مگر نورا مستان پر بھروسا کرتا تھا، کیونکہ وہ آدھا انسان تھا۔وہ بے خوف مستان کے پاس جاتا۔ویسے مستان آنکس یا گجارے کے بغیر بھی نورا سے ڈرتا تھا۔وہ نورا کی شفقت سے بندھا ہوا تھا۔مستان انسانوں کی دنیا کو نورا کے ذریعے ہی جانتا تھا۔

یہ بات انسانوں کو بھلے ہی شرمناک لگے، مگر سچ یہی ہے کہ ذہانت کے معاملے میں ہاتھی

---

13 گرہ پرویش: گرہ (گھر) + پرویش (داخلہ)۔نئے گھر میں داخلے کی نیم مذہبی رسم۔

Scanned with CamScanner

انسانوں کے پرکھے چمپینزی اور اورنگ اوتانگ سے صرف ایک سیڑھی پیچھے ہے۔ اس کی سونگھنے اور سننے کی حس اچھی ہے۔ وہ سوچتا بھی ہے۔ اس کا نظارہ تب دیکھنے کو ملا، جب مستان کے لیے نیا ہودہ لایا گیا۔ اس نے ہودے کو دور سے ہی دیکھ لیا۔ تب وہ کھڑا تھا۔ اس کی پیٹھ پر ہودہ جمانے کے لیے نورا نے حکم دیا، ''دچے! دچے! بیٹھ جا! بیٹھ جا!'' مستان نہیں بیٹھا۔ وہ کئی معمر ہاتھیوں کو ہودے کی چبھن سہتے دیکھ چکا تھا۔ اس حکم عدولی پر نورا کو غصہ آ گیا۔ اس نے گجارا چلا دیا۔ گجارے کی چبھن اور نہ سہنی پڑے، اس لیے مستان من مار کر بیٹھ گیا۔ پھر نورا کی جان میں جان آئی کہ مستان دڑیل (پاگل) نہیں ہوا ہے۔ ہودہ کسے جانے پر قلعہ بابو بیٹھ گئے۔ نورا نے پاؤں سے اشارہ کیا، ''اجھو! اجھو!'' مستان اٹھ کر چل پڑا۔ قلعہ بابو نے اپنے احاطے کا چکر لگایا اور راجا کا سا انداز لیے اتر گئے۔ لیکن قلعہ بابو مستان کے من پر برسوں لگے رہے۔

مستان نے قلعہ بابو کو منظور کیسے کیا، اس کی بھی چھوٹی سی کہانی ہے۔ فیل خانہ بننے کے بعد قلعہ بابو اس کے پاس پابندی سے آنے لگے تھے۔ ان کے آتے ہی مستان بے ترتیب ہو جاتا۔ اِدھر اُدھر ڈولتا۔ اپنی پیٹھ قلعہ بابو کی طرف کر دیتا۔ ان کی پچکار کا مستان پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ یہ بھانپتے ہی انھوں نے نورا کو حکم دیا، ''تم اسے گڑ مت دیا کرو۔'' اور خود مستان کو روز گڑ کھلانے لگے۔ مستان نے اندازہ لگایا، ''نورا تو بس چارہ دیتا ہے، وہ میٹھا نہیں ہوتا۔ گڑ چارے سے میٹھا ہوتا ہے۔ اس بوڑھے کے پاس گڑ رہتا ہے۔ اس کے ساتھ پینگ بڑھانے میں حرج کیا ہے؟'' اب نورا کے سکھائے پر وہ قلعہ بابو کو سونڈ اٹھا کر سلام کرنے لگا۔ قلعہ بابو سلامی لینے کے بعد ہی اسے گڑ کھلاتے۔ ان کے لیے نورا کی تابعداری دیکھ کر مستان قلعہ بابو کو مالک سمجھنے لگا۔

مستان کے جوان ہونے کے ساتھ ہی قلعہ بابو کی امیری پروان چڑھی۔ ان کا سکہ جم گیا۔ دو ٹریکٹر آ گئے۔ ذیلی محکموں کے اضافی دفاتر کے ٹھیکوں پر ان کا قبضہ ہو گیا۔ بوڑھی گنڈک ندی میں پھیری وصولی کا ٹھیکہ ان کی جیب میں پہنچ گیا۔ ریاستی اسمبلی کے ارکان، پارلیمنٹ کے ارکان اور وزیر آتے رہتے۔ داروغہ اور بی ڈی او تو لگ بھگ روز ہی حاضری لگاتے۔ کھیتی اور کاروبار ان کے ساتوں بیٹوں نے بخوبی سنبھال رکھا تھا۔ اتنی زیادہ زمین تھی، پھر بھی قلعہ بابو اور زمین خریدنے کو ایسے مستعد ہوتے جیسے لالچی بچہ مٹھائی کو لپکتا ہے۔ مستان کے بھی مزے تھے۔ جس کھیت میں مرضی ہوتی، گھس

Scanned with CamScanner

جاتا۔ دوسروں کے کھیت کو بھی قلعہ بابو کی ہی ملکیت سمجھتا۔ مستان کے مہاوت نورا کا بھی رعب تھا۔ بھلے ہی مستان کسی کا گنے کا کھیت تباہ کردے، مگر اس کسان کی نورا سے الجھنے یا قلعہ بابو سے شکایت کرنے کی ہمت نہ ہوتی۔ نورا کو پیٹھ پر بٹھا کر مستان منجھول گاؤں میں ایسے گھومتا جیسے تھانیدار گاؤں کی تلاشی لے رہا ہو۔

مستان کے پورا مرد بنتے بنتے دیس دنیا میں بہت سی تبدیلیاں آئیں۔ آزادی، مساوات، جمہوریت اور حقوق کے لیے جدوجہد تیز ہوئی۔ منجھول گاؤں کے مُسہر جاگے۔ موس (چوہا) پکڑ کر کھانے والے اور چوہوں کی طرح رہنے والے مسہروں کی نیند میں تبدیلیوں کے سپنے کلبلانے لگے۔ ان کی جھکی گردن تننے لگی۔ ذلت بھری زندگی کو گھسیٹتے رہنے کے بجائے مر مٹنے کا دور آ گیا۔ 'کم سے کم مزدوری لے کر رہیں گے! بیگار نہیں کریں گے! رہائشی زمین کا پرچہ دو!' جیسے نعرے گونجنے لگے۔

گیہوں کی کٹائی کے دن تھے۔ نو روپے پچاس پیسے روز کی مزدوری کی شرط سن کر قلعہ بابو کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ ''سالے مسہروں کو کم سے کم مزدوری چاہیے؟ ہماری زمین پر بسے ہیں اور رہائشی پرچہ مانگ رہے ہیں۔ آج مسہر ٹولی نے ہمت کی، کل دُسادھ[14] ٹولی میں آواز اٹھے گی۔ پندرہ سو بیگھے کی کھیتی ہے، کہاں کہاں سنبھالوں گا؟'' قلعہ بابو من میں صلاح کرنے لگے، ''سوراجی پاور میں بیٹھے ہیں۔ قانون کا راج ہے۔ سیدھے کچھ کرو تو بیلچھی کانڈ[15] کی طرح مشہور ہو جائے گا۔ کوئی سیاست سے اُکھڑا نیتا اپنی دہی پھر سے جمانے آ جائے گا۔ اخبار والے چیل کی طرح منڈلانے لگیں گے۔ ایسا کرو کہ سانپ بھی مرے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔''

انھوں نے نورا کو بلا کر اس کے کان میں کچھ کہا۔ نورا کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ وہ قلعہ بابو کے پیروں پر گر پڑا۔ ''مالک، یہ مت کروائیے مجھ سے۔ سیکڑوں کی جان جائے گی۔ پوری مسہر ٹولی اجڑ جائے گی۔ اور یہ مستان تو پگلا جائے گا۔ ہم نے اسے بچے کی طرح پالا ہے۔ چاہے اس کی آنکھ میں پھولا کی بیماری ہوئی ہو یا اسے تپ لرزہ ہوا ہو، دن رات اس کی خدمت کی ہے۔ ایسے گناہ کے لیے ہم آخرت میں کیا جواب دیں گے؟''

---

14 دسادھ: ہندوؤں کی ایک ادنیٰ ذات جو سؤر پالتی ہے۔

15 بیلچھی کانڈ: ایک مشہور واردات جس میں نچلی ذات والوں کی پوری بستی جلا دی گئی تھی۔

Scanned with CamScanner

قلعہ بابو کی آواز تیز ہوگئی۔ ''نورا، مسہر ٹولی کو بچاؤ گے تو تمھارا گھر اجڑ جائے گا۔ تمھاری بیوی نصیبن اور بھانجا رؤف دانے دانے کو ترس جائیں گے۔ اس علاقے میں ہاتھی اور کس کے پاس ہے، جو تم فیل بانی کرو گے؟ جو کہا ہے چپ چاپ کردو۔ دوش مستان پر جائے گا۔ کہہ دیں گے، مستان دڑیل (پاگل) ہوگیا تھا۔''

مجبور نورا قلعہ بابو کی دھمکی کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ اس نے بانس کے تین ٹکڑوں میں کپڑے لپیٹ کر مشعلیں بنائیں۔ رات گہرا گئی تو دو مشعلوں کو مستان کے دانتوں سے باندھ دیا۔ اس نے مستان کو مسہر ٹولی والے پیپل کے پیڑ کے نیچے کھڑا کیا۔ مستان گڑ میں ملی دیسی دارو کے نشے میں جھوم رہا تھا۔ مستان کی پیٹھ پر بیٹھے بیٹھے نورا نے تیسری مشعل سلگائی اور اس سے مستان کے دانتوں میں بندھی مشعلوں کو جلا دیا۔ مستان بوکھلا گیا۔ تبھی نورا نے اسے مسہر ٹولی میں گھسنے کے لیے ایڑ لگا دی اور خود پیپل کی ڈال سے پریت کی طرح لٹک گیا۔

جلتی مشعلوں کو جھٹکنے کے عمل میں مستان کی سونڈ جھلس گئی۔ پیڑا اور جلن سے بھنا مستان مسہر ٹولی میں گھسا۔ چاروں طرف جھونپڑیاں تھیں اور اوپر سے چاندنی رات کا وقت، جھونپڑیوں کے سوکھے ہوئے پھوس، سائیں سائیں بہتی ہوا، پہلی نیند میں ڈوبے مسہر، ایک جھونپڑی میں آگ لگی تو تیز ہوا نے اسے آندھی طوفان کی طرح اڑانا شروع کردیا۔ آگ چاروں طرف پھیلتی گئی۔ یم[16] کی طرح چنگھاڑتا مستان جدھر بھی جاتا، آگ کی خونی زبان جھونپڑی کو چاٹ جاتی۔ لوگ بھاگیں کدھر؟ مستان بھاگنے کے راستے کے بیچوں بیچ کھڑا تھا، مزاحمتی دیوار کی طرح۔ کوئی مسہر بکری بچانے میں جلا تو کوئی بچے یا بیوی کو بچانے میں۔ کوئی سوتے سوتے چتا کی بھینٹ چڑھ گیا۔ چھپن گھر ایسے جلے جیسے تندور میں روٹی جلتی ہے۔ مہیشواری منڈول کے ڈیرے والے پڑوسی کسان اس انتم سنسکار[17] کو چپ چاپ دیکھتے رہے۔ مسہروں کی آہ و بکا سے کوئی نہیں پسیجا۔

اگلے دن پولیس آئی۔ تین بری طرح جلے مسہروں کو پولیس بیگوس رائے اسپتال لے گئی۔ وہ تینوں بیان دینے سے پہلے ہی مر گئے۔ پولیس کو بس راکھ میں سے 182 کھوپڑیاں ملی تھیں۔ نہ کوئی

16 یم: یم دُوت، موت کا فرشتہ۔

17 انتم سنسکار: مرنے والے کی آخری رسوم۔

Scanned with CamScanner

مقدمہ لڑنے والا بچا، نہ کوئی گواہ۔ پھر جو ہوتا ہے وہی ہوا۔ اخباروں میں چھپا، پارلیمنٹ میں ہنگامہ ہوا، وزیر اعلیٰ آئے۔ کمبل، ریلیف یا معاوضہ کیا بانٹتے، کوئی لینے والا ہی نہ بچا تھا۔ سو وہ اس سیاسی ثواب سے محروم رہ گئے۔ وہ قلعہ بابو کے یہاں جوٹھن گرا کر پٹنہ لوٹ گئے۔ قلعہ بابو بے داغ رہے۔

دل میں ہزاروں تیروں کے گھاؤ لیے نورا مستان کو ڈھونڈتا پھرا۔ آتش زدگی کے اختتام پر مستان کو نورا نے ندی کی طرف بھاگتے دیکھا تھا۔ مستان ملا۔ منجھول سے چار کوس دور پر پہار گھاٹ کے پاس۔ نورا مستان کے پاس آیا تو وہ ایسے لپکا جیسے کچل دے گا۔ نورا دو دن اس کے پیچھے پڑا رہا۔ آخر بھوک کی جیت ہوئی۔ مستان پھر نورا کے قابو آ گیا۔ نورا نے فوراً اس کے دانتوں سے بندھے مشعل والے جلے ہوئے بانس کے ٹکڑوں کو کھول کر پھینکا۔

قاعدے کے مطابق اسے 'مستان واردات' کہا جانا چاہیے تھا، لیکن اسے 'مسہری ٹولی آگ واردات' کا نام دیا گیا۔ خیر، نورا کہیں بات اُگل نہ دے، اس لیے قلعہ بابو نے اسے مستان کے ساتھ چھ مہینے کے لیے اپنے بڑے سمدھی کے یہاں بھیج دیا۔

مستان اب بچوں جیسا معصوم نہیں رہ گیا تھا، ذُدانت ہو چکا تھا۔ تین دنوں تک نورا کے گجارے اور آنکس سے آزاد زندگی گزار کر مستان کو اپنی طاقت اور حیثیت کا احساس ہو چکا تھا۔ اب کبھی کبھی موج میں آ کر وہ نورا کی بھی ہدایت نہ مانتا۔ نورا پھر بھی اسے پیار سے دیکھتا۔ اسے مستان سے ایسی ہی امید تھی جیسی اپنے جوان ہوتے بیٹے سے کسی ہندوستانی خاندان کو ہوتی ہے۔ مستان کے بھیتر اتنا کچھ بدل گیا تھا، مگر اس پر سواری کرنے والے بچوں کو اس کی خبر نہیں تھی۔ وہ اس سے اپنے سپنوں کی طرح پیار کرتے تھے۔ اس کی کشش میں کھنچے چلے آتے تھے۔

پتو کو کچلنا مستان کی دوسری واردات تھی۔ لیکن پتو مستان کی صحبت میں آیا کیسے؟ پتو کے ماں باپ چل بسے تو بڑھیا نانی اسے منجھول لے آئی تھی۔ آٹھ سال کا پتو تبھی مستان سے ملا تھا۔ پتو گاؤں کے آخری محلے کی آخری جھونپڑی میں رہا کرتا تھا۔ اس جھونپڑی کے ایک طرف بنجر میدان تو دوسری طرف دور دور تک پھیلی بانس واڑی[18] تھی۔ مستان کو بانس کی کونپلیں اچھی لگتی تھیں، اس لیے وہ بانس واڑی کے پاس دیر تک رکتا۔

---

18 بانس واڑی: بانسوں کا کھیت۔

Scanned with CamScanner

ویسے مستان ذہنی طور پر تربیت یافتہ تھا۔ وہ بچوں کے لیے ناقابل مزاحمت تجسس تھا۔ اس کا سر ہلانا، سونڈ میں پانی بھر کر فوارے کی طرح چھوڑنا، کبھی زور سے چنگھاڑنا، اس کی پرکشش ادائیں تھیں۔ مستان کی پیٹھ سے لٹکتی گھنٹی کی آواز سنتے ہی دالانوں، آنگنوں، گلیوں اور گھروں سے بچے چیونٹیوں کی طرح جٹ جاتے۔ پتو بھی بھاگ کر آتا۔ دوسرے بچے اسے دور سے دیکھتے مگر پتو میں نہ جانے کہاں کی خود اعتمادی تھی کہ وہ مستان کی سونڈ یا پونچھ سہلا دیتا۔ باقی بچے اس کی اس زبردست ہمت پر فدا تھے۔

گرمی کے دن تھے۔ مستان چارا لادے چلا آ رہا تھا۔ اوپر بیٹھا نورا پیاس سے ہلکان ہو رہا تھا۔ اس نے پیپل کے پیڑ کی چھاؤں میں مستان کو کھڑا کر دیا۔ جھونپڑی کے اُسارے میں بیٹھا پتو پڑھ رہا تھا۔ اس کے پاس پہنچ کر نورا نے پینے کے لیے پانی مانگا تو پھرتیلا پتو اندر جا کر بالو پر رکھے گھڑے سے ٹھنڈا پانی لے آیا۔

پیٹ بھر کر پانی پی کر نورا لوٹا مانجھنے بڑھا تو پتو بولا، ''رہنے دیجیے، لوٹا کاہے کو مانجھتے ہیں؟''

''ہم مسلمان ہیں، تمھارا لوٹا چھوا جائے گا، اس لیے مانجھ دیتا ہوں۔''

''ہاتھی بھی چھوا جاتا ہوگا؟''

پتو کے بھولے سوال پر نورا ہنس پڑا۔ اس کے چیچک زدہ چہرے سے چپکی پانی کی بوندیں تھرک اٹھیں۔ اس نے پوچھ لیا، ''کیا نام ہے تمھارا؟''

''پتو، پتو پاسوان۔''

''تو پاسوان ہو! ڈُساد ھ سے بھی ہڈی چھوا تا ہے۔ پھر ہم تم ایک ہوے۔ تم ہو بھی ہمتی۔ ساتھ رہو گے تو تمھیں فیل بانی سکھلا دوں گا۔''

سانولے پتو کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس کی بے پایاں خوشی اس کے چمکیلے دانتوں میں سما گئی، جھلمل مسکان! سانولا پتو راج کماروں جیسا سندر تھا۔ چنچل، طاقتور، ہمتی اور نیک۔ نورا کی اپنی کوئی اولاد نہیں تھی۔ ہو سکتا ہے، پتو کے لیے اس کی محبت کہیں اس احساس سے بھی ابھری ہو! بعد میں نورا پتو کو ہاتھی کی مفت سواری کروا دیتا۔ ویسے بھی یتیم پتو کے پاس پیسہ کہاں تھا۔ ایک بار نورا اسے مستان پر بٹھا کر کابر جھیل تک لے گیا۔ تین گھنٹے بعد پتو لوٹا تو اس کی نانی رونے کلپنے میں لگی تھی، لیکن پتو کو دیکھتے

Scanned with CamScanner

ہی غصے میں اسے پیٹنے لگی۔ تب نورا نے ہی اسے بچایا تھا۔

پتو مستان کے چلتے کئی بار پٹا، لیکن مستان کے لیے اس کی کشش کم نہیں ہوئی۔ نا سمجھ پتو کو کیا پتا تھا کہ مستان ایک طلسم ہے، ایک جادو ہے۔ وہ جو ہے، وہ نہیں ہے۔ جو وہ نہیں ہے، وہی وہ ہے۔ وہ پیارا ہے تو بھیانک بھی نظر آتا ہے، بھیانک ہونے کے باوجود خوبصورت ہے۔ نورا جب بھی ادھر سے گزرتا، زور سے آواز لگاتا، ''پتو!'' اور پتو بھاگ کر اس کے پاس پہنچ جاتا۔ نانی اس سے چڑتی، پڑھائی لکھائی چھوڑ کر ہاتھی کے پیچھے بھاگتا ہے۔ نانی کے پاس فقط ایک جھونپڑی تھی، کھیتی باڑی نہیں۔ بڑھاپے سے ناتواں جسم۔ وہ چراگاہوں میں بھٹکتی ہوئی گوبر اٹھالاتی۔ اپلے تھاپتی۔ باغیچوں سے سوکھی ٹہنیاں بین لاتی۔ انھیں وہ بازار میں بیچ آتی۔ 'بجلی والے صاحب' کے یہاں جھاڑو پونچھا کرتی۔ کچھ کھانے کو جوٹھن اچھوتا مل جاتا۔ اترے کپڑے پہننے کو مل جاتے۔ پھر بھی نانی کی بڑی خواہش تھی کہ پتو 'بجلی والے صاحب' کی طرح ہی پڑھ لکھ جائے۔

اس دن نانی صاحب کے یہاں سے دہی لائی تھی۔ وہ پیار سے پتو کو کھلانا چاہتی تھی۔ لیکن پتو اپنے ہاتھ سے کھانے پر اڑا ہوا تھا۔

''لے، مر، سودھوا! اپنے ہاتھ سے چاٹ لے!''

پتو چاؤ سے انگلی ڈبو ڈبو کر دہی کھانے لگا۔ پھر وہ چونک گیا۔ دہی سے نکلا روٹی کا ٹکڑا۔ ایک ٹکڑا جلیبی کا اور دو ٹکڑے آلو کے! اس نے کٹورا اٹھا کر آنگن میں پھینک دیا تو نانی نے تڑاق سے اسے طمانچہ جڑ دیا۔

''دان پن کھانے میں نخرہ کرتا ہے! ہمارے پاس کوئی گائے ہے کہ دہی کھانے کو ملے گا؟ جا، اٹھا کٹورا! غریب کرے گا نخرہ!''

''جوٹھا ہے! دوسرے کا جوٹھا کھائیں گے؟ دہی میں روٹی، جلیبی، آلو کا ٹکڑا رہتا ہے کیا؟ بھوکے سو جائیں گے، پر ایسن دہی نہیں کھائیں گے!''

پتو رونے لگا تو نانی پگھل گئی۔ بجلی صاحب کی عورت بھی خوب ہے۔ اچھوتی دہی کہہ کر جوٹھن دے دیا! اب پتو کو کیا کھلائیں، کیسے چپ کرائیں؟

نانی نے اسے گود میں سمیٹ لیا اور سمجھانا شروع کیا، ''سب دن ایسن تھوڑے ہی رہے گا۔ تو

Scanned with CamScanner

پڑھے گا لکھے گا، صاحب بنے گا۔ بڑھیا بڑھیا چیز کھائے گا۔ نیا چکمک کپڑا پہنے گا۔ میرا ناتی راج کمار بن جائے گا۔''

''کیسے، نانی؟''

''سنو دھیان لگا کر۔ بہت پرانی کہانی ہے۔ بہت پہلے، کوئی سو سال پہلے کی بات ہے۔ ایک تھا لڑکا۔ بڑا کھلنڈو تھا۔ پڑھتا نہیں، ہمیشہ کھیلتا رہتا۔ اسے ہاتھی پسند تھا۔ جب بھی ہاتھی دیکھے، اس کے پیچھے بھاگے۔ اس کی خاطر گھر والے اسے ماریں پیٹیں۔ پٹائی سے اُوب کر لڑکا گھر سے بھاگ گیا... کئی کوس جانے کے بعد مندر کے پاس بیٹھا ایک تانترک[19] ملا۔ اپنے گیان کے بل پر وہ سمجھ گیا کہ لڑکا گھر سے بھاگا ہے۔ پڑھائی نہیں کرتا، بس ہاتھی کے پیچھے ڈولتا رہتا ہے۔ تانترک نے اسے کھلایا پلایا اور سمجھایا، گھر لوٹ جاؤ۔ لڑکا تھا ضدی، اڑا رہا۔ رونے لگا۔ آخر تانترک کو اس پر دیا آ گئی۔ اس نے سمجھایا، اگر گھر لوٹ جاؤ تو ایک راز بتا دوں گا، پھر تمھاری زندگی بن جائے گی... ہاتھی کے پیچھے گھومو، لیکن جہاں اس کے تلوے کا نشان ہو، وہاں اس کے تلوے کا سفید بال ڈھونڈو۔ جس دن سفید بال مل گیا، چمتکار (معجزہ) ہو جائے گا۔ کروڑ پتی بن جاؤ گے۔ پھر اپنا ہاتھی خرید لینا اور مزے سے سواری کرنا... لڑکا گھر لوٹ کر پڑھنے لگا۔ ہاتھی گھر کے پاس سے گزرتا تو چمتکاری بال بھی کھوجتا۔ ایک دن اسے چمتکاری بال مل گیا۔ سفید ریشم جیسا بال۔ چمتکاری بال کی خبر راجا تک پہنچی تو اس نے ڈھیر ہیرا موتی دے کر اسے خرید لیا۔ کروڑ پتی بنتے ہی لڑکے نے سب سے پہلے ہاتھی خریدا۔ نوکر چاکر آ گئے، بیاہ کیا اور سکھ سے رہنے لگا...''

نانی کو جھپکی آ گئی، لیکن پتو آنکھیں کھولے اپنے آپ میں ڈوب گیا۔ اپنا ہاتھی ہوگا تو اس کے ماتھے اور کان پر روز چترن[20] کروائے گا۔ ہاتھی کا تلک کیا جائے گا۔ سفید، نیلے اور لال رنگ سے بنے چترن میں اس کا ہاتھی مستان جیسا لگے گا۔ وہ نانی کو روز ہاتھی پر بٹھا کر گھمائے گا۔ کوشش کرے گا کہ مستان کو ہی خرید لے۔ پھر مہاوت بھی نورا چاچا کو ہی رکھے گا...

پتو جب آٹھویں جماعت میں پڑھ رہا تھا، مستان دلّی چلا گیا۔

---

[19] تانترک: جادو ٹونا کرنے والا۔

[20] چترن: نقش کاری۔

Scanned with CamScanner

پتو بڑا ہوتا گیا، لیکن مستان کے لیے اس کی کشش کم نہیں ہوئی۔ مستان اس کے لیے سنہرا مستقبل بنا رہا۔ وہ بھیانک غریبی میں جی رہا تھا— بنیادی ضروریات سے محروم اور معمولی خواہش سے بھی دور— لہٰذا اس کے لیے مستان کو دیکھنا بھرپیٹ کھانے، نئی قمیض، یا ایک فٹ بال یا چمچماتا بوٹ پانے جیسا سکھ تھا۔ اس کے لیے جو اچھا تھا، بہت بڑا تھا، مستان تھا۔ پچاس ٹن کا بوجھ کھینچ لینے والا، دو کوئنٹل[21] چارا ہضم کرنے والا۔ زمین پر مستان کے پاؤں کے نشان بھی تیس سینٹی میٹر قطر کے ہوتے، جیسے کوئی موٹا پیڑ ابھی ابھی چل کر گیا ہو۔ ہاتھی کو ذہن میں رکھ کر سپنے دیکھنا دماغی دورے کی حد پر پہنچ گیا تھا۔ جاگتے میں بھی اسے کروڑ پتی بننے کے سپنے آتے۔ اس کی پتلیاں ساکت ہو جاتیں، آس پاس کا دھیان نہ رہتا۔ آنکھوں میں تانترکوں کی سی چمک آ جاتی۔

لیکن حقیقت اپنی رو میں بہہ رہی تھی۔ مستان دلّی چلا گیا تھا۔ اِدھر نانی اور بوڑھی ہو گئی تھی۔ اب گوبر لانے، لکڑی چننے اور اپلے تھاپنے کی طاقت اس میں نہ رہی۔ بس 'بجلی والے صاحب' کا کام کسی طرح کر لیتی۔ جھونپڑی کے چھپر میں کئی چھید ہو چلے تھے۔ بارش کا پانی جھرنے کی طرح اندر آ جاتا۔ پتو نے دیکھا، اب خود کوئی کام کیے بغیر گزارا نہیں۔ لہٰذا سولہ سال کا پتو دسویں پاس کرتے ہی نصیبن سے نورا چچا کا پتا لے کر کام ڈھونڈنے دلّی روانہ ہو گیا۔ نانی کا واحد گہنا، چاندی کی ہنسلی، سنار کے یہاں بک گیا۔

لیکن مستان اور نورا کیوں دلّی چلے گئے؟ سب بدلتے وقت کا پھیر تھا۔ قلعہ بابو بوڑھے ہو گئے، بیمار پڑے۔ عجیب بیماری تھی، چمڑی کے اندر کھجلی چلتی رہتی۔ ان کا نوکر حرامی پورے جسم کو کھجلاتا رہتا۔ بعد میں مواد بھر گیا۔ جسم سے اتنی بدبو آنے لگی کہ حرامی جیسا سوامی بھگت نوکر بھی ان کے پاس جانے کو تیار نہیں تھا۔ وہ گل گل کر مرے۔ لاش اٹھانے کو بال بچے بھی تیار نہ تھے۔ آخر ناک پر پٹی باندھے ڈوم ان کی لاش پر کافی عطر چھڑکنے کے بعد اسے ٹریکٹر پر لاد کر شمشان گھاٹ لے گئے۔ داہ سنسکار[22] جتنا بدبودار تھا، مرتک بھوج[23] اتنا ہی شاندار۔ سو گاؤوں کے براہمن بھوج کھانے آئے۔ گوتیوں

---

21 کوئنٹل: سو کلوگرام۔

22 داہ سنسکار: ہندوؤں میں مردے کو جلانے کی رسم۔

23 مرتک بھوج: ہندوؤں میں موت کے بعد کی کھانے کی دعوت۔

Scanned with CamScanner

(برادری والوں) سمیت پورا گاؤں تین دن بھوج کھاتا رہا۔ بڑا جے جے کار ہوا، لیکن فوراً بعد خاندانی جھگڑے ابھر آئے۔ تبھی موقع دیکھ کر سرکار نے زمینی حد بندی قانون کے تحت ایک ہزار بیگھے زمین اپنے قبضے میں لے لی۔ ان کے ساتوں بیٹوں نے جائیداد کا بٹوارا کرلیا۔ ستر بیگھے زمین سب کو ملی۔ ٹریکٹر کی قیمت لگی۔ مستان کو بیچنے نورا سون پور میلے جاتا رہا، مگر تین سال تک مستان نہیں بکا۔ گاہک ہی نہیں آیا۔ لاکھوں روپے کا دکھاوٹی خرچ کون کرے؟ ٹریکٹر خریدو تو کھیت بھی جتے گا اور کرایہ بھاڑا بھی ملے گا۔ ہاتھی رکھ کر کیا کریں گے؟ نورا کی مزدوری پر بھی آفت آگئی۔ پھر قلعہ بابو کے بڑے بیٹے راگھو بابو نے کہا، ''ہاتھی کو لے جاؤ دلّی۔ وہاں جلوس مظاہرے، شادی بیاہ میں اسے کرائے پر لگاؤ۔ مستان کو کھلاؤ، اپنی مزدوری نکالو۔ کچھ بچے تو ہمیں دے دینا۔'' سو، روزگار کی تلاش میں نورا مستان کو لے کر دلّی چلا گیا۔

اس وقت آئی ٹی او پل کے نیچے ہاتھی نسل کی آبادی کل دو نفر تھی— مستان اور سلطانہ۔ اب دونوں میں پریم ہونا ہی تھا۔ مستان اور سلطانہ جب ندی میں ملتے تو جمنا ندی کی مچھلیوں، کیکڑوں اور گھونگھوں کی شامت آجاتی۔ وہ پانی کو بلو کر رکھ دیتے۔ محبت کا اظہار طرح طرح سے ہوتا۔

یہاں آکر مستان کے دو اور دوست بن گئے تھے— بگلا اور کتا۔ بگلا برھمرشی [24] جیسا دھیان لگائے رہتا۔ جیسے ہی کوئی مچھلی سامنے آئی نہیں کہ اسے چگ لیا۔ لمبی ڈکار لے کر برھمرشی پھر دھیان میں مگن ہو جاتا۔ برھمرشی کبھی کبھار مستان کی پیٹھ پر جا بیٹھتا۔ مستان کی پیٹھ سے چپکا کوئی کیڑا مستان کو تنگ کر رہا ہوتا تو اسے چگ لیتا۔ کتے کو ٹپوری [25] نام نورا نے دیا تھا۔ بے بات بھونکنے، گمبھیر بات کو بھی اشتعال میں بدل دینے اور مُوت مُوت کر پھوہڑپن پھیلانے کی اس کی عادت تھی۔ گو کہ مستان سبزی خور تھا، پھر بھی اپنے وفادار ٹپوری کے لیے اسے کسی نہ کسی جاندار کو کچلنا پڑتا۔ جب مستان جمنا میں نہانے نکلتا تو برھمرشی اڑ کر اس کی پیٹھ پر بیٹھ جاتا۔ اسے اڑانے کے لیے مستان پانی میں لیٹ جاتا تو چالاک برھمرشی پھُر سے اڑ جاتا اور ہوائی جہاز کی طرح چکر لگا کر ٹپوری کے پاس کنارے پر لینڈ کر جاتا۔

مستان سلطانہ کے ساتھ پریم میں ڈوبا رہتا۔ ادھر کنارے پر بیٹھے برھمرشی اور ٹپوری کڑھتے

رہتے کہ کب ختم ہو یہ راس لیلا[26] اور سنان گھڑی[27] اور ہم لوٹیں اپنے ٹھکانے کی جانب۔ اس پریم پرسنگ[28] سے چڑ اور رقابت صرف ان دونوں کو نہیں تھی، نورا بھی اس پریم کو اپنے نقصان کے روپ میں دیکھ رہا تھا۔ اسے سلطانہ کے ساتھ دیکھتا تو جھنجھناتا، ''سالا! مفت میں پال کھیلنے جاتا ہے۔ اگر سلطانہ گابھن ہوئی تو ادریس سے پیسے وصولے بغیر نہیں رہوں گا۔ ادریس کو اپنی ہتھنی کو پال کھلانا ہے تو لے جائے آسام کے جنگل میں! بچہ ہوگا تو لاکھوں کی قیمت ادریس کو ہی ملے گی۔ خرچ کیا ہوگا؟ کچھ نہیں۔ بیس بائیس مہینے تک گابھن سلطانہ کی دیکھ بھال کرنی پڑے گی، بس!'' لیکن ادریس سوچتا، ''یہ نورا اپنے مستان کو قابو میں کیوں نہیں رکھتا؟ اسے آوارہ گردی مت کرنے دو۔ سلطانہ مستان کو بھگا تو نہیں لے جاتی؟ مستان ہی پیچھے پڑا ہے۔ پھر میں پال کھلانے کے پیسے نورا کو کیوں دوں گا؟'' اس کا نتیجہ مار پیٹ کی صورت میں نکلا۔ آخر دبلا پتلا ادریس اپنی سلطانہ کو لے کر پرانے پل کے پاس رہنے چلا گیا۔

بعد میں زور آور، بڑکن، بم بم اور دلاور جیسے ہاتھی بھی مستان کے پاس ہی آکر رہنے لگے۔ سلطانہ کبھی کبھار آئی ٹی او پل کی طرف آجاتی تو سبھی ہاتھی اس کے پاس منڈلاتے۔ سلطانہ پر مستان کا واحد حق نہیں رہا۔ لہٰذا وہ نہانے کے بہانے سلطانہ سے ملنے پرانے پل کی طرف جاتا۔

پتو کا آنا نورا کو اچھا ہی لگا۔ اب وہ مستان کو پتو کے بھروسے چھوڑ کہیں آجا بھی سکتا تھا۔ سولہ سال کے پتو کو مستان نے فوراً نہیں پہچانا۔ کئی دنوں کے بعد اس نے پتو کو اپنی سونڈ سہلانے دی۔ پتو روزانہ اپنے علاقے کے لوگوں سے ملنے نکلتا، تاکہ کہیں نوکری کی جگاڑ ہو جائے۔ نورا بھی اس کے لیے بھاگ دوڑ کر رہا تھا۔ پتو کو لگتا کہ اسے نوکری مل جائے تو اس کے دن پھر جائیں گے۔ نانی کو پیسے بھیج سکے گا اور مستان کے پاس بھی رہ سکے گا۔ کیا پتا چمتکاری بال کسی دن مل جائے! وہ نورا کو خوش کرنے میں بھی لگا رہتا۔ آخری اسی کے بوتے پر تو اس نے دلی آنے کی ہمت کی تھی۔

---

26 راس لیلا: کرشن کا گوپیوں کے ساتھ رقص۔

27 سنان گھڑی: نہانے کا وقت۔

28 پریم پرسنگ: love affair

نورا مستان کو نہلانے جاتا تو مستان پر پابندی رہتی۔ یہ مستان سمجھتا تھا۔ پھر نورا نے ایک دن نہلانے جاتے وقت اسے بیٹھنے کو کہا، ''بچے! بچے!'' مگر مستان نے نورا کو سونڈ سے ٹھیل دیا۔ نورا کھسیا گیا، ''سالا! مجھے ہی دھکا دیتا ہے! اکیلے نہانے میں روک ٹوک نہیں ہوتی نا! اکیلے جائے گا؟ آں؟ اپنے دوست ٹپوری اور اس بگلے کے ساتھ جائے گا؟ تو اپنے چمچے پتو کو بھی ساتھ لیتا جا... پتو! اے پتو! ذرا مستان کو نہلانے لے جا۔ یہ نہائے گا تو تو دور سے اس پر نظر رکھنا... سالا، آج کل صاحب ہو گیا ہے۔ پرائیویٹ غسل خانے میں نہائے گا!''

پتو کے آنے سے پہلے ٹپوری اسسٹنٹ مہاوت کا کام کرتا تھا۔

مستان زیادہ دور تک نہیں دیکھ سکتا تھا۔ بگلا برھمر شی اس کی یہ کمی پوری کر دیتا۔ مستان بھٹکنے لگتا تو برھمر شی اس کے کان کی جڑ میں چونچ مار کر اسے ہوشیار کر دیتا۔ مستان کو راستہ بدلنا پڑتا۔ چلنے کا وقت آتا تو ٹپوری بھونکنے لگتا۔ ٹھکانے پر پہنچ کر ٹپوری آرام کرتا اور برھمر شی واپس پیپل والے گھونسلے میں پہنچ جاتا۔

نورا کی کوشش مہینے بھر بعد رنگ لائی۔ پتو کو آخر کار نوکری مل گئی۔ ربڑ کی ایک چھوٹی فیکٹری تھی۔ وہاں سانچے میں پگھلے ربڑ کو ڈال کر موٹر والوں، انجنوں کے پارٹ، پرزے بنائے جاتے تھے۔ ہزار روپے مہینہ اور مہینے میں چار دن چھٹی۔ پتو نے پہلی تنخواہ لا کر نورا کو دی تو اس نے گلے لگا لیا۔ مٹھائی منگائی گئی۔ مستان کے لیے ایک کلو گڑ پتو بھاگ کر لے آیا۔ نورا نے اگلے دن پتو کی نانی کے نام سے منی آرڈر بھجوا دیا۔ وہ ان کاموں میں ماہر تھا۔ آخر مستان کے مالکوں کو ہر مہینے پیسے بھیجتا تھا۔

مستان کی کمائی بھی خوب ہو رہی تھی۔ وہ نمائشی جلوس، تیوہاری جلوس میں جاتا۔ سرکاری اجتماعات میں اس کی طلبی ہوتی۔ شادی بیاہ میں تو اس کے مزے رہتے۔ دلّی میں شادیاں پورے سال چلتیں، کیونکہ الگ الگ حسب نسب کے لوگ آ کر بس گئے تھے۔ کسی کی دن کو شادی، کسی کی رات میں۔ چھٹی کے دن وہ پکنک کے مقامات پر چلا جاتا۔ بچے، سیانے سواری کرتے اور پیسے دیتے۔ غیر ملکی سیاحوں کو سواری کرانے ہوٹل والے بلاتے۔ شہر پھیل رہا تھا۔ نئی نئی غیر ملکی کمپنیاں لوگوں میں اپنی مصنوعات کے لیے کشش پیدا کر رہی تھیں۔ چاروں طرف اشتہار بازی کے داؤ پیچ تھے۔

Scanned with CamScanner

بس ان کے بینر ہودے کے دونوں طرف لٹکاؤ اور صبح سے شام تک الگ الگ علاقوں میں گھومتے رہو۔لوگ ہاتھی دیکھنے کے بہانے بینر بھی پڑھتے، پر چار ہو جاتا۔

تبھی مستان اور نورا کی زندگی میں ایک بھونچال آ گیا۔ مستان ایک مذہبی تقریب میں گیارہ دنوں کے لیے پلول گیا ہوا تھا۔ اِدھر دِلّی کے دو ہاتھیوں کو تپ لرزہ کی بیماری ہوگئی۔ سبھی ہاتھی والے اس بیماری کے مارے دِلّی سے بھاگ گئے۔لوٹ کر نورا نے دیکھا کہ سارے ہاتھی غائب ہیں۔ وہ چِنتا میں ڈوب گیا۔کیا ہوگیا؟ کہاں گئے سب؟ کیا سب کا ایک ساتھ ساٹا[29] ہوگیا؟ اندھیرا گھرا تو کھانستا چتّو آیا۔اس نے سائیکل لگائی اور اکھڑتی سانس سنبھالنے لگا۔اس دوران نورا اس سے دوبار پوچھ چکا۔

''سانس تو لینے دو...ربڑ فیکٹری کے دھویں سے یہ گت بن گئی ہے۔''

''تو پھر وہاں کا کام چھوڑ دے۔''

''کیسے چھوڑ دوں؟ اوور ٹائم سب جگہ نہیں دیتے۔ٹوٹی جھونپڑی بنانے کے لیے پیسہ چاہیے۔''

''میں دے دیتا ہوں پیسے۔تو دوسری جگہ کام دیکھنا شروع کر دے۔لے، پانی پی۔''

غٹا غٹ پانی پینے کے بعد چتّو نے بتایا،''یہاں کے دو ہاتھیوں کو تپ لرزہ کی بیماری ہوگئی۔ڈاکٹر کو دکھلایا تو بولا، چھوت کی بیماری ہے۔سارے ہاتھیوں کو ہو جائے گی۔بس، سب چلے گئے۔برسات بھر اپنے گاؤں رہیں گے۔''

''تب تو چار مہینے بہت کمائی ہوگی، رے!''

''ہوگی، چچا! میرا بنایا بورڈ 'یہاں ہاتھی رہتے ہیں' کام آ گیا۔اسے دیکھ دو کار والا صاحب آیا تھا۔اسے تین مہینے کے لیے ہاتھی چاہیے۔پر چار والا کام بتا رہا تھا۔کل پھر آئے گا۔''

''اور کوئی ہاتھی ہے نہیں، پھر تو تین ہزار روز بھی مانگوں تو دے دے گا۔بس، آ جائے!''

''ضرور آئے گا۔وہ تو راگھو مالک کا گاؤں کا پتا بھی لکھ کر لے گیا ہے۔ہم نے کہا کہ پلول کا پتا نہیں معلوم تو بولا مالک کا پتا دے دو۔''

نورا اپنے کو بہت چالاک سمجھ رہا تھا۔اس نے تین ہزار روپے روز کا نرخ بتایا۔اس پر گلوبل ایڈورٹائزنگ کمپنی والے صاحب نے کہا،''تین مہینے میں لاکھوں بنیں گے۔تم ٹھہرے نوکر، مالک کو

---

29. ساٹا: کام کا معاہدہ۔

بلاؤ، معاہدہ اسی سے ہوگا۔''

تار بھیجنے پر راگھو بابو آئے۔ کمپنی والوں سے جا کر ملے۔ شام کو کمپنی والوں کے ساتھ ہی لوٹے، مگر بولے، ''نورا، مستان کو ہم نے اس کمپنی کو بیچ دیا ہے۔ اب مستان کے چارے کا خرچ اور تیری تنخواہ کمپنی دے گی۔ مستان کی کمائی کمپنی لے گی۔''

یہ انڈ کمپنی والے وڑیل ہو گئے ہیں کیا، جو ہاتھی خریدنے پر اتر آئے؟ لیکن انڈ کمپنی کے ایرکنڈیشنڈ دفتر میں جا کر اس کی سمجھ میں آیا کہ کمپنی والے وڑیل نہیں، پورے گھاگ ہیں۔ یا خدا! کتنے سوال پوچھے ان لوگوں نے! مہینے میں کتنا چارا کھاتا ہے؟ جڑی بوٹی کیا کیا کھلاتے ہو؟ مستان نر ہے یا مادہ؟ ہاتھی مہینے میں کتنے دن کرائے پر چلتا ہے؟ کمپنی بابو مشین پر سب کچھ لکھے جا رہا تھا اور سارا کچھ مشین کے پردے پر دکھ رہا تھا۔ یا خدا! کیا فون تھا! بٹن دباؤ اور سات سمندر پار بات کرلو۔ کتنا پیسہ ہے انڈ کمپنی والوں کے پاس! چپراسی تک کو تو پانچ ہزار روپے تنخواہ دیتے ہیں۔

نورا کی تنخواہ مقرر ہوئی چھ ہزار! مستان کا بھی بھتہ طے ہوا تین ہزار! لیکن کمپنی بابو نے چلتے چلتے ہدایت دے دی، ''تم اب ہاتھی کا ساٹا نہیں کرو گے۔ یہ کام اب ہم کریں گے۔ ہم بتائیں گے کہ تمھیں مستان کو کہاں کہاں کام پر لے جانا ہے۔''

مستان کو وآپی لانے کے بعد نورا خود کو مالک سمجھنے لگا تھا۔ تین لاکھ میں مستان کو خرید کر کمپنی والوں نے نورا کو پھر سے نوکر بنا دیا! بات کرائے کی تھی، پھر بک کیسے گیا؟ کمپنی والوں نے سوچا کہ تین مہینے میں ڈھائی لاکھ دیں، اس سے اچھا ہے، تین لاکھ میں خرید ہی لو۔ ایک اچھی کار خریدنے جتنا ہی پیسہ تو لگے گا۔ راگھو بابو کو لگا، مستان بک نہیں رہا تھا، چلو بلا ٹلی۔ اس سب کے چلتے نورا اندر سے اکھڑ گیا تھا۔ بڑی آمدنی گئی، رعب گیا، آزادی گئی، خود مختاری گئی اور اوّل بات یہ کہ مستان سے اس کے رشتے میں پھانک آ گئی۔ اب جلوس، شادی بیاہ میں مستان کا جانا بند ہو گیا۔ وہ کولگیٹ ٹوتھ برش سے لے کر بورن ویٹا تک کے پرچار میں لگا رہتا۔ کمپنی والوں کے اشارے پر خریداروں میں لالچ جگانے میں لگا رہتا۔

اس کے بعد ٹھکانے پر مصیبتیں بڑھتی گئیں۔ ایک دن پتو کو فیکٹری میں ربڑ والے دھویں کے نتیجے میں کھانسی شروع ہوئی تو پانی، دوا، کسی کا اثر نہیں ہوا۔ آخر دھم سے خون آ گیا! فرش پر خون دیکھتے ہی سپروائزروں اور مزدوروں میں دہشت پھیل گئی۔ ایک سپروائزر مالک کے دفتر گیا اور لوٹا تو وہی کیا

Scanned with CamScanner

جس کا وہاں رواج تھا: ''ٹی بی والے مزدور کا حساب کر دو، دوسرا مزدور لے آؤ۔''

ایک ساتھی مزدور چتو کو سائیکل پر بٹھا کر ٹھکانے پر لے آیا۔ سائیکل سے اتر کر چتو جیسے ہی کچھ قدم چلا، پھیپھڑے دھونکنی کی طرح چلنے لگے۔ چارپائی پر بیٹھتے بیٹھتے پھر خون کی الٹی ہو گئی۔ پریشان نورا نے اس مزدور سے کہا، ''بھیا، تھوڑی دیر اس کے پاس رہنا، میں ابھی ڈاکٹر کو لایا۔''

کمپاؤنڈر سے ڈاکٹر بنا بنگالی پل کے نیچے بسے لوگوں کا واحد سہارا تھا۔ اس نے چتو کو سوئی لگا دی۔ پھر بولا، ''اسے تو پہلے بھی کہا تھا کہ ٹی بی کا شک ہے۔ میرا شک صحیح نکلا... نورا، اسے ٹی بی اسپتال میں دکھلاؤ۔ بیماری کافی آگے بڑھ گئی لگتی ہے۔ علاج ہو اور غذائیت والی خوراک ملے تو بچ جائے گا۔''

ڈاکٹر اور مزدور کے جانے کے بعد نورا نے چڑ کر پوچھا، ''چتو، تم نے ٹی بی والی بات مجھ سے بھی چھپالی؟ کیوں؟ اب تمھیں کچھ ہو گیا تو تمھاری نانی کو کیا جواب دوں گا؟''

چتو چپ ہی رہا۔ نورا اس کے من کی بات سمجھتا تھا۔ یہاں رہے گا، علاج ہو جائے گا، مستان کے پاس اس کا دل بھی لگا رہے گا اور نانی سے بیماری کی بات بھی چھپ جائے گی۔ نورا نے چتو کی نوکری چھوٹنے اور دوسری نوکری ڈھونڈنے کی کوشش والی چٹھی نانی کو بھجوا دی۔ وہ بھی کیا کرتا، کتنا کہنے کے بعد بھی چتو منجھول لوٹنے کو تیار نہیں تھا۔ چتو دوا کھاتا۔ نورا انڈا، مچھلی اور دودھ روز لانے لگا۔ کھانا بھی نورا ہی بناتا۔ چتو بس پڑا رہتا، لیکن مستان کے بتھان[30] پر جھاڑو ضرور لگاتا، کیا پتا چنگاری بال مل جائے۔

آئی ٹی او پر ہنگامہ اور بڑھ گیا تھا۔ ملکی وغیر ملکی ٹیلی وژن کے کئی کیمرا مین مستان کی فلم بنا رہے تھے۔ پرنٹ میڈیا کے فوٹوگرافر بھی نادر تصویریں اتارنے میں جٹے ہوئے تھے۔

نورا کو ڈھونڈنے کے لیے جانے والا سپاہی پولیس ہیڈکوارٹر لوٹ آیا تھا۔ اس نے پل کے نیچے کافی لوگوں سے پوچھا، مگر مہاوت کا پتا کوئی نہیں بتا پایا۔ سب کہتے چتو کو پتا ہوگا۔ ہاتھی کے ٹھکانے پر بس ایک لاش ملی۔ جھگی والوں نے بتایا کہ چتو ٹی بی کا مریض تھا۔ اسے خون کی الٹی ہوا کرتی تھی۔ مستان کی وہ بہت خدمت کرتا تھا۔ ایسے میں مستان اسے یوں کچل کر کیوں مارے گا؟ خیر، یہ معاملہ تو بعد میں صاحب لوگ دیکھیں گے۔ اب لاش سے مہاوت نورا کا پتا کیا پوچھیں؟ مالک کا پتا کسی کو معلوم نہ تھا۔

---

30 بتھان: جانوروں کے باندھنے کی جگہ۔

فون سے الجھا، تناؤ زدہ پولیس کمشنر ہاتھی ہٹانے کی کوشش کی اطلاع کسی کو فون پر دے رہا تھا۔ جب مہاوت اور مالک کا پتا نہ چلنے کی خبر ملی تو کمشنر نے پی ایم کے پرنسپل سیکریٹری سے کہا، ''پریزیڈنٹ اور پی ایم صاحب کا پروگرام رکوا دیجیے۔''

لیکن راشٹر پتا کے جنم دن پر ملک کی حزب اقتدار اور حزب اختلاف کے ممتاز ترین افراد نہ جائیں، یہ کیسے ہوسکتا تھا؟ وہ بھی ایک ہاتھی کی وجہ سے؟ پہلے ایک تجویز آئی تھی کہ ہاتھی کو مار دو یا بے ہوش کر دو۔ لیکن پھر اندیشہ ہوا کہ ماحولیاتی کارکن اور حیوان دوست ادارے جھگڑا کھڑا کر دیں گے۔

پولیس کمشنر نے پھر کہا، ''سر، وی آر ہیلپ لیس۔ اتنے کم وقت میں کچھ نہیں ہوسکتا۔ کوئی راستہ نہیں نکل رہا۔ پروگرام ملتوی کرنا ہی پڑے گا۔''

پرنسپل سیکریٹری نے جھڑکی دی، ''پریزیڈنٹ اور پی ایم ایک ہاتھی کی وجہ سے راشٹر پتا کے جنم دن کا پروگرام ملتوی کریں گے؟ وہ کسی ٹاپو نما دیس کے نہیں، بھارت جیسے مہان دیس کے صدر ہیں۔ میں ابھی دوسرا انتظام کرتا ہوں۔''

آدھے گھنٹے بعد چار ہیلی کاپٹر آئی ٹی او کے اوپر سے اڑتے ہوئے گزرے۔ ان کی بھاری گھڑگھڑاہٹ سے بوکھلایا ہوا مستان اور چنگھاڑنے لگا۔ اس کے پاؤں تیزی سے حرکت میں آ گئے۔ وہ تیزی سے مڑا اور سامنے کھڑی ماروتی کار پر اس نے اپنا ایک پاؤں رکھ دیا۔ وہ سامنے سے ماچس کی طرح پچک گئی۔ مستان کے آس پاس جو چھوٹی گاڑیاں، اسکوٹر، موٹر سائیکلیں پڑیں، وہ بھرتا بنتی گئیں۔ ڈرائیوروں، سواریوں اور تماش بینوں میں بھگدڑ مچ گئی۔

آسمان میں بادل شہد کی مکھی کے چھتے جیسا لٹک آیا تھا۔ تیز ہوا تھمی تو بوندیں پڑنے لگیں۔ بارش سے بھاگ کر نورا نے بس اسٹینڈ میں پناہ لی۔ اس نے دل ہی دل میں دعا کی، ''یا اللہ! مستان کا دماغ ٹھنڈا کر دے۔ اسے پاگل ہونے سے بچا لے۔'' بارش ہوتی رہی، لیکن مستان کا چنگھاڑنا تھما نہیں۔ اس نے توڑ پھوڑ کرنا بند نہیں کیا۔ جب گھنٹہ بھر بیت گیا تو نورا کا رہا سہا موہ چھوٹ گیا! اچانک! 'مستان پکا وڈیل ہو گیا ہے! اس ہتیارے نے میرے چتو کو نہیں چھوڑا تو مجھے کیوں بخشے گا؟ یہ پیار سے نہیں، خوف سے چلتا ہے۔ نورا، آج نہ کل، تمھیں پولیس گھیرے گی ہی۔ چتو کی کچلی لاش کی کیا صفائی دو گے؟ جان کی خیر چاہتے ہو تو بھاگو!'

Scanned with CamScanner

بیچ بارش میں ہی نورا گاڑیوں کے بیچ سے نکلتا ٹھکانے پر پہنچا۔ پڑوسیوں کو اکٹھا کر کے پتو کی لاش فوراً پھونکنے کا انتظام کیا۔ ایک ہندو پڑوسی اور مندر والے پنڈت جی کی مدد سے پتو کی چتا سے ہڈیاں چنوالیں اور اسٹیشن روانہ ہوگیا، 'جو بھی گاڑی ملے گی، اسی میں بیٹھ جاؤں گا۔'

کانسٹیبل دھیان سنگھ کو پھر بھیجا گیا مستان کے ٹھکانے پر۔ وہاں اسے اشتہار بازی والے کچھ بینر ملے۔ ان پر لکھا تھا گلوبل ایڈورٹائزنگ کا فون نمبر۔ بس، کمپنی کے چیف ایگزیکٹو افسر پولیس ہیڈکوارٹر میں طلب کر لیے گئے۔ لیکن ایڈورڈ پی سیموئیل کے پاس بھی نورا کا دلّی والا ہی پتا تھا۔ ثبوت کے طور پر نورا کے راشن کارڈ کی فوٹو کاپی کمپنی والوں نے پیش کردی۔ کمپنی نے کہہ دیا کہ وہ زیادہ سے زیادہ پرانے مالک راگھویندر نارائن پرساد سنگھ سے رابطہ کر سکتے ہیں۔ اتنے میں کہیں سے پولیس ہیڈکوارٹر میں فون آیا کہ مسٹر سیموئیل کو باعزت طور پر چھوڑ دیا جائے۔ کانسٹیبل دھیان سنگھ کی شاندار کوشش بھی اکارت ہوگئی۔

چڑیا گھر کے منتظم بلائے گئے۔ حکم تھا، اس ہاتھی پر بے ہوش کرنے والی گولی چلاؤ۔ بے ہوش ہوجانے پر اسے اٹھوالیں گے۔ مگر منتظم لاچار تھا۔ اس کے پاس شیر کو بے ہوش کرنے والی گولی تھی، ہاتھی جیسے گراں ڈیل جانور کو بے ہوش کرنے والی گولی اسٹاک میں نہیں تھی۔ لکھیم پور کھیری نیشنل پارک سے منگوانی پڑے گی۔ یہ بڑا جھنجھٹ کا کام تھا۔

پولیس والوں نے کہا، ''پھر اسے گولی مار دو۔ ہاتھی کو پاگل قرار دے دو۔ لاش ہم بعد میں اٹھوا لیں گے۔'' لیکن منتظم راضی نہیں ہوا، ''تین گھنٹے ہی تو ہوئے ہیں اسے غیر معمولی حرکتیں کرتے ہوئے۔ اتنے کم وقت میں اسے پاگل قرار نہیں دیا جاسکتا۔ کم سے کم ہفتے بھر کی آبزرویشن کے بعد ہی فیصلہ ہوسکتا ہے۔''

سونگھنے میں اخباری نمائندوں سے بہتر السیشن کتا بھی نہیں ہوتا۔ خبر بن گئی اور ٹیلی پرنٹروں اور ہر گھنٹے نشر ہونے والے نیوز بلیٹنوں کے ذریعے نشر بھی ہوگئی کہ سرکار ہاتھی کو گولی سے مارنے پر غور کر رہی ہے۔ اثر بھی فوراً ہوا۔ سرکار کے وزیرِ ماحولیات کا بیان آگیا کہ ان کے وزارتی عہدے پر رہتے ہوئے ہاتھی کو گولی ماری گئی تو وہ اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیں گے۔ جب نامہ نگار اس واقعے کو حقیقتاً صاحبانِ اقتدار پر ایک دھبا، ایک جادو کی جیت بتلا رہے تھے، تب حزبِ اختلاف کے بیانوں

سے اخباروں کے ٹیلی پرنٹر روم بھر گئے۔ وہ سرکار کے استعفے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ ملک کے بھی جانے پہچانے حیوان دوست ہاتھی کو مارنے پر بین الاقوامی سطح پر سرکار کو بدنام کرنے کی دھمکی دے رہے تھے۔ نوکرشا؛ سے صدی کا سب سے بڑا مذاق بتا رہی تھی کہ ایک وسیع و عریض ا کی سیاست کو ایک ہاتھی التوا؛ اشکار کر دے۔

جب مستان آئی ٹی او پر اپنی بے پناہ طاقت اور ناقابل تسخیر قوتِ ارادی کا مظاہرہ کر رہا تھا، صاحبانِ اقتدار کا ٹھٹھول دھنکی ہوئی روئی کی طرح شہر بھر میں پھیلتا جا رہا تھا۔ لوگ باگ ہنس رہے تھے۔ کھلے عام کھل کر نہ ہنسنے والی عورتیں کھلکھلا کر ہنس رہی تھیں۔ ہر کسی کو ہنسنے کی جلدی تھی، کیونکہ اگر ہنسی نہ نکلی تو ہنسی کے بگولے اندر پھٹ سکتے تھے۔ لہٰذا شہر اجتماعی طور پر ہنسے جا رہا تھا۔ ایک کروڑ آبادی والے شہر کی اجتماعی ہنسی ایٹم بم کے دھماکے سے کم نہیں تھی۔ کئی سرکاری ایوانوں میں اس ہنسی کی شدید تکرار سے دراڑیں پڑ گئیں۔ کئی ایوان جھولے کی طرح پینگیں لے رہے تھے۔ کسی کی بھی حاکمیت باقی نہیں رہ گئی تھی: نہ راج دھانی کی نہ حکومتی اقتدار کی! فوج، پولیس، نیم فوجی دستے، فائر بریگیڈ، ریزرو بینک، منصوبہ بندی کمیشن، مالیاتی وزارت—— سب ٹھگے بوکھلائے ہوئے تھے۔

راشٹر پتا کو خراجِ عقیدت پیش کیا جا چکا تھا۔ اس ٹھٹھول بھری اجتماعی ہنسی سے ڈرا ہوا حکومتی اقتدار ہاتھی پر حملہ کرنے کے بجائے پیچھے ہٹنے کی حکمتِ عملی بنانے میں لگا تھا۔ مستان نے ایسی جگہ دے دی تھی کہ مات یا پیچھے ہٹنے کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ وزیرِ اعظم کے ایوان سے حکم نامہ آیا——

"پیچھے ہٹو! ری ٹریٹ!"

گاڑیوں کو آہستہ آہستہ پیچھے سرکایا جانے لگا۔ اب شہر کی ہر گاڑی ایک گیئر میں چل رہی تھی، جیسے کچھوے اپنا سر خول میں واپس گھساتے ہیں۔ گاڑیاں چلانے والوں کے منھ سے سرکار کے لیے بھدی بھدی گالیاں نکل رہی تھیں۔ آخر جونک کی طرح دھیمے دھیمے پیچھے سرکتی گاڑیاں شہر کے گیراجوں اور پارکنگ کے مقامات میں لوٹ گئیں۔

آئی ٹی او پر گاڑیوں کے ہارن کا شور تھم گیا۔ مستان کو اچانک کھلا پن محسوس ہوا۔ شور کے نہ رہنے سے اس کی بوکھلاہٹ شانت ہو گئی۔ مستان نے چاروں طرف دیکھا—— بس، دو ماروتی کاریں پچکی پڑی تھیں، ایک اسکوٹر اور دو موٹر سائیکلوں کا مڑا تڑا کباڑ پڑا تھا۔ اب سامنے نہ کوئی رکاوٹ تھی نہ

Scanned with CamScanner

بھڑکتی آگ۔ ادھر ہلکی بارش نے مستان کی خوف سے سخت پڑ گئی نسوں کو تھوڑا ڈھیلا کر دیا تھا۔ اس نے سونڈ ہلائی اور سلامی کے انداز میں خوشی خوشی اسے ہوا میں فتح کے جھنڈے کی طرح لہرانے لگا۔ اس کے گلے میں ایک بلند چنگھاڑ نکلی، جیسے دنیا کی فتح کی علامت کے طور پر بگل بجایا جا رہا ہو۔

اِدھر حکومتی اقتدار کے سب سے چھوٹے نمائندے کانسٹبل دھیان سنگھ نے اس کی چنگھاڑ کے جواب میں چلا کر کہا، ''ارے میرے باپ! تو جیت گیا! جا، تو اب راج کر۔ جیت کی خوشی میں جا کر جمنا میں نہا۔ گڑھ مکتیشور جا کر گنگا میں نہا۔ پر اب آئی ٹی او کو بخش دے۔''

اسے تعجب کہیں یا جادو، مگر واقعہ یہی ہوا۔ مستان، دھیان سنگھ کی انسانی زبان سے ذرا یا متاثر ہوا، یہ راز ہے۔ وہ دھیان سنگھ کی جانب سے اپنا اقتدار تسلیم کیے جانے سے پسیجا یا اپنی حیثیت کا مظاہرہ کرتے کرتے تھک گیا تھا، اس بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن مستان آہستہ آہستہ جھومتا ہوا چلنے لگا۔ اس نے آئی ٹی او پل کے نیچے والا راستہ پکڑا اور جمنا میں اتر گیا۔

بھارت کا بحران ٹلنے کی خبروں سے اگلے دن کے اخبارات پٹے ہوئے تھے۔ حزبِ اختلاف والے ہنس رہے تھے۔ وہ ایک خوددار، قومی اور سودیشی سرکار کا ٹھٹھول کر رہے تھے۔ ایک ہاتھی سرکار کو جھکا کر بے خوف راجدھانی میں ٹہل رہا ہے۔ ادھر پتو کے بارے میں افواہیں تیزی سے پھیل رہی تھیں۔ گوکل پوری کے ایک بچے نے پتو کو مستان کے پاؤں کے بال کے ساتھ دیکھا۔ بچے نے بال چھونا چاہا تو پتو غائب ہو گیا! سنگم وہار میں ایک رکشے والے کو پتو نظر آیا۔ رکشے پر بیٹھ کر پتو امبیڈکر نگر گیا۔ بھاڑے میں اس نے رکشے والے کو سونے کا ایک سکہ دیا اور بولا، ''جا، موج کر!'' پالم گاؤں میں پتو نے ایک خربوزے کو سونے کا بنا دیا! پتو کی لاش جلنے سے پہلے جمنا میں کود گئی تھی! اپنے بال کی تلاش میں مستان آج بھی پریشان! پتو اسے جہاں ملے گا، مستان اسے مار ڈالے گا! مستان کے دوسرے تلووں میں بال ابھی بھی محفوظ ہیں!

مستان اور پتو کی کہانی لوک کتھا ہو گئی۔ نورا کے پڑوسیوں، ربڑ فیکٹری کے مالک اور شہر کے اخباروں نے اسے خوب ہوا دی۔ دھیرے دھیرے وہ گج لوک کتھا ہو گئی۔ ایک گج لوک کتھا یہ بنی کہ مستان اپنا بال چھیننے لپکا اور اسی میں پتو کچلا گیا۔ مستان کو بال پھر سے ملا اور اسی خوشی کے مارے وہ دڑیل ہو گیا۔ دوسری گج لوک کتھا یہ رائج ہوئی کہ بال حاصل کرنے کے بعد پتو مستان کو خرید لیتا۔ یہ

Scanned with CamScanner

بات مستان کو ناگوار گزری۔ اسے لگا، کل کا لونڈا مجھے خریدے؟ میرے پیچھے گھومنے والا میرا مالک بنے؟ اس لیے مستان نے آگ کے بہانے پتو کو کچل ڈالا۔ بہر حال، عوام میں گج لوک کتھاؤں کے پھیلنے کا انجام یہ ہوا کہ گج سے ان کی عقیدت بڑھی اور متعدد لوگ جان کا جوکھم اٹھا کر بھی ہاتھی کے تلوے کے بال ڈھونڈنے میں لگے رہے۔ کیا پتا بال مل جائے اور وہ کروڑ پتی بن جائیں۔

اخباروں میں اس واقعے پر جاری بحث کا اختتام کرتے ہوئے روزنامہ 'نوستا' کے ادارتی صفحے پر دانشور جگ پتی لمبودرونا یک نے لکھا:

''یہ دکھ کی بات ہے کہ لوگ مستان ہاتھی کے، جو برھمرشی بنگلے اور ٹپوری کتے کے ساتھ جمنا کے پاٹ پر گھومتا رہتا ہے، تلووں کے نشانوں میں بال ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ انھیں نزدیکی خطرے کا نہیں پتا۔ انھیں گج پران کا آخری باب دیکھنا چاہیے: جو معتوب ہیں وہی یہ چمتکاری بال ڈھونڈتے ہیں۔ ہاتھی کے تلوے میں صرف چربی ہوتی ہے۔ چربی زرخیز نہیں ہوتی۔ اصول کہتا ہے کہ حساس چمڑی، جیون جل اور مساموں کے بغیر بال اگ نہیں سکتا۔ جو معتوب ہیں وہ اس گیان کو حاصل نہیں کر پاتے۔''

❋❋

Scanned with CamScanner

ہردیش

ہندی سے ترجمہ: بشیر عنوان

منو*

پنڈت ستیہ نارائن جھنگرن کو دیکھ کر پُرکھوں کی یاد آتی تھی، یا یہ کہ ان کے وسیلے سے پچھلے زمانے میں، جو ماضی بعید ہے، جایا جاسکتا تھا، یا یہ کہ وہ کسی بھوج پتر[1] کو پڑھنے جیسا تھا جس کے لیے کہا جارہا ہو کہ اس میں ہماری تہذیب اور ثقافت سے متعلق کچھ اہم باتیں لکھی ہیں، یا یہ کہ...لیکن نہیں، زیادہ مناسب یہ ہوگا کہ کسی شخص پر ایسی رائے زنی کرنے کی بجائے اس کے بارے میں سیدھے سیدھے حقائق پر مبنی

* منو: منو کو ہندو روایت میں سب سے بڑا قانون ساز سمجھا جاتا ہے۔ روایت کے مطابق وہ دنیا کا اولین بادشاہ تھا جس نے دنیا کو سیلاب سے بچایا اور جس سے انسانی نسل آگے چلی۔ اس نے اپنی اولاد کے لیے قوانین تیار کیے۔ منو سے منسوب کی جانے والی کتابوں میں یہ قوانین درج ہیں۔ ان کتابوں میں منوسمرتی بہت مشہور ہے۔ جس میں انسانوں کو چار بڑی ذاتوں (برہمن، کھشتری، ویش اور شودر) میں تقسیم کر کے ان کے لیے مخصوص کیے گئے کاموں کو ان کا دھرم قرار دیا گیا۔ برہمن کو سب سے اونچی ذات تصور کیا جاتا ہے جن کے ذمے مذہبی کتابوں (ویدوں) کا علم حاصل کرنا اور مذہبی رسوم ادا کرنا ہے۔ اس تقسیم میں سب سے نچلے درجے پر شودر ہیں جن کو چمڑا کمانے اور غلاظت اٹھانے کے کام سونپے گئے ہیں۔ اس کہانی کا عنوان ''منو'' رکھ کر ہردیش نے ذات پات کی اسی تقسیم کی طرف اشارہ کیا ہے۔ قدیم اور از کار رفتہ مذہبی روایتوں اور رواجوں کو جدید دور میں جاری رکھنے کی کوششوں سے جس طرح کے مسائل پیدا ہوتے ہیں ان کا ایک پہلو اس کہانی کا موضوع ہے۔

[1] بھوج پتر: ہمالیہ کے علاقے میں پائے جانے والے بھوج کے پیڑ کی چھال کو کاغذ کی ایجاد سے پہلے لکھنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔

Scanned with CamScanner

معلومات فراہم کی جائیں۔ اطلاعات اور حقائق اپنی بات کہنے میں خود طاقتور ہوتے ہیں، شاید کچھ اچھی طرح ہی۔

پنڈت ستیہ نارائن چوٹی، جنیو اور تلک [2] دھاری برہمن تھے۔ ان کو انھوں نے دس بارہ برس کی عمر سے دھارن کیا تھا اور اب تک باقاعدہ طور پر دھارن کرتے چلے آرہے تھے۔ وہ صبح سویرے سورج نکلتے ہی کھاٹ چھوڑ دیتے۔ بیت الخلا سے فارغ ہو کر اشنان کے لیے کنویں سے پانی کھینچتے تھے۔ پچھلے کچھ ماہ سے چار پانچ بالٹی کھینچنے کے بعد پانی گدلا آنے لگا تھا۔ کئی سال سے کنویں کی صفائی نہیں ہوئی تھی۔ صفائی کرنے والوں کا اِدھر جیسے کال پڑ گیا تھا۔ پہلے اننگنے نام کا ایک کاچھی [3] اپنے لڑکے اور ایک ساتھی کے ساتھ ہر سال جیٹھ یا بیساکھ میں آکر کنواں صاف کر جاتا تھا۔ وہ پاس کے کسی گاؤں میں رہتا تھا۔ محنتی اور سیدھا تھا۔ روپے دینے پر کہتا تھا کہ وہ دوسرے گھروں سے تو کمائی کر ہی لیتا ہے، ان کے یہاں سے پُن کماتا ہے؛ شربت پانی دینے پر یہ کہتے ہوئے لے لیتا تھا کہ یہ تو پرساد ہے۔ دمے کے روگ نے اننگنے کو دھیرے دھیرے کھا لیا۔ اس کے بعد جو دو تین اور کنویں کی صفائی کرنے والے آئے، وہ چلتا کام کر کے چوکھی مزدوری چاہنے والے قسم کے تھے۔ کنووں کے غائب ہونے کے ساتھ ساتھ کنووں کی صفائی کرنے والے بھی غائب ہوتے گئے۔

ستیہ نارائن نے ٹونٹی والا سرکاری نل نہیں لگوایا تھا۔ اس نل کی پائپ لائن نالی، موری اور نہ جانے کن کن گندی، ناپاک جگہوں سے گزر کر آتی تھی۔ پھر کنویں کے پانی کی اپنی بات تھی: جاڑے میں گرم اور گرمیوں میں ٹھنڈا۔ نل کے پانی کا اس سے ایک دم الٹا طرزِ عمل تھا۔ ان کے کنویں سے بس مٹی نکل جائے، پانی بڑھ جائے گا، پھر ایک بار میں بیس بالٹی پانی کھینچ لو۔

غسل کر کے ستیہ نارائن پورے ڈیڑھ گھنٹے تک پوجا کرتے تھے۔ کئی نجی دیوتاؤں کی مورتیاں یا دھاتو پتر [4] تھے ان کے پاس۔ ان سب کی تعظیم میں وہ مقررہ تعداد میں منتر پڑھتے تھے۔

---

2 چوٹی، جنیو اور تلک: سر کے بالوں کی چوٹی، بدن پر لٹکا ہوا مقدس دھاگا اور ماتھے پر تلک، یہ برہمنوں کی مذہبی نشانیوں کے طور پر رائج رہے ہیں۔

3 کاچھی: ہندوؤں کی ایک نچلی سمجھی جانے والی ذات۔

4 دھاتو پتر: دھات میں ڈھلا ہوا ریلیف یا اُبھرواں نقش۔

Scanned with CamScanner

ناشتہ کر کے وہ اپنی بیٹھک میں آ کر تخت پر بیٹھ جاتے تھے۔ تخت پر ایک طرف کچھ جنتریاں اور جیوتش کی کتابیں رکھی ہوتی تھیں۔ وہ اس وقت جنم پتری یا سالانہ زائچہ بناتے تھے۔ جمانوں[5] کے لیے کج رو ستاروں کی راستی کے حل بھی تجویز کرتے تھے۔ ان کے پتاجی بھی جیوتش اور کرم کانڈ کا یہی کام کرتے تھے۔ ستیہ نارائن نے سنسکرت اسکول میں پرائمری تک تعلیم حاصل کی تھی اور پھر پتاجی سے جیوتش وغیرہ کی عملی تربیت حاصل کر لی تھی۔ باپ نے بیٹے کو یہی دینا مناسب سمجھا تھا اور بیٹے نے بھی باپ سے یہی لینا مناسب سمجھا تھا۔ ذہانت سے زیادہ وہاں کھلی ہوئی آنکھ کی ضرورت تھی۔

ستیہ نارائن کے باپ کا جمانی سے گزر بسر اچھی طرح ہو جاتا تھا۔ وہ اگر اپنے جمانوں کے سکھ کا خیال رکھتے تھے تو جمان بھی ان کا مناسب دھیان رکھتے تھے۔ ستیہ نارائن کی بھی شروع میں اسی پیشے سے ضروریات پوری ہو جاتی تھیں۔ لیکن پھر حالات تیزی سے بدلنے لگے تھے۔ کلجگ کا چوتھا دور چل رہا تھا، لیکن اب لگتا تھا کہ جیسے وہ تپ بھی رہا ہو۔ لوگ اپنے مہان دھرم، اپنی قابلِ فخر ثقافت، اپنی آدرش روایت کو بھولنے لگے تھے۔

بیٹھک میں جب وہ بیٹھے ہوتے تھے، ان کی پتنی جھانک جاتی تھی۔ کسی باہری آدمی کو وہاں نہ دیکھ کر وہ دال، چاول، تیل جیسا کوئی سودا بازار سے لانے کے لیے کہتی۔ ستیہ نارائن ماتھے پر بل ڈالتے ہوئے پوچھتے کہ کیا اس دن کا کام چل نہیں سکتا ہے، پیسے ہاتھ میں نہیں۔ پتنی بڑبڑاتی کہ یہ روز روز کا رونا ہے، جب پنڈتائی، پروہتائی سے گرہستی کی گاڑی کھسک نہیں رہی تو وہ کوئی دوسرا دھندا کریں۔

ستیہ نارائن اکثر اس بات سے ابل پڑتے، ''کیا جوتا گانٹھوں؟ کیا آلو پیاز بیچوں؟ بول مورکھ! تجھے تو ذات برادری کی مریادا کا کچھ دھیان نہیں، مجھے تو ہے۔ مجھے اپنا پرلوک[6] نہیں بگاڑنا ہے۔''

مان لو کہ انھوں نے دو جنم پتروں کا کام نپٹا لیا ہے۔ وہ اپنے کو سینت کر ان کو لے کر گھر سے

---

[5] جمان: وہ لوگ جو کرم کانڈ (مذہبی رسموں کی ادائیگی) کے لیے برہموں کی خدمات معاوضے پر حاصل کرتے ہیں۔

[6] پرلوک: ہندو دیومالا کی رو سے کائنات کے تین حصے ہیں: بھولوک (زمینی دنیا)، پرلوک (زندگی کے بعد کی دنیا) اور دیولوک (خداؤں کی دنیا)۔ یہاں پرلوک سے مراد آخرت ہے۔

Scanned with CamScanner

نکل پڑتے۔ ساتھ میں جنتری بھی لال کپڑے کے تھیلے میں رکھ کر بغل میں دبا لیتے۔ باہر نکلتے ہوے وہ جنتری ضرور رکھ لیتے تھے۔ کوئی عقیدت مند یا ججمان نیک ساعت، یا گیارھویں رات، یا ساعتِ بد کے بارے میں پوچھے تو وہ اسے اس کا وقت بتا سکیں۔ جنتری ان کی پہچان بھی تھی۔

راستے میں انھیں ٹنڈن کپڑا اسٹور نظر آ جاتا۔ انھیں یاد آ جاتا کہ بیس سال پہلے انھوں نے اس دکان کی مہورت کی پوجا باضابطہ طریقے سے کرائی تھی۔ مہورت کی شبھ گھڑی بھی انھوں نے ہی نکالی تھی۔ یہ دکان خوب پھلی پھولی تھی۔ اس خاندان کے پاس اب کار، کوٹھی، کیا نہیں تھا؟ خاندان کے سربراہ دینا ناتھ جی کا ایک برس پہلے دیہانت ہو گیا تھا۔ وہ مذہبی اصولوں کو ماننے والے معزز شخص تھے۔ ان کے ساتھ ان کی بات ختم ہو گئی۔ لڑکے اور پوتے نئے زمانے کے ہیں۔ رگھوناتھ پرساد بہت پرانا منیم تھا۔ زیادہ للّو چپّو کرنا اسے نہیں آتا تھا۔ ان لوگوں نے اسے نکال دیا۔

کنج بھون دکھائی دے جانے پر ان کو پھر وہاں سے جڑی یادیں آ جاتی تھیں۔ اس حویلی والے زمیندار ہوا کرتے تھے، کئی گاؤوں کے مالک۔ جس مکان میں وہ رہتے ہیں، وہ پہلے انھیں لوگوں کا گھڑسال (اصطبل) تھا۔ لالہ دیوکی نندن نے رائے بہادری کا خطاب پانے کی خوشی میں وہ اصطبل ان کے پتا کو دان میں دے دیا تھا۔ کواڑ، چوکھٹ کے لیے باغ سے لکڑی بھی کٹوا دی تھی۔ ان کے پتا اس گھر کے پروہت تھے۔ جب تک رانی بھابی کا حکم چلا، تب تک اس گھر میں لوگوں کو مان سمان ملتا رہا۔ اب بہوؤں کا راج ہے۔ رانی بھابی کو اونچا سنائی دینے لگا ہے۔ کمر کی ہڈی میں خرابی آ جانے کے باعث وہ بے چاری پلنگ پر پڑی رہتی ہیں۔ بہوؤں کی اس سے اور بن آئی ہے۔ کبھی اس گھر میں پنڈت، پروہت کو اندر بلا کر برآمدے میں اس تخت پر بٹھایا جاتا تھا جس پر قالین اور چادر بچھی رہتی تھی اور خاندان کے افراد بیٹھتے تھے۔ اسٹیل کے گلاس میں دودھ آتا تھا یا طشتری میں رکھ کر پھل۔ اب تو توقع کی جاتی ہے کہ پروہت برآمدے میں گھر کے نوکروں کے لیے پڑے تخت پر بیٹھ کر انتظار کرے اور بعد میں خالی لوٹا دیا جائے: ''پتا نہیں رانی بھابی نے کیوں بلوایا تھا۔ وہ تو سو رہی ہیں۔''

جس ججمان نے خستہ ہو جانے والے جنم پتر کو دوبارہ بنوایا تھا، وہ پانچ روپے پکڑا دیتا۔ بے اطمینانی ظاہر کرنے پر ججمان دو روپے اور بڑھا دیتا۔ ''گرو، ان کاموں میں سودے بازی اچھی نہیں لگتی ہے۔ ججمان جو کچھ بھینٹ کرتا ہے، اپنی مرضی سے بھینٹ کرتا ہے۔'' دوسرے ججمان کی گھر والی، جس

Scanned with CamScanner

نے اپنی کنواری بیٹی کا جنم پتر دکھلا کر پوچھا تھا کہ اس کے بیاہ کا کب تک امکان ہے، وہ سوا روپے رکھ کر سیدھا[7] دیتی جسے وہ کندھے پر پڑے انگوچھے میں باندھ لیتے۔ انگوچھا بھی ہر دم ان کے ساتھ رہتا تھا۔

راستے میں کوئی خاص عقیدت مند یا جذباتی تعلق رکھنے والا معتقد مل جاتا، مان لو کہ چھوٹے چھوٹے کھچڑی بالوں والا ماتا پرساد ہی مل گیا، وہ لپک کر قدم بوسی کرتا ہوا انھیں اطلاع دیتا، ''پنڈت جی، میرا چھورا سیارام نوکری پا گیا۔ گرامین بینک میں لگی ہے۔ آپ نے ہی کہا تھا کہ ایک برس کے اندر چھورا نوکری پا جائے گا، سو ایک برس کے اندر ہی پا گیا۔''

''ستارے ایسا ہی کہہ رہے تھے۔ ستارے غلط نہیں بولتے۔ حساب کرنے والا اگر غلطی کر جائے تو اس میں ستاروں کا کیا قصور؟'' ان کے چہرے اور آواز دونوں میں ایک دمک ہوتی۔

''مجھے تو آپ گروؤں کے آشیرواد پر بھروسا ہے،'' ماتا پرساد پھر قدم چھوتا اور بدلے میں ''مزے کرو!'' کا آشیرواد پاتا۔

ستیہ نارائن کو گلی کے ایک موڑ پر گائے مل جاتی۔ سیدھا باندھتے ہوئے انھوں نے ارادہ کیا تھا کہ جو دو کیلے ساتھ میں رکھے گئے ہیں، ان کا چھلکا کالا اور سکڑا ہوا ہے۔ انھوں نے ان کو کاغذ میں لپیٹ کر انگوچھے میں الگ باندھ لیا تھا۔ گانٹھ کھول کر جب انھوں نے نکالا تو وہ اتنے گلے ہوئے نہیں لگے جتنا انھوں نے سوچا تھا۔ مگر یہ مان کر کہ اب یہ گئو ماتا کے ہوگئے ہیں، وہ ان کیلوں کو ''تیرا مال تیرے حوالے'' والے انداز سے گائے کے آگے ڈال دیتے۔

انھیں تب اپنی گائے کی یاد آجاتی۔ اچھی نسل کی تھی۔ سوہن لال آڑھتی نے دی تھی۔ ان کے گھر چھاپہ پڑا تھا۔ ایک کلو سونا، پانچ کلو چاندی، پچاس مہریں اور نہ جانے کتنا روپیہ پایا گیا تھا۔ سونا، چاندی سب سیل مہر کر دیا گیا تھا۔ سوہن لال اور ان کے گھر والے بہت پریشان تھے۔ منگل (مریخ) گردشی نظر ڈال رہا تھا۔ شکر (زہرہ) بھی خراب چل رہا تھا۔ انھوں نے لالہ جی کو منگل اور شکر وار (جمعہ) کا برت رکھنے کو کہا تھا اور ستاروں کی شانتی کے لیے پوجا بھی بتائی تھی۔ پوجا لالہ جی کی طرف سے انھوں نے خود کی تھی، ڈھائی ماہ تک۔ پوجا کے اثر سے پرانے افسر کی بدلی ہوگئی اور نیا جو آیا، اس نے معمولی سا جرمانہ کر کے سب مال چھوڑ دیا۔ لالہ سوہن لال بہت خوش ہوئے تھے۔ ان کے یہ

---

[7] سیدھا: ان پکا اناج۔

Scanned with CamScanner

خواہش ظاہر کرنے پر کہ وہ گئو کی سیوا کرنا چاہتے ہیں، انھوں نے نخاس سے منگوا کر گائے ان کے گھر بندھوا دی تھی۔ کھلی دانے کا ایک ایک بورا بھی ڈھلوا دیا تھا۔ آٹھ سال وہ گائے ان کے گھر پر رہی۔ دودھ گھی کی کمی نہیں ہونے دی۔ اس گائے کے مرنے کے بعد کئی بار ان کی خواہش ہوئی وہ ایک دوسری گائے باندھ لیں، لیکن کوئی جگت بیٹھی نہیں۔

دوپہر کے بھوجن کے بعد ستیہ نارائن بیٹھک میں آکر کچھ دیر بدن کو آرام دینے کی کوشش کرتے تھے۔ ان کو چھت پر درز دکھ جاتی تھی اور لگتا کہ وہ کچھ چوڑی ہوگئی ہے۔ پھر چوکھٹ سے سفید برادہ جھڑتا نظر آتا۔ چوکھٹ کی درز سے ایک پیلی مٹ میلی چھپکلی باہر سر نکالتی اور منھ پھیلا کر ان کی جانب دیکھتی ہوئی زبان لپلپاتی۔ الماری میں سے کھٹر کھٹر کی آواز آتی۔ وہ تالی بجاتے۔ ایک موٹا چوہا کود کر بھاگتا۔ وہ الماری میں رکھی پرانی جنتریوں اور دوسرے قیمتی کاغذوں کو دیکھتے۔ چوہوں نے ان کو کترتو نہیں دیا ہے؟ ایک جلد چڑھی پرانی کاپی ہاتھ میں آجاتی۔ اس میں بھجن لکھے ہوتے۔ ان میں سے کچھ بھجنوں کی تخلیق کبھی انھوں نے ہی کی تھی۔ وہ پھر ''کلیان'' کا کوئی شمارہ نکال لیتے اور اسے پڑھنے لگتے۔

بہت پہلے ان کا شام کا وقت بھی اپنی پیشہ ورانہ مصروفیات میں گزرتا تھا۔ دو ایک جمانوں کی طرف سے منتروں کا جاپ کرنا ہوتا تھا یا کہیں رامائن، سکھ ساگر کی کتھا کا پاٹھ کرنا ہوتا تھا۔ وقت کے ساتھ یہ کام کم ہوتے گئے۔ اب شام کو وہ ریٹائرڈ ہیڈ ماسٹر اُپادھیائے جی کی بیٹھک میں گھنٹے آدھ گھنٹے کے لیے بیٹھتے تھے۔ یہاں جمنا پرساد بھی آجاتے تھے۔ بیساکھیوں کا سہارا لے کر اکثر ٹھاکر گجیندر سنگھ بھی آجاتے تھے، جن کا دایاں پیر ریل کے پہیے سے کٹ گیا تھا۔ باتیں ہوتی تھیں۔ وہ سب متفق ہوتے تھے کہ بھارت کو ایٹم بم بنالینا چاہیے اور اس بار پاکستان کا جیتا ہوا علاقہ چھوڑنا نہیں چاہیے؛ اپنا آریاورت[8] پہلے قندھار تک پھیلا ہوا تھا جس کا اصل نام گاندھار تھا، گاندھاری، گاندھار دیس کی ہی تھی؛ برما، لنکا، سماترا، جاوا، تبت سب اس آریاورت کے ہی حصے تھے؛ ہزاروں برس پہلے جب دوسرے دیس کے لوگ کچھ نہیں جانتے تھے، ہمارے پاس پُشپک وِمان[9] تھا، اگنی بان[10] تھے؛ ہم

---

8 آریاورت: قدیم ہندوستان جو مانا جاتا ہے کہ بہت وسیع تھا۔

9 پُشپک وِمان: مال ودولت کے دیوتا کُبیر کا ہوائی تخت۔ ہوائی جہاز کے لیے بھی وِمان کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔

10 اگنی بان: آتشیں تیر۔ اسے میزائل کا ہم معنی خیال کیا جاتا ہے۔

ساری دنیا کے استاد تھے؛ وید اور پران علم کے خزانے ہیں؛ ہندو دھرم سب سے اچھا دھرم ہے... وہ رات کو پتنی سے پیر دبواتے تھے۔ حالانکہ پتنی کے ہاتھوں میں اب ویسی نزاکت اور اپنائیت نہیں رہی تھی بلکہ کبھی کبھی اس کی انگلیوں کی بِوائیوں کی چبھن ناگوار گزرتی تھی لیکن پیر دبوانے کے وہ اتنے عادی ہو چکے تھے کہ بغیر دبوائے انھیں نیند نہیں آتی تھی۔

نیند میں اکثر وہ سپنے دیکھتے تھے، جن میں سے کچھ اس طرح کے ہوتے تھے۔ جنگل کے بیچ ایک کھلا حصہ ہے۔ وہاں آشرم ہے۔ پچاسوں گیروے کپڑوں میں ملبوس بچے کشاسن[11] پر بیٹھے علمی ریاضت کر رہے ہیں۔ وہ خود ایک اونچی چکنی سل پر بیٹھے ہیں۔ ان کی پتنی کٹیا کے پیچھے کھانا پکا رہی ہے۔ پاس ہی قلقل کرتی ندی بہہ رہی ہے۔ ایکا ایک شمالی سمت میں دھول اٹھنے لگی ہے۔ کچھ شور بھی۔ دھول اور شور کے پیچھے سے ایک رتھ ظاہر ہو کر رک جاتا ہے۔ رتھ میں سے تاج سجائے، مرصع پوشاک میں ملبوس راجہ اترتے ہیں، پھر راج کمار۔ راجہ دونوں ہاتھ جوڑ کر ان کو پرنام کرتے ہیں، راج کمار بھی۔ راجہ عرض کرتے ہیں کہ وہ راج کمار کو حصولِ علم کے لیے لائے ہیں۔ وہ اس کو اپنا شاگرد بنا کر شادکام کریں... ساتھ آئے چھکڑوں میں گیہوں، چاول، شہد اور گھی بھرا ہوا ہے۔ وہ سب آشرم کے بھنڈار میں اتارا جانے لگتا ہے۔

ایک سپنا ہوتا تھا کہ وہ پالکی میں بیٹھے جا رہے ہیں۔ پالکی کو چار کہار آگے سے اور چار کہار پیچھے سے اپنے کاندھوں پر اٹھائے ہیں۔ پالکی جس راستے سے گزرتی ہے، اس کے دونوں طرف نرناری ہاتھ جوڑ اور سر جھکا کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ وہ ان کو ہاتھ اٹھا کر آشیرواد دیتے ہیں...

جاندار اور دنیا سب پرماتما ایشور کے بنائے ہوئے ہیں۔ یہ دنیا اسی کی تماشا گاہ ہے اور وہی تماشا گر ہے۔ اولاد کے روپ میں ہر جاندار کی نسل کو وہی پروان چڑھاتا ہے۔ سب اسی کی مرضی سے ہوتا ہے۔ ستیہ نارائن ایسا مانتے تھے اور اسی یقین کے تحت وہ پچاس برس کی عمر تک سات بچوں کے باپ بن گئے تھے۔ اگر حمل گرنے سے چار بچے موت کا نوالہ نہ بن گئے ہوتے تو ان کی تعداد گیارہ ہوتی۔ سات بچوں میں چھ بیٹیاں تھیں اور ایک بیٹا۔ ایک بیٹی کا بیاہ انھوں نے ججمانی کرنے والے ہی ایک پنڈت سے کر دیا تھا۔ ایک کا بیاہ ہنومان مندر کے پجاری سے، ایک کا تحصیل میں اسٹامپ بیچنے

---

11 کشاسن: کُش یعنی گھاس کی بنی ہوئی گدی۔

والے سے اور ایک کا ایک ماہر وید سے کر دیا تھا۔ وید کی پہلی بیوی تین بچے چھوڑ کر مر گئی تھی۔ وید کے چہرے پر عمر قطعی معلوم نہیں ہوتی تھی۔ پانچویں بیٹی کا بیاہ ضلعی بورڈ کے اسکول کے ایک استاد سے کر دیا تھا۔ استاد کی دائیں آنکھ میں یوں تو پھولا تھا، لیکن خاندان یا ذات برادری وغیرہ کا اس میں کوئی کھوٹ نہیں تھا۔ چھٹی بیٹی چھوٹی تھی۔ اسے ان کے بیٹے نے اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ اس بیٹے کا بیاہ گنو شالا کے گودام کے مالک کی بیٹی سے ہوا تھا۔

ستیہ نارائن جب کبھی اپنے منھ میاں مٹھو بن کر اپنے جیوتش گیان کی شان بگھارنے لگتے تھے کہ ستاروں کی کیفیت اور چالیں سمجھنے میں ان سے چوک نہیں ہوتی ہے اور ان کا بتایا ہوا کس کس کے ساتھ سچ ہوا ہے، تب ہڈیالے جسم والی ان کی پتنی کھیر کی کٹوری میں مکھی گرا دیتی۔ ''پاروتی کی بھی تو کنڈلی تمھیں نے پڑھی تھی۔ بیاہ کا پانچواں سال پورا ہو نہیں پایا اور وہ بیوہ ہو گئی۔''

پاروتی ان کی چوتھی بیٹی تھی جس کا بیاہ وید سے ہوا تھا۔

''اب مان لو وید جی نے اپنا جنم پتر جو بھیجا تھا، وہ غلط ہو، اس میں میرا کیا دوش؟ میرے سامنے جو جنم پتر تھا، میں نے اسی سے ستاروں کا ملاپ کیا تھا۔ اَور بیٹیاں تو آرام سے ہیں۔''

''خاک آرام سے ہیں! منگلا کا آدمی جانوروں کی طرح اسے مارتا ہے۔''

منگلا اس کی دوسری بیٹی تھی جو ہنومان مندر کے پجاری سے بیاہی تھی۔

''منگلا کی زبان بھی تمھاری طرح لمبی ہے۔ آدمی کے لیے جب الٹا سیدھا بکے گی تو آدمی کو بھی کبھی غصہ آ جائے گا۔''

اَور جیسا کہ نا آسودہ میاں بیویوں کے درمیان چھوٹی چھوٹی باتوں پر چڑ جانے سے اکثر ہوتا ہے، ان دونوں کے درمیان بھی پھر الزامات اور جوابی الزامات کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ دوسرے نے کب کب اور کون کون سی غلطیاں، بے وقوفیاں کیں اور وہ کس طرح کے کھوٹے خیالات کن معاملات اور موضوعات پر رکھتا ہے، ان کی گنتی گنوائی جانے لگتی۔ ایسی ہی کوشش میں پتنی ستیہ نارائن کو یہ بتانا نہ بھولتی کہ ان کی چلتی تو وہ بھرگو کو بھی بس پتر اور پنڈتائی پکڑا کر اس کی زندگی بھی ستیاناس کر دیتے۔

بھرگو، یعنی بھرگو نارائن، یعنی ان کا بیٹا۔

یہ سچ تھا کہ ستیہ نارائن نے اپنے اس اکلوتے بیٹے کو اپنے ہی پیشے میں ڈالنا چاہا تھا، ویسے ہی

Scanned with CamScanner

جیسے ان کے پتا جی نے ان کو ڈالا تھا۔ بیٹے کی زنار بندی کے بعد، جو انھوں نے اس کے گیارہ برس کا ہونے پر کردی تھی، وہ اسے اپنے ساتھ ججمانوں کے یہاں لے جانے لگے تھے۔ اشلوکوں اور منتروں کی غلط ادائیگی پر وہ اسے گھر آ کر جھڑک دیتے تھے۔ ایک دن اسے ''گناہوں کے دیوتا'' نامی ناول پڑھتے دیکھ کر انھوں نے اس پر گالیوں کے ساتھ گھونسوں کی بوچھاڑ کردی تھی۔ مگر بان بٹ یا کالیداس جن کو وہ جانتے تھے، ان کی لکھی کوئی کتاب پڑھ رہا ہوتا تو وہ ناراض نہ ہوتے۔ بھرگو ایک بار ایسی ہی ڈانٹ اور مار پڑنے پر پاس کے ایک دوسرے ضلعے میں بھاگ گیا تھا اور وہاں اس نے ایک دال مل میں نوکری کرلی تھی۔ جب اس نے ان کے طے کیے ہوئے رشتے والی لڑکی سے بیاہ کرلیا تو ان کو لگا، بیٹے سے تعلقات برقرار رکھے جاسکتے ہیں۔ بیٹے نے پھر کانپور میں ایک کپڑا مل میں نوکری کرلی۔

بیٹے کے بلانے پر وہ پتنی کو ساتھ لے کر اس کے پاس دو تین مہینے رہنے کے ارادے سے گئے تھے۔ وہاں رسم کے مطابق گنگا نہائیں گے، مشہور مندروں میں جا کر درشن کریں گے۔ جے کے مندر کی بہت شہرت ہے۔ ان کو اگر اپنے جیوتش علم کا سکہ جمانے کا موقع ملا تو پھر وہ بیٹے کے شہر کو بھی اپنے کام کا مرکز بنالیں گے۔ کانپور میں کبیر پنتھ رہتے ہیں۔ علم اور قسمت کے سنجوگ سے کبھی بھی کوئی خوشگوار معجزہ ہوسکتا ہے۔

لیکن وہاں جا کر انھوں نے پایا کہ بہو کو پہنے اور دھلے کپڑوں کا دھیان نہیں رہتا۔ ٹھاکر جی کو وہ ہر چیز کا بھوگ نہیں لگاتی۔ چوکے کا برتن اڑوس پڑوس میں چلا جاتا ہے اور اڑوس پڑوس کا برتن چوکے میں چلا آتا ہے۔ گنگا جی مکان سے کافی دور پر بہتی ہیں اور وہاں آنے جانے کا مطلب ہے کہ رکشے کا دس روپے کا خرچہ۔ ایک دن جب بھرگو نہا کر نکلا تو انھوں نے پایا کہ اس کے کندھے پر جنیؤ نہیں ہے۔ ٹوکنے پر اس نے بتایا کہ کپڑے اتارتے ہوئے اتر گیا ہوگا۔ وہ جا کر اس اترے ہوئے جنیؤ کو پہن آیا۔ جنیؤ میں کئی گٹھانیں تھیں۔

''ارے، یہ تو ٹوٹا ہوا ہے،'' ستیہ نارائن نے اپنے ساتھ لائے جنیؤ میں سے ایک نیا جوڑا منتر پڑھتے ہوئے بیٹے کو دے دیا۔

بیٹے نے وہ نیا جنیؤ پہن لیا مگر ساتھ ہی یہ ٹیپ جڑ دی کہ اس کا گوڈاؤن انچارج جنیؤ پر ہنستا ہے۔ کہتا ہے کہ کیا جسم پر الگنی لٹکا رکھی ہے۔ اس ڈورے سے ہی اپنے کو باندھ لیا تو آگے قطعی بڑھ نہیں

Scanned with CamScanner

پاؤ گے۔ چال چلن اور کردار کی درستی ہی سب سے بڑی درستی ہے اور اپنے وقت کی دھڑکنوں کو سمجھنا ہی سب سے بڑا گیان ہے۔ ''وہ کون ذات کا ہے؟'' پوچھنے پر جب بیٹے نے بتایا کہ انچارج کانیہ کج براہمن ہے تو انھوں نے کہا کہ کوئی روان ونشی مت پھرا ہوگا۔ ہمارے رشی منیوں نے جو اونچی ذات کے مردوں کے لیے جنیؤ کا طریقہ بنایا تھا یا جنیؤ پہننے کو ایک لازمی رسم بتایا تھا، تو وہ کیا مور کھ تھے؟

بیٹے کے گھر وہ برآمدے میں سوتے تھے۔ وہی ایک سونے کی جگہ ہو بھی سکتی تھی۔ وہ وہاں بھی اپنی پتنی سے پیر دبواتے تھے۔ ایک رات بیٹے نے ٹوک دیا کہ پتا جی، یہ سب اچھا نہیں لگتا ہے۔ وہ بھڑک اٹھے، خراب اس میں کیا ہے؟ اپنی عورت سے خدمت کرانا کیا غلط ہے؟ اچھے برے کی سیکھ اب وہ کیا اس سے سیکھیں گے، جو ان کے پیشاب سے پیدا ہوا ہے؟

وہ پتنی کو لے کر اگلے دن وہاں سے چلے آئے تھے۔ ان کی چلتی تو وہ اپنی لڑکی کو بھی ساتھ لے آتے۔ وہاں رہے گی تو بدکردار بنے گی۔ لیکن ایک تو پتنی اڑ گئی، دوسرے لڑکی رونے لگی کہ اس کے اسکول کا ایک سال خراب ہو جائے گا۔ وہاں اس کا بھیا بھابی دونوں خیال رکھتے ہیں۔

پتنی کے بیٹے کو لائق ثابت کرنے لگنے پر وہ اسے نالائق ثابت کرنے لگے۔

تکرار کا اختتام عموماً پتنی کے لیے ان کی اس بھڑاس سے ہوتا، ''چڑیل، جھوٹے عیب لگا رہی ہے۔ اگلے جنم میں نرک میں جائے گی، نرک میں۔''

وقت کو اتنی تیزی سے بدلنا نہیں چاہیے، لیکن وہ بدل رہا تھا۔ لوگوں کو اتنی جلد سماج کو قابو کرنے والی اقدار اور اصولوں کو بھولنا نہیں چاہیے، لیکن وہ بھول رہے تھے۔ حالات کو اس طرح پالا نہیں بدلنا چاہیے، لیکن وہ بدل رہے تھے۔ ستیہ نارائن کو غصہ آتا تھا۔

غصہ ان کا مستقل انداز بن گیا تھا۔

اس دن وہ صبح اپنی بیٹھک میں تخت پر بیٹھے تھے۔ دروازہ کھلا تھا۔ اوپر کیل سے ٹین کی ایک تختی پر لکھا ٹنگا تھا، ''ماہر نجوم پنڈت ستیہ نارائن جھنگرن ولد عظیم ماہر نجوم پنڈت کرپا نارائن جھنگرن۔ یہاں زائچہ زندگی، سالانہ زائچے کا صحیح صحیح اور قابل اعتماد کام ہوتا ہے۔'' تخت پر پیتل کی ایک دوات رکھی تھی۔ اس دوات کی روشنائی کالی اور پکی تھی جس کی چمک سو برس تک ایک سی رہتی تھی۔ روشنائی سکھانے کے لیے وہ ریت استعمال کرتے تھے۔ ریت پیتل کی ہی ایک ریت دانی میں بھری رکھی رہتی

Scanned with CamScanner

تھی۔ پاس میں ہی کالے نرسل کے بنے دو قلم پیتل کی ایک طشتری میں احتیاط سے رکھے رہتے تھے۔
یہ دوات، ریت دانی اور قلم دان بھی، جیوتش کے پیشے کے ساتھ، ان کو اپنے پتا جی سے وراثت میں ملے
تھے۔ اس وقت وہ جنتری پھیلائے زحل کی سمت کا مطالعہ کر رہے تھے۔ جدی کے برج میں زحل کی
ساڑھ ستی[12] کا پہلا اڈھیا[13] سال بھر قائم رہے گا۔ ذنب بھی سال بھر پیدائشی برج میں رہے گا۔ دلو
برج والوں کے لیے یہ پورا سال تکلیف دہ اور ناموافق ہوگا۔ ان کا اپنا برج دلو ہی تھا۔ زحل کی نحوست
کم کرنے کے لیے انھوں نے انگلی میں لوہے کا چھلا پہن رکھا تھا۔ مریخ کی صورت حال بھی...

تبھی دروازے میں سے کوئی چیز تیز چیخ کی لکیر کے ساتھ تیزی سے اندر داخل ہوئی اور ان کی گود میں آ گری۔ وہ ہڑبڑا کر کھڑے ہو گئے۔ یہ کون سی آفت! ڈر پورے جسم میں جب تک اچھی طرح بھر بھرائے بھر بھرائے، وہ غصے میں بدل گیا۔ چیز مرغی تھی، جو الماری کے نیچے خرگوش کی طرح گھس گئی تھی۔ انھوں نے اندر آنگن والا کواڑ بھڑا دیا اور کونے میں ٹکی چھڑی پھنکارتے ہوئے مرغی کو اس چھپی جگہ سے نکالنے لگے۔ مرغی بدحواس سی اِس اُس کونے میں بھاگ کر پناہ لینے لگی، جبکہ وہ چاہتے تھے کہ مرغی جلد سے جلد کمرے سے باہر ہو۔ مرغی تخت پر چڑھ گئی۔ ان کے چھڑی پھینک کر مارنے پر وہ دروازے سے باہر لکیاتی ہوئی نکل گئی۔ سامنے کچی مٹی کے اٹھے احاطے کی طرف سے ایک کالی کلوٹی چھوٹی لڑکی اِدھر بڑھی آ رہی تھی۔ اس نے مرغی کو ''آوارہ اِدھر آ، آرنڈی اِدھر!'' کہہ کر آواز دی۔

''مرغی پالنا ڈاکٹر نے بتایا ہو تو نگرانی رکھو۔ دوسروں کے گھروں میں گھسنے کے لیے چھوڑ دینے میں کیا مزہ ملتا ہے؟''

لڑکی مسکرا دی۔ چگ رہی دوسری مرغیوں میں وہ مرغی شامل ہو گئی تھی۔ ''یہ بڑی مَری ہے، مگر ہے چنٹ۔''

''اب کے مرغی گھسی تو سمجھ لو خیر نہیں۔ سالی برداشت کی بھی حد ہے!''

احاطے کے اندر سے ایک لڑکا نکل کر کھڑا ہو گیا۔ ایک عورت نکل کر کھڑی ہو گئی۔

''تم لوگ نیچ پن سے باز نہیں آؤ گے! کہے دیتا ہوں، نتیجہ اچھا نہیں ہوگا۔ کمینے کہیں کے!''

---

12 ساڑھ ستی: نحوست، ادبار، برا وقت جو مروج خیال کے مطابق ساڑھے سات برس تک رہتا ہے۔

13 اڈھیا: ساڑھ ستی کا ڈھائی سال پر مشتمل ایک حصہ۔

ستیہ نارائن اندر آ گئے۔ تخت جائے حادثہ بنا ہوا تھا۔ لوٹی ہوئی دوات نے بچھی دری پر کالے چکتے ڈال دیے تھے۔ اس نقصان کا غصہ تو ان میں تھا ہی، اس بات کا بھی غصہ تھا کہ اب ان کو دوبارہ نہانا پڑے گا۔ دو تین دن سے ان کی ناک سڑسڑا رہی تھی۔ یہ زکام کی علامت تھی۔ لیکن نہانے سے بچا نہیں جا سکتا تھا، مرغی مہونا بھنگی کی تھی۔

کسی بھنگی کا گھر کے سامنے رہنا، ان کو ہمیشہ سے بے تکا لگتا تھا لیکن اب تو وہ بہت کھلنے لگا تھا۔ کچھ حالات نہ اچھے ہونے والے زخم کی طرح ہوتے ہیں، جو ہر دم ٹیس دیتے رہتے ہیں، کبھی کم کبھی زیادہ۔ بھنگی کا یہ گھر ایک سیٹھ کی زمین پر بنا تھا۔ اس سیٹھ کی پیچھے حویلی تھی اور حویلی کی صفائی کے مستقل انتظام کے لیے بھنگی کو بطور رعایا بسا لیا گیا تھا، جیسے پہلے رئیس زمیندار کرتے تھے۔ حویلی کے کئی لوگ بعد میں بیوپار کے سلسلے میں کلکتہ جا بسے تھے۔ بھنگی کہیں نہیں گیا تھا۔ اس نے اپنی جڑیں جمالی تھیں۔

منا سیدھا اور بھلا بھنگی تھا۔ ہر دم نگاہ نیچی کر کے چلتا تھا۔ بولنے سے پہلے دونوں ہاتھ جوڑ دیتا تھا۔ نشہ کر لینے پر بھلے ہی اپنی عورت کو گالیاں دے، دوسروں کے آگے کانپتا تھا۔ ستیہ نارائن کو یاد ہے کہ ایک بار اس نے پوچھا تھا، ''مہاراج، کوئی ایسی جگت بتائیے، اس نیچ سے دیوی دیوتا خوش رہیں۔ اگلا جنم تو سدھر جائے۔'' انھوں نے اس سے کہا تھا کہ وہ باگا بدیشور ناتھ مندر کا باہری احاطہ صبح شام صاف کر آیا کرے؛ اپنی اس سیوا سے بھگوان اس سے خوش رہیں گے۔ وہ تب مندر کے کام کے لیے الگ سے بنوالی گئی جھاڑو سے سیوا کرنے لگا تھا۔ اس کی یوں اس حلقے کی ڈیوٹی نہیں تھی، لیکن کبھی کبھی وہ ان کے گھر کے آگے کی نالی کی صفائی کر دیتا تھا، گندگی ہٹا دیتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ بڑے لوگوں کے بیچ کیسے رہا جاتا ہے۔

منا کے کوئی لڑکا نہیں تھا۔ تین بیویوں سے کئی لڑکیاں ہوئی تھیں، مگر ایک ہی بچی تھی جس کی اس نے شادی کر دی تھی۔ اس کے بیمار رہنے پر اس کی یہ لڑکی اس کے پاس آ کر ٹکنے لگی تھی۔ اس کے مرنے کے بعد لڑکی نے پھر اسی کو اپنا گھر بنا لیا تھا۔ موہنا اس لڑکی کا آدمی تھا۔

منا نے کبھی مرغی اور سور نہیں پالے تھے۔ پالے تھے اس حرام زادے موہنا نے۔

ستیہ نارائن نے دوبارہ اشنان کر لیا۔ اشنان کرنے کے بعد ایک کٹوری میں گنگا جل لے کر

Scanned with CamScanner

انھوں نے انگلی سے پوری بیٹھک میں چھڑک دیا۔ دری پر روشنائی کا گیلا چکتا چمک رہا تھا۔ ان کے اندر اسی طرح ان کا غصہ بھی چمک رہا تھا۔ ان کو یاد آگیا کہ دو تین مہینے پہلے پتنی نے آنگن میں منگوڑیاں توڑی تھیں۔ مرغی آ کر چونچ مار گئی تھی جس سے ساری منگوڑیاں پھینکنی پڑی تھیں۔ وہ آنگن کی موری میں اینٹ اڑائے رہتے ہیں کہ ادھر سے کوئی جانور نہ گھسے۔ اب کواڑ میں کیل تو جڑی جا نہیں سکتی ہے۔ ساری احتیاط کے باوجود بھی بھی وہ کھلے رہ ہی جاتے ہیں۔

تڑاتڑ دو چھینکیں ان کو آئیں۔ یہ زکام اب بگڑ کر ہی رہے گا۔

وہ بیٹھک کے باہر آ کر چبوترے پر کھڑے ہو گئے۔ مرغیاں گھورے کی ڈھیری کو پنجوں سے پھیلا رہی تھیں۔ ایک موٹی سؤریا چاروں پیر پھیلائے اطمینان سے لیٹی تھی اور اس کے تھن سے چھ سات بچے جسم کا حصہ بنے چپکے ہوئے تھے۔ دو سؤر نالی میں گھسے ہوئے چھپ چھپ کر رہے تھے۔

سالا ایک دم نرک ہو رہا ہے۔ سؤر بہت ہی گندہ جانور ہے۔ میلا کھاتا ہے۔ مسلمان تک اس کو ناپاک مانتے ہیں۔

احاطے کے پاس کوئی سایہ لہرایا تھا۔ انھوں نے چلا کر کہا، ''زیادہ اتراؤ مت۔ اپنی اوقات نہ بھولو۔ سؤر پال لیے، مرغیاں پال لیں۔ یہ دوسروں کے گھر گھس کر گندہ کریں گے۔ کوئی کیوں اپنا گھر گندہ کرنے دے گا؟ کمینوں نے چین حرام کر دیا ہے۔''

موہنا کی عورت باہر نکل آئی تھی۔ اس نے پلٹ کر ویسا ہی جواب میں کہا، ''گالی دینے سے ابھی پیٹ بھرا نہیں! ارے مرغی پر بلی جھپٹی تھی، اگر جان بچانے کو وہ بے چاری منٹ بھر کے لیے گھر میں گھس گئی تو آفت جوت لی۔ پنچھی پرندوں سے اتنا پرہیز ہے تو کواڑ کھڑکیوں پر جالی ٹھکوالو۔''

''مرغیاں تیری ہیں تو تو کیوں نہیں کسی کوٹھے میں بند کر کے رکھتی ہے؟ بڑی سیکھ دینے والی ہو گئی، جالی ٹھکوالو! غلطی بھی کرے گی اور زبان بھی چلائے گی۔ بدتمیز کہیں کی!'' ستیہ نارائن بڑبڑائے۔

وہ عورت بھی بڑبڑائی۔

اس عورت کا آدمی، یعنی موہنا، گھر کے اندر لیٹا سگریٹ پی رہا تھا۔ وہ باہر آگیا اور جب تو تڑاق کے بیچ ستیہ نارائن نے کہا کہ ان کو اگر وہاں رہنا ہے تو قاعدے سے رہیں، تو وہ ایک دم

Scanned with CamScanner

چنگاری چھو گئے فلیتے کی طرح بھڑک اٹھا۔ ''تمھاری زمین ہے کیا جو نکال دو گے؟ ایسے منمنا رہے ہو جیسے اس محلے کے تمھیں مہاربھ ہو اور ہم پر جا!'' پھر اپنی عورت کو اندر لے جاتے ہوئے اس نے ادھر دیکھ کر ہاتھ سے ایک فحش اشارہ کیا: ''یہاں کڑا ڈلوا ملے، ڈلوا لینا۔''

ستیہ نارائن اندر تلملائے ہوئے خود بھی چلے آئے۔ پہلے ان کو غصہ اپنے اور بیٹھک کو ناپاک کر دیے جانے کی وجہ سے تھا، اب اپنے ذلیل کیے جانے کے باعث تھا۔ سالا ایک دم ننگئی پر اتر آیا۔ دماغ خراب ہو گئے ہیں سسروں کے۔ دماغ خراب کیے ہیں حکومت نے۔ حکومت ان کو چھوٹ اور سہولتیں جو دینے لگی ہے۔ سنا ہے کہ موہنا کو سؤر پالنے کے لیے بینک سے قرضہ ملا ہے۔ کنٹونمنٹ سے ہزار آٹھ سو روپے کی تنخواہ پاتا ہے۔ تبھی تو عورت کو منع کر دیا ہے، گھروں میں صفائی کرنے نہیں جاؤ گی۔ ہزار کیا، پندرہ سو ملنے لگیں، صفائی بھلے نہ کرو، مگر رہو گے تو بھنگی ہی۔ ذات تو کوئی نہیں بدل دے گا۔ کمینے نے للکارا ہے، میرے یہاں سؤر پلیں گے، مرغیاں پلیں گی۔ مطلب ہے کہ وہ دوسروں کے گھروں میں بھی گھسیں گی، جو کرنا ہو کر لو۔ انھیں لگا کہ موہنا سامنے آ کر پھر کھڑا ہو گیا ہے اور ہاتھ سے وہی فحش اشارہ کر رہا ہے: ''یہاں کڑا ڈلوا ملے، ڈلوا لینا۔''

کوئی چیز لال بھڑ جیسے ڈنک مار رہی تھی۔ اندر ڈنک مارے جانے کی شدید تکلیف تھی اور اسی کے ساتھ اس ڈنک مارنے والے کے لیے جوابی کارروائی کے جذبات تھے۔ کچھ نہ کیا تو یہ سالا اور بھی لچا پن کرے گا، جینا حرام کر دے گا۔

انھوں نے صاف دھلا کرتا پہنا، دھوتی پہنی، پیروں میں ربڑ کی چپلیں ڈالیں۔ بہت پہلے وہ کھڑاؤں پہنتے تھے لیکن اب کھڑاؤں مشکل سے ملتی تھی۔ چپل پہننے میں سہولت یہ تھی کہ وہ باہر سے آنے پر آسانی سے دھل جاتی تھی۔ انھوں نے ماتھے پر تلک چندن ٹھیک کیا، سر کے خاصے حصے کو گھیرنے والی چوٹی کو دوبارہ کس کر باندھا اور گھر سے باہر نکل پڑے۔

ایک سپاہی ان کو جانتا تھا۔ ملنے پر 'پنڈت جی، پاؤں لگے' کرتا تھا اور وہ اسے 'بچہ خوش رہو، مزے کرو' کا آشیرواد دیتے تھے۔ ایک بار وہ اپنی پتنی کی جنم کنڈلی بھی دکھلا کر گیا تھا۔ لیکن جانے پر پتا چلا کہ وہ تھانے پر تعینات نہیں ہے۔ اندر کھلے برآمدے میں لال فیتے کے ساتھ، پیتل کے دو ستارے کندھے پر جڑے ایک داروغہ میز کے پیچھے پڑی کرسی پر بیٹھا تھا۔

Scanned with CamScanner

انھوں نے اپنی پریشانی بتائی۔

''میں تو سمجھا، قتل ڈکیتی وغیرہ کا کوئی سنگین معاملہ ہوگا۔ یہاں تو مچھر کی بھی ٹانگ نہیں ٹوٹی،'' داروغہ گھورتا ہوا بولا۔ اس گھورنے میں یہ پیغام تھا کہ فریادی تھانے ناحق آیا۔

''شریمان جی، اس موہنا بھنگی نے بہت دُکھی کر رکھا ہے۔ اپنے سؤر اور مرغیاں دوسروں کے گھروں میں نقصان کرنے کے لیے جان بوجھ کر ٹھیل دیتا ہے۔ اوپر سے گالیاں بکتا ہے۔''

''گالیاں پہلے تم نے دی ہوں گی۔ چندن تلک والوں کی خصلت میں خوب سمجھتا ہوں۔ اپنے کو سیدھا آسمان سے اترا مان لیتے ہیں۔ کتے نے تو اس کے کاٹا نہیں تھا۔''

''آپ جانچ کر لیجیے۔ میں بھلا آدمی ہوں۔ بھلے آدمیوں کے بیچ میرا اٹھنا بیٹھنا ہے۔ لوگ میری عزت کرتے ہیں، یہ دیکھیے۔'' ستیہ نارائن نے کرتے کی جیب سے ایک کاغذ نکال کر سامنے میز پر رکھ دیا۔ وہ کاغذ ایک تحصیل دار کا لکھا ہوا تھا۔ وہ تحصیل دار اپنا تبادلہ تین چار خاص ضلعوں میں سے ایک میں چاہتا تھا۔ ستیہ نارائن نے اسے پکھراج پہننے کو کہا تھا، ایک منتر کا جاپ کرنے کو بھی۔ تین مہینے کے اندر تحصیل دار کا من چاہا ہوگیا۔ جاتے ہوئے وہ ستیہ نارائن کو ایک نہایت قابل اور ماہر جیوتشی ہونے کا سرٹیفکیٹ دے گیا تھا۔ ستیہ نارائن کسی کام سے کسی اہلکار سے ملنے جاتے ہوئے اس سرٹیفکیٹ کو ساتھ لے جانا نہ بھولتے تھے۔

یہ مان کر کہ داروغہ پر اس کاغذ کا اچھا اثر پڑا ہوگا، انھوں نے اینٹ پر جیسے رڈا جمایا۔ ''شریمان، جب پانی گلے سے اوپر ہوگیا تبھی میں آپ کے پاس آیا۔ موہنا بڑا بدخصلت ہے، گنوار۔ کچھ کیا نہیں گیا تو وہ اور بھی اُدھم جوتے گا۔ آج کل ویسے ہی ان بھنگی چماروں کے دماغ...''

''جہاں سے تم نکلے ہو وہیں سے بھنگی چمار بھی آئے ہیں۔ بھنگی چمار بھی انسان ہیں، جانور نہیں.... چھوٹے لال، اس پنڈت کو حوالات میں ڈال دو۔ تبھی اسے پتا لگے گا کہ بھنگی چماروں کو گالی دینا جرم ہے۔'' داروغہ ایک دم بگڑ گیا تھا۔

ایک سپاہی وہاں آگیا۔

''فوراً یہاں سے دفع ہو، ورنہ ابھی تمھارے انڈت پنڈت پن کا صحیح علاج ہوجائے گا۔ چھوٹو ترنت یہاں سے، اور آگے سے اب مل جل کر رہنا سیکھو۔''

ستیہ نارائن نچوڑے ہوے کپڑے جیسا چہرہ لیے تھانے سے باہر آ گئے۔ توہین کا دھنسا کانٹا نکلوانے گئے تھے۔ نکالے جانے کی بجائے توہین کا اس سے بڑا کانٹا دھنسا دیا گیا۔

ان سے دراصل غلطی یہ ہو گئی تھی کہ گوری رنگت، بڑی بڑی آنکھوں، میانہ قد، پرکشش جسم اور چھاتی پر لگے نام کے بلّے 'پرہلاد کشور' سے انھوں نے داروغہ کو اونچی ذات والا سمجھ لیا تھا، جبکہ تھا وہ چمار۔ لیکن اس کی اصلی ذات کو جیسے انھوں نے اب پہچان لیا تھا۔

''داروغہ کی بہن لگتا ہے کسی مہتر کو بیاہی ہے، تبھی اتنی جانبداری برت رہا ہے،'' تھانے سے کچھ دور آگے نکل کر وہ بڑبڑائے۔

گھر کے پاس پہنچ کر ان کی نگاہ موہنا کے احاطے کی طرف نہ چاہتے ہوے بھی اٹھ گئی۔ مرغیاں اور سؤر باہر ویسے ہی گندگی بکھراتے ہوے ڈول رہے تھے۔ یہ سوچ کر کہ تھانے پر ان کی جو مٹی پلید ہوئی، وہ موہنا کے باعث ہی ہوئی، ان کے من میں اٹھا کہ وہ اس کے چھپر میں آگ لگا دیں، حرامی کا پورا گھر جل کر راکھ ہو جائے۔ لیکن چونکہ وہ ایسا کر نہیں سکتے تھے، انھوں نے اسے بددعا دی، ''سالے کا ستیاناس ہوگا۔ اس بار تو شودر ہی بنا، اگلے جنم میں سوکر (سؤر) بنے گا۔''

اور جلد ہی موہنا پھر غلط ڈھنگ سے پیش آیا تھا، جس سے ستیہ نارائن... اِدھر روز ہی کچھ نہ کچھ ایسا ہو جاتا تھا جس سے ان کو لگتا تھا کہ لوگوں کی آنکھوں میں سے مروّت مرتی جا رہی ہے، بزرگوں کو عزت نہیں مل رہی ہے، لوگ شاستروں میں لکھے کا پالن نہیں کر رہے ہیں، سنسار تیزی سے زوال کی طرف جا رہا ہے۔

ان کی کھوپڑی ہانڈی بن جاتی تھی اور اس کے نیچے رکھا دماغ کا اُپلا سلگنے لگتا تھا۔

کنویں کا پانی دو بالٹی کھینچنے کے بعد ہی گدلانے لگا تھا۔ ایک دن ان کو سڑک پر جاتے دو مزدور دکھائی دے گئے۔ وہ کنواں صاف کرنے کا کام بھی کر لیتے تھے۔ کنواں دیکھ کر انھوں نے جو مزدوری بتائی، اس سے ان کی تیوری چڑھ گئی۔ ''ساٹھ روپے! ساٹھ کیوں، پورے سو مانگے ہوتے۔ ارے، کون سا پہاڑ توڑنے کا کام ہے؟ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ مشکل سے لگے گا۔''

''پھر بھی آدھے دن سے کم نہیں لگے گا۔ جوکھم کا کام ہے۔''

جب انھوں نے پہلے والے کنجڑے کی مثال دی کہ ایک وہ تھا جو بغیر ایک پیسہ لیے کنواں

صاف کر جاتا تھا، تو وہ یہ بڑبڑاتے ہوے چلے گئے کہ تب وہ ویسا ہی کوئی آدمی کیوں نہیں تلاش کر لیتے؟ ان کے بیوی بچے ہیں جن کو انھیں کھلانا ہے۔ ان کے لیے وہی سب سے بڑا دھرم ہے۔

بیٹے بھر گو نے پچاس روپے کا منی آرڈر بھیجا تھا۔ منی آرڈر کی پیغام لکھنے والی جگہ پر جب انھوں نے لکھا ہوا پڑھا، ''روپے اماں کے واسطے بھیج رہا ہوں، اماں کے کپڑے ضرور بنوا دینا''، تو انھوں نے منی آرڈر واپس لوٹا دیا۔ پانچ مہینے بعد پچاس روپلّی بھیج رہے ہیں اور اس پر یہ ہدایت نامہ کہ 'ضرور بنوا دینا!' جیسے وہ روپے اپنے تن پر لگا لیتے۔ ارے، تمھاری اماں کو بیاہ کر لائے ہیں تو اس کا نان نفقہ بھی کریں گے۔ تمھاری اماں یہاں بھوکی ننگی نہیں رہتی ہے۔ وہ موقع ملتے ہی کانپور جائیں گے اور بٹیا کو بھی لے آئیں گے۔ جیسے پانچ کو بیاہا ہے، ویسے اس چھٹی کو بھی بیاہ دیں گے۔ کلجگی کہیں کا! ماں باپ سے بڑھ کر بیوی ہو گئی ہے۔ اسے سر پر بٹھا کر ناچو...

بدری ناتھ کتھے والوں کے یہاں دیوی برت سے پہلے رامائن کی کتھا بیٹھتی تھی۔ وہ پتا لگانے گئے تھے۔ بدری ناتھ کا لڑکا انھیں کے سامنے رامائن کا ایک کیسٹ ٹیپ ریکارڈر پر چلا کر بولا تھا، ''اب یہ نئے پنڈت جی آ گئے ہیں۔ ماں جی اب ان سے کتھا سنیں گی۔'' وہ چلے آئے تھے۔ ''سسروں کی عقل پر پتھر پڑ گئے ہیں۔ اصل برہمن کے منھ سے قاعدے قرینے سے کتھا سننے کی اپنی شان ہے۔ اسی سے پُن ملتا ہے، پاپ کٹتے ہیں۔ اب اپنے پتا کا شرادھ [14] بھی کیسٹ سے کرنا۔''

اور اس کے بعد ہی موہنا سے پھر وہ مڈھ بھیڑ!

اس شام بازار سے وہ سبزی لے کر لوٹے تھے۔ دروازے پر کتا مرا پڑا تھا۔ ایں! یہ کیسے؟ لو، سالی نئی پریشانی! آتے ہوے بلی راستہ کاٹ گئی تھی۔ تبھی وہ سمجھ گئے تھے کہ ضرور کوئی کھٹراگ ہوگا۔ انھوں نے اندر آ کر پتنی سے پوچھا۔ پتنی نے بتایا کہ پھٹ پھٹی کی آواز کے ساتھ کتا بری طرح چلایا تو تھا۔ کوئی کہہ بھی رہا تھا کہ کتا دب گیا۔

''تم کو دیکھنا چاہیے تھا۔''

''دیکھ کر میں کرتی کیا؟ کیا پھٹ پھٹی والے سے کہتی، کتا مار ڈالا ہے تو اس کی لاش بھی پھٹ پھٹی پر لاد کر لیے جاؤ؟''

---

[14] شرادھ: مرنے کے بعد ادا کی جانے والی ایصال ثواب کی رسم۔

ستیہ نارائن کے چہرے پر آڑی ترچھی لکیریں کھنچ گئیں۔ وہ دروازے پر آ گئے۔ کتے کا منھ کھلا ہوا تھا۔ پاس میں میلے خون کا گاڑھا چکتا لسلسا رہا تھا۔ مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ اب یہ کتا رات بھر یہیں پڑا رہے گا۔ تبھی انھیں یاد آیا کہ کل اتوار ہے، صفائی والوں کی کل چھٹی رہے گی، جیسے ڈاک خانے، بینکوں کی رہتی ہے۔ زمانے کے قربان جاؤں! یہ کتا بھی دروازے کے آگے پڑا سڑے گا۔

انھوں نے موہنا کے گھر کی طرف دیکھا۔ اس کی عورت باہر لگے نل سے پانی بھر کر اندر لیے جا رہی تھی۔ تبھی تو سرکاری نل کا پانی استعمال کرنا ان کی طبیعت کو گوارا نہیں۔ موہنا کا لڑکا باہر آیا تھا۔ انھوں نے اسے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ اشارہ پا کر بھی اپنی جگہ پر ڈھیٹ بنا کھڑا رہا اور پھر اندر چلا گیا۔

دو گلی پار ان کے یہاں گندگی اٹھانے والی جمعدارنی رہتی تھی۔ وہ وہاں چلے گئے۔ جمعدار اونچا سنتا تھا اور اسے دکھائی نہیں دیتا تھا۔ وہ گھر پر اجگر کی طرح پڑا رہتا تھا۔ جمعدارنی نے کہا کہ اس کا بدن ٹوٹ رہا ہے۔ جب انھوں نے کہا وہ کسی اور کو بھیج دے تو اس نے کہا کہ وہی کسی سے بات کر لیں۔ پڑوس میں منھ پر ڈھیر ساری چکنائی پوتے ہوئے ایک عورت بیٹھی تھی۔ وہ اٹھ کر اندر چلی گئی۔

وہ واپس آ گئے۔ چہرے پر کچھ نئی لکیریں پڑ گئی تھیں۔

موہنا سے پوچھ لیا جائے۔ پوچھنے میں حرج کیا؟ اسے یہ تو معلوم نہیں ہوگا کہ وہ تھانے گئے تھے۔ ویسے اس دن وہ بہت بدتمیزی سے پیش آیا تھا۔ شکایت کرنے پر اسے اپنی غلطی مان لینی چاہیے تھی، بات آئی گئی ہو جاتی۔ اس کا سسر منا بھی تو وہیں رہتا تھا۔ پوری زندگی یہیں چپ چاپ کاٹ دی۔

وہ جا کر احاطے کے نکاس کے پاس کھڑے ہو گئے۔

موہنا سامنے والی دیوار کے پیچھے چارپائی پر بیٹھا تھا۔ چارپائی پر چار لوگ اور بھی بیٹھے تھے۔ وہ باتیں کر رہے تھے۔ تھوڑے فاصلے پر بیٹھی موہنا کی عورت سل پر رگڑ رگڑ کر ایڑی صاف کر رہی تھی۔

موہنا نے ان کی جانب آنکھ اٹھائی۔ عورت ایڑیاں صاف کرنے کا کام جاری رکھتے ہوئے دیکھنے لگی۔

"میرے دروازے کے ٹھیک آگے ایک کتا دب کر مر گیا ہے۔ بازار سے لوٹ کر مجھے پتا لگا۔ اسے ذرا اٹھوا دو۔"

Scanned with CamScanner

آدھا منٹ چپ رہ کر موہنا بولا، ''دیکھوں گا۔''

''کل اتوار ہے۔ گاڑی والا آئے گا نہیں۔ کتا پڑا سڑے گا، اٹھوا دو۔''

''دیکھوں گا۔''

'دیکھوں گا' کا مطلب ان کی پتنی نے 'اٹھوا دوں گا' بتلایا۔ لیکن آدھ گھنٹہ انتظار کرنے کے بعد بھی جب کتا اٹھانے کوئی نہیں آیا تو وہ بے چینی سے ڈسے ہوئے پھر گئے۔

''موہن لال، اب اٹھوا بھی دو۔ اٹھ جائے تو میں اشنان کر کے پوجا پاٹھ کروں۔''

''ابھی میں ضروری باتیں کر رہا ہوں،'' موہن لال یعنی موہنا یہ کہہ کر اپنے ساتھیوں سے پھر کچھ بتیانے لگا۔ دراصل آج یونین کی میٹنگ تھی اور وہاں وہ کنٹونمنٹ کے نئے اہلکار کی، اس کی تاناشاہی اور بدعنوانی کی بنیاد پر، نعروں اور تقریروں سے ایسی تیسی کر کے آئے تھے۔ اس وقت وہ اس کیے ہوئے کا آنند تو لے ہی رہے تھے، اہلکار کا تبادلہ نہ ہونے پر اٹھائے جانے والے اگلے قدم کے بارے میں غور بھی کر رہے تھے۔

''موہن لال، بس پانچ منٹ کا کام ہے۔ اٹھا کر کوڑے کے ڈھیر پر ڈالنا ہے۔ کتا مرا میرے دروازے پر ہے، اس لیے فکر مجھی کو ہے۔''

''کتے کی کرنی اچھی تھی۔ باہمن دیوتا کے دروازے پر مرا ہے تو سورگ میں گیا ہوگا،'' چندھی آنکھوں والا جمعدار، جو جنٹل مین بنا صاف قمیض اور پتلون پہنے تھا، ہونٹ پھیلا کر بولا۔ پان چباتی موہنا کی عورت کے ہونٹ بھی چمک کے ساتھ پھیل گئے تھے۔

ستیہ نارائن کو اس بھنگی کا یہ مذاق برا لگا، مگر وہ اس وقت اسے پی گئے۔

''جو اٹھانے آئے گا اسے میں روپیہ دوں گا۔ موہن لال، بس یہ کام ہو جانا چاہیے۔ کچھ بھی تو دیر نہیں لگے گی۔''

''ابھی میں ضروری باتیں کر رہا ہوں۔''

ستیہ نارائن دوبارہ واپس آ گئے۔ اچھی جان عذاب میں ہے۔ یہ موہنا نہ تو سیدھے ناں کہتا ہے اور نہ ہاں۔ سالا بڑا ڈپلومیٹ بن گیا ہے۔ اس گھاگ پن سے ہی تو انھیں چڑ ہے۔ وہ اندر جا کر پتنی پر بگڑے کہ وہ یہ کیوں کہتی ہے کہ پڑا رہنے دو، پڑا رہنے دو۔ گرہست آدمی کے گھر کے آگے کسی

Scanned with CamScanner

جانور کی لاش گہری شام میں پڑی نہیں رہنی چاہیے... پھر بے وقوفی کی بات ۔ وہ اٹھا سکتے تو اب تک اٹھا نہ دیتے؛ چرخی کی طرح کیوں یہاں وہاں ناچتے گھومتے ۔ مجبوری کے نام پر گوتو نہیں کھالیں گے ۔ ریت رواج بھی سسرے کوئی چیز ہوتے ہیں یا نہیں؟

وہ باہر آگئے ۔ کوئی دوسرا ویسا نظر آئے تو اس سے خوشامد کرلیں ۔ لیکن ویسا آدمی نظر پڑ نہیں رہا تھا ۔ موہنا کے گھر میں وہ آدمی ابھی بھی ڈٹے ہوئے ہیں ۔ ایسی کون سی راج پاٹ کی باتیں ہیں جواب تک چل رہی ہیں؟ کچھ نہیں، سالے مٹا گئے ہیں ۔ ارے، ذرا دیر کا کام تھا، نپٹا لیتے، پھر کر لیتے جی بھر کے باتیں ۔

وقت جتنا بیت نہیں رہا تھا، اس سے زیادہ بیتتا ہوا انھیں لگ رہا تھا ۔ لگتا کہ موہنا کے یہاں سے کوئی آئے گا نہیں ۔

تبھی ایک موٹا سؤر وہاں آگیا ۔ اس نے کتے کو سونگھا اور پھر آگے بڑھ کر نالی میں چھپ چھپ کرتا اتر گیا ۔

ان کے ستارے خراب چل رہے ہیں، تبھی تو آج سنیچر کے دن یہ ناس پیٹا کتا ان کے دروازے پر آکر مر گیا ۔

نالی سے نکل کر وہ سؤر جھومتا ہوا پھر آگیا اور کتے کو سونگھ کر اپنی تھوتھنی سے اسے پلٹنے لگا ۔

''بھاگ حرامی! تو بھی یہاں اس وقت کتے کا رونا پیٹنا کرنے آگیا ۔''

سؤر نے اپنی چندھی آنکھیں دو لمحے کے لیے ان کی طرف اٹھائیں ۔ کیا کہا؟ اچھا، بکتے ہو تو بکو! اور لاش کو پھر پلٹنے لگا ۔ چڑانے کے لیے وہ نالی میں بھیگی اپنی پونچھ کو بھی سٹ سٹ ہلانے لگا ۔

انھوں نے جھلا کر ایک اینٹ ماری ۔ اس کا اثر ہوتا نہ دیکھ کر وہ اندر سے سامنے رکھا ہوا موٹا بانس اٹھا لائے ۔ سؤر تھل تھل کر کے بھاگنے لگا ۔ وہ اس کے پیچھے بلبلاتے ہوئے بھاگنے لگے ۔ بانس کا وار دو تین دفعہ خالی جا کر سؤر کے پیر پر کس کر بیٹھا ۔ سؤر کنکیاتا ہوا تیزی سے اندر گھس گیا ۔

''کون ہے بے؟'' کی آواز کے ساتھ موہنا باہر آگیا ۔ اس کے چاروں ساتھی بھی آگے پیچھے نکل آئے ۔

''غریب سؤر کو کیوں مارا؟ کون سی اس نے خطا کی تھی؟'' موہنا کا لہجہ تمتمایا ہوا تھا ۔

Scanned with CamScanner

''دوبار آکر خوشامد کر گیا، ذرا کتا اٹھوا دو۔ کتا تو اٹھوایا نہیں، الٹے اپنا سوٗر ٹھیل دیا لاش کی درگت بنانے کو۔''

''تو کتے کا کریا کرم پنڈت، تم نے کر دیا ہوتا،'' چندھی آنکھوں والا، جنٹل مین بنا موہنا کا وہی ساتھی بولا۔

''کریا کرم تو اپنے بیوی بچوں کا کر! سالے کو بولنے کی تمیز نہیں اور ٹر ٹر بول رہا ہے۔''

''پہلے خود تو بولنے کی تمیز سیکھو، پھر دوسرے کو سکھانا۔ مرا کتا نہیں اٹھایا تو رونے لگ گئے۔ کیا تمھارے نوکر ہیں جو حکم ہوا نہیں اور سر پر پیر رکھے چلے آئے؟''

تکرار چل ہی رہی تھی کہ اندر گیا سوٗر کھدیڑ دیے جانے پر باہر بھاگا۔ ستیہ نارائن بچنے کی کوشش میں گر گئے۔ ان کی دھوتی کی کاچھ[15] کھل گئی۔

''سوٗر نے پنڈت جی کے پاؤں چھوئے تھے،'' ایک دوسرا ساتھی بھدی ہنسی ہنسا۔

''حرام زادو، اپنی اوقات نہ بھولو، تم نیچ لوگ ٹھیک جوتے پڑنے سے ہی...''

''پنڈت، بوکھلاؤ مت! سوٗر نے تو دھوتی کی کاچھ ہی کھولی ہے، میں پوری کھول دوں گا۔''

موہنا کے ایک دوسرے ساتھی نے دھکا دیا۔ ''خیریت چاہو تو یہاں سے ترنت پھوٹ لو۔ اب کے جوتے کی بات منھ سے نکالی نہیں کہ جوتے کے ساتھ تمھارا یہ بانس تمھارے منھ سے گھس کر... سے نکلے گا۔''

چند راہگیر اور آس پاس کے لوگ جمع ہو گئے تھے۔ ایک بانہہ پکڑ کر ستیہ نارائن کو وہاں سے کھینچ لایا۔ ''آپ کو ان لوگوں سے الجھنا نہیں چاہیے تھا۔ اپنی عزت اپنے ہاتھ ہوتی ہے۔''

ایک دوسرے کو بتا رہا تھا، ''پنڈت جی پر بھنگیوں نے ہاتھ چلا دیا۔ بے چارے گر گئے۔''

ستیہ نارائن نہار رہے تھے، مگر نہ تو غصہ دھل رہا تھا، نہ ذلت، نہ ندامت۔ غصہ، ذلت، ندامت نہ جانے کتنا تن سے لتھڑ گئے تھے۔ وہ اندر کی گہری پرتوں میں گھس گئے تھے۔ بھنگیوں نے ان کو گندی گالیاں دیں۔ اس دن بھی موہنا نے گالیاں دی تھیں۔ آج دھکا بھی دیا۔ دوسروں کی نگاہ میں وہ بھنگیوں سے پٹ گئے۔

---

15 کاچھ: دھوتی کے نچلے حصے کو گھٹنوں سے اوپر رکھنے کے لیے باندھی جانے والی گرہ۔

Scanned with CamScanner

سر میں لوٹا لگا اور انھوں نے لوٹا پٹک دیا۔

چولا[16] چھوٹ جائے تو اچھا ہے۔ یہ دنیا اب عزت دار لوگوں کے رہنے کے لائق نہیں ہے۔ بھنگی چماروں کا راج ہے۔ تھانے پر جاؤ، سالا تھانیدار بھی انھیں لوگوں کی حمایت کرتا ہے۔ زمانہ بدل گیا ہے۔ جن لوگوں کے لیے بدلا ہے، اب وہی جئیں۔ انھیں یاد آیا کہ پچھلے سال بابو رمیش چندر گپتا کی لڑکی نے ایک کہار لڑکے سے شادی کر لی تھی، انھوں نے پھانسی لگا لی تھی۔

انھوں نے کنویں پر پڑی رسّی کی طرف دیکھا۔ اسی سے لٹک کر انھیں بھی مر جانا چاہیے۔ غصے سے اندھا، سب کچھ کھویا ہوا اور مایوسی سے گھرا آدمی اپنے پر سے کب ضبط کی آخری رکاوٹ بھی ہٹا لے گا، کہا نہیں جا سکتا۔

کپڑے بدلتے ہوئے کوٹھری میں ان کا پیر مٹی کے تیل کی کپی سے ٹکرا گیا۔ کپی گر گئی۔ انھوں نے بچ رہے تیل کو اپنے اوپر ڈال لیا اور پھر جلتی ہوئی کپی بھک سے لگا لی۔

اس شہر میں ریزرویشن[17] کے خلاف احتجاج کی لہر میں بھی دو خودسوزیاں ہوئی تھیں، لیکن پنڈت ستیہ نارائن والی یہ واردات اس سے پہلے کی ہے۔

❊❊

---

[16] چولا: جسم کو محاورتاً روح کا چولا یا لباس کہا جاتا ہے۔ چولا چھوٹ جانے سے مراد ہے موت آ جانا۔

[17] ریزرویشن: آزادی کے بعد تعلیمی اداروں میں داخلوں اور سرکاری ملازمتوں میں نچلی ذات والوں اور ذات پات کے نظام سے باہر، اور بھی نیچے کے آدی واسی قبائلیوں کے لیے کوٹا مقرر کیا گیا، جس کے فیصد تناسب میں متواتر اضافہ کیا جاتا رہا ہے۔ اونچی ذات کے لوگ، خصوصاً برہمن، جن کو یہ مواقع آبادی میں اپنے تناسب سے کہیں زیادہ حاصل رہے تھے، نچلی ذات والوں کو دی جانے والی ریزرویشن کے خلاف احتجاج کرتے رہے ہیں۔ بعض موقعوں پر اس احتجاج نے نہایت پرتشدد رنگ اختیار کیا۔ ایک طرف نچلی ذات والوں کے گھروں کو آگ لگائی جاتی رہی، دوسری طرف کئی اونچی ذات والوں نے احتجاجاً خودسوزی کر لی۔

Scanned with CamScanner

سٹی پریس میں دستیاب رسائل وجرائد

کتابی سلسلہ مکالمہ کراچی
مدیر: مبین مرزا
قیمت: 150 روپے

کتابی سلسلہ دنیازاد کراچی
مدیر: آصف فرخی
قیمت: 120 روپے

ماہنامہ آئندہ کراچی
مدیر: محمود واجد
قیمت: 80 روپے

جریدہ کراچی
مدیر: خالد جامعی / عمر حمید ہاشمی
قیمت: 300 روپے

سہ ماہی بادبان کراچی
مدیر: ناصر بغدادی
قیمت: 100 روپے

ارتقا کراچی
ترتیب: راحت سعید، ڈاکٹر محمد علی صدیقی
قیمت: 100 روپے

سہ ماہی ارتکاز کراچی
مدیران: راغب شکیب، سیما شکیب
قیمت: 200 روپے

سیپ کراچی
مدیر: نسیم درانی
قیمت: 75 روپے

سہ ماہی اقبالیات لاہور
رئیس ادارت: محمد سہیل عمر
قیمت: 30 روپے

سویرا لاہور
ترتیب: محمد سلیم الرحمٰن / ریاض احمد
قیمت: 200 روپے

سہ ماہی مونتاج لاہور
مدیرہ: منصورہ احمد
قیمت: 150 روپے

سہ ماہی ادبیات اسلام آباد
سرپرست: افتخار عارف
قیمت: 50 روپے

سہ ماہی سمبل راولپنڈی
مدیر: محمد علی فرشی
قیمت: 150 روپے

سہ ماہی قرطاس گوجرانوالہ
مدیر: مکنون احمد جان
قیمت: 100 روپے

سہ ماہی الزبیر بہاولپور
مدیر: شاہد حسن رضوی
قیمت: 200 روپے

نقاط فیصل آباد
مدیر: قاسم یعقوب
قیمت: 150 روپے

شعر و حکمت حیدرآباد دکن
مدیر: شہریار، مغنی تبسم
قیمت: ضخامت کے اعتبار سے

سہ ماہی نیا ورق ممبئی
مدیر: ساجد رشید
قیمت: 70 قیمت

کتابی سلسلہ پہچان الہ آباد
مدیر: زیب النساء، نعیم اشفاق
قیمت: 100 روپے (غیر مجلد)
150 روپے (مجلد)

سہ ماہی اردو ادب دہلی
مدیر: اسلم پرویز
قیمت: 50 روپے

Scanned with CamScanner

محمد سلیم الرحمٰن اردو کی وقیع ترین ادبی شخصیات میں سے ہیں۔ ان کے وسیع اور نہایت متنوع ادبی کام کا ایک بہت اہم حصہ ترجموں پر مشتمل ہے۔ آج کی کتابیں کے زیر اہتمام محمد سلیم الرحمٰن کے منتخب ترجموں پر مشتمل کتاب ''کارل اور اینا'' اور جوزف کونریڈ کے ناول کا ترجمہ ''قلب ظلمات'' شائع کیے جا چکے ہیں۔ اس کے علاوہ ''آج'' کو ان کی دیگر تحریروں کے علاوہ ترجمے بھی وقتاً فوقتاً شائع کرنے کا اعزاز حاصل ہوتا رہتا ہے۔ اس بار ان کے کیے ہوئے تین کہانیوں کے ترجمے پیش کیے جا رہے ہیں۔ ان میں سے ایک کہانی جرمن شاعر اور ناول نگار ہرمن ہیسے کی تحریر کردہ ہے، دوسری چیک ادیب کاریل چاپیک کی اور تیسری برطانوی مصنفہ اینا کیون کی۔ یہ ترجمے برسوں پہلے مختلف رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں، لیکن نئے پڑھنے والے ان سے شاید ہی واقف ہوں۔ ہماری کوشش ہے کہ ترجمے کے اس کام کو پڑھنے والوں کے لیے دستیاب رکھا جائے۔ اس سلسلے میں محمد سلیم الرحمٰن اور بعض دوسرے مترجموں کی ترجمہ کی ہوئی تحریریں آئندہ شماروں میں بھی شائع کی جاتی رہیں گی۔

Scanned with CamScanner

ہرمن ہیسے

انگریزی سے ترجمہ: محمد سلیم الرحمٰن

ڈاکٹر فاؤسٹ کے ساتھ ایک شام

ڈاکٹر فاؤسٹ ڈائننگ ٹیبل پر اپنے دوست ڈاکٹر آئزن بارٹ کے ساتھ بیٹھا تھا (یہاں یہ بتا دیا جائے کہ ثانی الذکر اس طبیب کا پردادا تھا جسے بعد ازاں اتنی شہرت ملی [1]) پر تکلف دستر خوان بڑھایا جا چکا تھا، وزنی مطلا ساغر رہائن کی مہکیلی انگوری شراب سے لبالب تھے اور موسیقار، ایک نَے نواز اور دوسرا بربط نواز، جو کھانے کے دوران میں ساز بجاتے رہے تھے، ابھی ابھی دال فے عین ہوئے تھے۔

ڈاکٹر فاؤسٹ نے پرانی شراب کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا، ''اب وہ چیز تمھیں عملاً دکھاتا ہوں جس کا وعدہ تھا۔'' وہ اب جوان آدمی نہیں رہا تھا اور اس کے جبڑے قدرے بھرے بھرے نظر آنے لگے تھے۔ یہ اس کے بھیانک انجام سے دو تین سال پہلے کا ذکر ہے۔

''میں تمھیں بتا ہی چکا ہوں کہ میرا اگر گا کبھی کبھار ایسی عجوبہ کلیں بنا لیتا ہے جن کی مدد سے ہم ماضی اور مستقبل میں دور دور تک دیکھ اور سن سکتے ہیں۔ اور اب کے مرے یار نے کوئی بہت ہی انوکھی اور دل لگی والی چیز ایجاد کی ہے۔ وہ اکثر ہمیں طلسمی آئینوں میں ماضی کے رستموں اور پری چہرہ بیگموں کا دیدار کرا چکا ہے۔ لیکن اس بار اس نے کوئی چیز کانوں کے لیے وضع کی ہے۔ یہ ایک طرح کا نرسنگھا ہے جس کے ذریعے سے وہ آوازیں ہم تک پہنچ سکیں گی جو مستقبل بعید میں اس جگہ سنی جائیں گی جہاں یہ کل اب رکھی ہو۔''

---

[1] یعنی ڈاکٹر یوہانس اندرے یاس آئزن بارٹ (1661-1727) جس کا نام پھوہڑ یا قسی القلب طبیب یا عطائی کے طور پر زبان زد خاص و عام ہے۔

''لیکن، اماں یار، کہیں ایسا تو نہیں کہ تمھارا خدمت گذار تمھیں کچھ فریب دے رہا ہو؟''

''میں ایسا نہیں سمجھتا،'' فاؤسٹ نے کہا، ''مستقبل کسی طرح سے بھی کالے علم کی رسائی سے باہر نہیں۔ جیسا کہ تم جانتے ہو، ہم نے ہمیشہ اس مفروضے پر تکیہ کیا ہے کہ دنیا میں پیش آنے والے تمام واقعات، کسی استثنا کے بغیر، علت اور معلول کے قانون کے تابع ہیں۔ چنانچہ ماضی کی طرح مستقبل میں بھی کوئی ردو بدل ممکن نہیں۔ علیت کے قانون کے تحت مستقبل کا بھی تعین ہو چکا۔ پس مستقبل میں ہونے والا ہر واقعہ پہلے ہی سے موجود ہے، گو ہم ابھی اسے دیکھنے اور چکھنے کے قابل نہیں ہوے۔ بعینہٖ جیسے کوئی ریاضی داں اور ماہرِ فلکیات گرہن لگنے کے بالکل صحیح وقت کی مدتوں پہلے پیش گوئی کر سکتا ہے، اسی طرح، اگر ہم کوئی طریقہ ایجاد کر سکیں تو مستقبل کے کسی اور حصے کو بھی مرئی اور قابلِ سماعت بنانا ممکن ہو جائے گا۔ اور اب میفسٹوفیلیس نے ایک طرح کی سمعی طلسمی چھتری ایجاد کی ہے۔ اس نے ایک پھندا ترتیب دیا ہے جس میں وہ ساری آوازیں جو اس کمرے میں آج سے سیکڑوں سال بعد سنائی دیں گی، آکے پھنستی جائیں گی۔ ہم اسے کئی مرتبہ آزما چکے ہیں۔ بعض اوقات، ظاہر ہے، کوئی آواز سنائی نہیں دیتی لیکن اس کا مطلب صرف اتنا ہے کہ ہمارا ملاپ مستقبل میں کسی خالی جگہ سے ہو گیا ہے، کسی ایسے لمحے سے جس میں کچھ بھی شنیدنی نہیں۔ دوسرے موقعوں پر ہم نے ہر طرح کی آوازیں سنی ہیں۔ مثلاً ایک بار ہم نے لوگوں کے ایک گروہ کو بولتے سنا جنھیں مستقبل بعید میں پیدا ہونا ہے۔ وہ ایک نظم کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے جس میں ڈاکٹر فاؤسٹ کے کارنامے — میرے کارنامے — بیان کیے گئے ہیں۔ لیکن بس، بہت ہو لیا، اسے آزما ہی کیوں نہ لیں۔''

طلب کیے جانے پر گرگراہوں والا معبودہ بھورا جبہ پہنے نمودار ہوا۔ اس نے ایک چھوٹی سی کل اٹھا رکھی تھی جس میں ایک نرسنگھا نصب تھا۔ کل اس نے میز پر رکھ دی۔ دونوں صاحبوں کو اچھی طرح سے یہ تاکید کرنے کے بعد کہ وہ پوری کارروائی کے دوران میں قطعاً خاموش رہیں، اس نے ایک ہتھی گھمائی اور مشین مدھم سروں میں گونجنے لگی۔

خاصی دیر تک اس گونج کے سوا جس پر دونوں ڈاکٹر اضطراب آمیز توقع کے ساتھ کان لگائے رہے، کچھ بھی سنائی نہ دیا۔ پھر اچانک ایک ایسی آواز سننے میں آئی کہ اس جیسی کوئی چیز انھوں نے پہلے کبھی نہ سنی تھی: ایک وحشیانہ، پُر خباثت ہُو ہُو۔ کیا وہ کسی نامعلوم بلا کی آواز تھی یا کوئی شیطان آگ بگولا

Scanned with CamScanner

ہو رہا تھا؟ وہ بے قرار، غضب آلود اور بھیانک آواز بار بار ذرا ذرا سی دیر کے لیے نہایت زور شور سے بلند ہوتی اور اسے سن کر اگر کچھ سوجھتا تھا تو یہی کہ صید ہونے والا کوئی اژدہا پھنکار رہا ہے۔ ڈاکٹر آئزن بارٹ کا رنگ فق ہو گیا اور اس نے اطمینان کا سانس اس وقت لیا جب آخرکار، متعدد بار سنائی دینے کے بعد، وہ ہیبت ناک چیخیں کہیں دور جا کر ختم ہو گئیں۔

اس کے بعد خاموشی چھا گئی لیکن پھر ایک نئی آواز آئی: جیسے بڑی دور سے آنے والی کسی مرد کی آواز جو اقتضائی، ناصحانہ لہجے میں بول رہا تھا۔ جو کچھ کہا جا تا رہا، اسے سامعین جستہ جستہ سنتے اور سنے ہوئے کو سادہ کاغذوں کے ان پیڈوں پر، جو اس مقصد کے لیے وہاں پہلے ہی سے رکھ دیے گئے تھے، ٹانکنے میں کامیاب ہو گئے۔ مثلاً ایسے جملے:

"......اور یوں، امریکہ کی درخشاں مثال کے تتبع میں، صنعتی ترقی کا نصب العین کسی رکاوٹ کو خاطر میں نہ لاتا ہوا اپنے کامران حصول اور تکمیل کی طرف رواں دواں ہے... جب کہ ایک طرف تو محنت کش طبقے کو حاصل آسائشیں ایسی سطح پر پہنچ گئی ہیں جس کی کوئی نظیر نہیں ملتی... اور ہم کسی اترابٹ کے بغیر یہ کہہ سکتے ہیں کہ جنت کے وہ طفلانہ خواب جو ہمارے اسلاف نے دیکھے تھے، پیداوار کی جدید تکنیکوں کے طفیل نہ صرف یہ کہ..."

دوبارہ خاموشی۔ پھر ایک نئی، پاٹ دار اور متانت آمیز آواز یہ کہتی سنائی دی: "خواتین و حضرات! اب میری آپ سے استدعا ہے کہ متوجہ ہو کر عظیم نکولس زیر برشت کی ایک نظم سنیں۔ میں مبالغے کے بغیر کہتا ہوں کہ جہاں تک ہمارے عہد کے سب سے باطنی جوہر کو بے نقاب کرنے اور ہمارے وجود کی معنویت اور مہملیت کے اندر اتر جانے کا تعلق ہے، نکولس کا کوئی ثانی نہیں۔

پوری چمنی اپنے ہاتھوں میں اٹھائے
اپنے ہر کلّے میں اِک پھکنا دبائے
اور پریشر گیج کا جوں جوں تقاضا بڑھتا جائے
وہ بنا ڈنڈوں کی سیڑھی پر کھٹاکھٹ چڑھتا جائے

یوں وہ لمبی سیڑھیوں پر اوپر ہی اوپر چلا ہے
ہیں وہاں بادل بھی رقصاں جس جگہ اس کا ہے دامن

اور اس ڈر سے کہ چوپٹ ہو نہ جائے اس کا جیون
اس کا سر بالکل ہی چکر کھا گیا ہے

ڈاکٹر فاؤسٹ اس نظم کا بیشتر حصہ قلم بند کرنے میں کامیاب رہا اور ڈاکٹر آئزن بارٹ بھی بڑی تن دہی سے کام میں مشغول تھا۔

ایک تند سی آواز سنائی دی جو بلاشبہ کسی ادھیڑ عمر کی عورت کی تھی۔ وہ بولی: ''بور پروگرام ہے۔ کیا ریڈیو انھوں نے اسی لیے ایجاد کیا تھا؟ خیر، مضائقہ نہیں۔ اب ہمیں کم از کم کچھ موسیقی تو سننے کو ملے گی۔''

اور واقعی لمحے بھر بعد موسیقی جیسے پھوٹ پڑی، باری باری سے ابھی وحشیانہ تو ابھی شہوانی، ابھی سُر سے سُر زوردار طرح سے ملے ہوئے تو ابھی کریہہ الصوت اور نڈھال، قطعاً نامانوس، عجیب انداز سے بیہودہ، موذی موسیقی جسے بھونکتے، ترتراتے، کڑکڑاتے ہوائی سازوں پر بجایا جا رہا تھا، جس میں وقفے وقفے سے گھڑیال بج اٹھتے تھے اور اس چیخم دھاڑ کے بیچ میں گاہے گاہے کوئی گلا پھاڑتی آواز کس نامعلوم زبان کے الفاظ گاتی سنائی دے جاتی تھی۔

نپے تلے وقفوں کے بعد ایک پُر اسرار شعر کھنکتی آواز میں سنائی دیتا:

رات کو سونے سے پہلے سر میں گل گل تم لگاؤ
اپنے بالوں کو ہمیشہ خوب کالے، خوب چمکیلے بناؤ

اور رہ رہ کر وہی پہلے والی موذی، بھیانک آواز، وہی کسی جھنجھلاتے اور ستائے ہوئے اژدہے کی چیخ، دہرائی جاتی رہی۔

جب گرگے نے مسکراتے ہوئے اپنی کل بند کی تو دونوں عالموں نے یوں خفیف اور شرمندہ ہو کر آنکھیں چار کیں جیسے وہ بلا ارادہ کوئی ناشائستہ اور حرام بات دیکھ بیٹھے ہوں۔ انھوں نے اپنے اپنے لکھے ہوئے نوٹ اوّل تا آخر پڑھے اور ایک دوسرے کو دکھائے۔

''اس بارے میں تمھارا کیا خیال ہے؟'' آخرش فاؤسٹ نے پوچھا۔

آئزن بارٹ نے اپنے رطل سے ایک لمبا گھونٹ بھرا۔ اس نے فرش پر نظر جما دی اور دیر تک متفکر اور خاموش بیٹھا رہا۔ بالآخر اس نے بات کی تو ایسے گویا دوست سے زیادہ اپنے آپ سے مخاطب ہو۔ ''یہ ہولناک ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ بنی نوع انسان، جس کی زندگی کا نمونہ ابھی ہم نے سنا،

دیوانگی میں مبتلا ہے۔ یہ ہماری ہی آل اولاد ہے، یہ ہمارے ہی بیٹوں کے بیٹے اور ہمارے ہی پڑپوتوں کے پڑپوتے ہیں جنھیں ہم نے ایسی وحشت ناک، اذیت دینے والی، ان مل بے جوڑ باتیں کرتے، ایسی دل ہلا دینے والی چیخیں مارتے اور ایسے گول مول، بِلبلے شعر گاتے سنا ہے۔ ہماری آل اولاد، یار فاؤسٹ، آخر کو پاگل ہو جائے گی۔''

''میں اتنے تیقن سے بات نہیں کروں گا،'' فاؤسٹ بولا، ''تمھاری رائے ناممکنات میں سے نہیں مگر ضرورت سے زیادہ قنوطی ہے۔ دنیا کے ایک چھوٹے سے گوشے میں ایسی وحشیانہ، جوکھمی، ناشائستہ اور بلاشبہ مجنونانہ آوازوں کے سنے جانے کا لازمی طور پر یہ مطلب نہیں نکلتا کہ ساری اولادِ آدم پاگل ہو چکی ہے۔ شاید آج سے چند سو برس بعد عین اسی مقام پر کوئی پاگل خانہ تعمیر کیا جائے گا اور ہم اس کی روزمرہ کی زندگی کا نمونہ سنتے رہے ہیں۔ یا ممکن ہے کہ جن لوگوں کی آوازیں ہم نے سنیں وہ نشے میں دھت ہوں۔ میلے ٹھیلوں میں جانے والے تماش بینوں کا تصور کرو کہ وہ کس طرح غل غپاڑا مچاتے ہیں۔ یہ آوازیں بھی اسی قبیل کی معلوم ہوتی تھیں۔ لیکن گھبراہٹ تو مجھے ان دوسری آوازوں کو، ان چیخوں کو، سن کر ہوئی ہے جو نہ تو انسانی حلق سے نکل سکتی ہیں، نہ موسیقی کے آلات سے۔ وہ مجھے ٹھیٹھ شیطانی معلوم ہوئیں۔ صرف شیاطین ہی ایسی آوازیں نکال سکتے ہیں۔''

وہ میفسٹوفیلیس سے مخاطب ہوا، ''کیا اس بارے میں تمھیں کچھ معلوم ہے؟ کیا تم بتا سکتے ہو کہ ہم کس قسم کی آوازیں سنتے رہے ہیں؟''

گرگے نے مسکراتے ہوئے کہا، ''ہم نے سچ مچ شیطانی آوازیں سنی ہیں۔ ایک زمانہ ایسا آئے گا جب یہ دنیا جو نصف سے بھی کچھ زیادہ اِس وقت بھی ابلیس کی جاگیر ہے، کلی طور پر اس کی ملکیت بن جائے گی۔ یہ دوزخ کا ایک حصہ، ایک صوبہ ہو جائے گی۔ حضرات، آپ نے اس ارضی دوزخ کی، لفظ و صوت پر مبنی، زبان کے بارے میں قدرے سخت اور حقارت آمیز کلمات استعمال کیے ہیں۔ میری رائے میں یہ معلوم ہو جانا کہ دوزخ میں بھی موسیقی اور شعر و شاعری موجود ہوگی، خوشگوار امر ہے اور دلچسپی سے خالی نہیں۔ اس شعبے کا نگران ابلیس ہے۔ میں یہی کہوں گا کہ وہ اسے بہت عمدگی سے چلا رہا ہے۔''

❋❋

کارل چاپیک

انگریزی سے ترجمہ: محمد سلیم الرحمٰن

وہ بھی کیا دن تھے

تھیبس کا شہری یوپاتور، جو ٹوکری ساز تھا، اپنے صحن میں بیٹھا ٹوکریاں بن رہا تھا کہ اس کا پڑوسی فیلاگورس پکا ہوا آیا اور خاصی دور ہی سے شور مچانے لگا۔

"یوپاتور! یوپاتور! ٹوکریوں کا پنڈ چھوڑو اور میری سنو! بڑے ڈراؤنے واقعات پیش آ رہے ہیں۔"

"کس کے گھر کو آگ لگ گئی؟" یوپاتور نے پوچھا اور یوں لگا جیسے وہ بس کھڑا ہوا ہی چاہتا ہو۔

"جو کچھ ہو رہا ہے وہ آگ لگنے سے بھی بدتر ہے،" فیلاگورس بولا۔ "پتا ہے کیا ہوا؟ لوگ ہمارے جنرل نیکوماخوس پر مقدمہ چلانا چاہتے ہیں۔ بعض لوگوں کے بقول وہ تھسالونیا والوں سے مل گیا تھا اور سازش کرنے کا مجرم ہے۔ بعضے اس پر شورش پسندوں کی جماعت کے ساتھ ملی بھگت کا الزام لگا رہے ہیں۔ جلدی چلو۔ ہم لوگ بازار والے چوک میں جمع ہو رہے ہیں۔"

"اور میں وہاں جا کر کیا کروں گا؟" یوپاتور نے بے دلی سے پوچھا۔

"بلا کا اہم معاملہ ہے یہ،" فیلاگورس بولا۔ "مقررین تو جوق در جوق وہاں کبھی کے پہنچ بھی چکے۔ بعضوں کا کہنا ہے کہ وہ مجرم ہے اور بعضے کہتے ہیں وہ بے گناہ ہے۔ چلو، ان کی باتیں سنیں۔"

"ایک منٹ رکو،" یوپاتور نے کہا۔ "میں اتنے یہ ٹوکری پوری کر لوں۔ اور مجھے یہ بتاؤ کہ نیکوماخوس سے اصل میں جرم کیا سرزد ہوا ہے؟"

"یہ تو لوگوں کو ٹھیک پتا نہیں،" اس کا پڑوسی بولا۔ "کوئی کچھ کہہ رہا ہے، کوئی کچھ، لیکن حکام نے ابھی کچھ نہیں کہا کیونکہ ایسا لگتا ہے کہ اس بارے میں تحقیقات ابھی مکمل نہیں ہوئی۔ لیکن چوک میں خوب دُند مچی ہوئی تھی۔ کاش تم وہاں ہوتے! بعض لوگ گلا پھاڑ پھاڑ کر کہہ رہے تھے کہ نیکو ماخوس بے گناہ ہے..."

"ایک منٹ ٹھہرنا۔ اگر انھیں ٹھیک طرح یہی معلوم نہیں کہ اس نے کیا جرم کیا ہے تو وہ چیخ چیخ کر اس کی بے گناہی کا ڈھنڈورا کیسے پیٹ سکتے ہیں؟"

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہر شخص نے کچھ نہ کچھ سن رکھا ہے اور جو سنا ہے بس اسی کو دہرائے جا رہا ہے۔ جو کچھ ہمارے سننے میں آئے اس پر بات کرنے کا حق تو ہم سب کو حاصل ہے، ہے کہ نہیں؟ میرے خیال میں نیکو ماخوس یہ کوشش کر رہا تھا کہ دغا فریب سے کام لے کر ہمیں تھسالونیا والوں کے اڑنگے پر چڑھا دے۔ چوک میں یہ بات کسی نے کہی بھی تھی اور یہ بھی بتایا تھا کہ اس کے کسی واقف کار نے ایک خط دیکھا ہے۔ لیکن ایک آدمی کا کہنا تھا کہ یہ نیکو ماخوس کے خلاف سازش ہے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ اس بارے میں ایک دو باتیں اسے بھی پتا ہیں۔ کہتے ہیں کہ حکومت اس میں ملوث ہے۔ تم سن رہے ہو، یوپا تور؟ اب سوال یہ ہے کہ..."

"ایک منٹ ٹھہرنا،" ٹوکری بننے والے نے کہا۔ "سوال اب یہ ہے کہ جو قانون ہم نے اپنے لیے بنائے ہیں وہ اچھے ہیں یا برے۔ کسی نے چوک میں اس بارے میں بھی کوئی بات کی؟"

"نہیں، لیکن اس پر کون بحث کر رہا ہے بھئی۔ زیرِ بحث تو نیکو ماخوس ہے۔"

"اور کیا کسی نے چوک میں یہ کہا کہ جو سرکاری افسر نیکو ماخوس سے پوچھ گچھ کر رہے ہیں وہ برے اور نامنصف ہیں؟"

"نہیں، اس بارے میں تو بالکل کچھ نہیں کہا گیا۔"

"تو پھر کہا کیا گیا؟"

"ارے میں تمھیں بتا تو رہا ہوں۔ بحث یہ ہو رہی ہے کہ آیا نیکو ماخوس قصوروار ہے یا بے گناہ ہے۔"

"سنو، فیلا گورس، اگر تمھاری بیوی قصائی سے لڑ پڑے اور کہے کہ وہ آدھ سیر گوشت تولتے وقت

ڈنڈی مار گیا ہے تو تم کیا کرو گے؟"

"بیوی کی حمایت کروں گا۔"

"نہیں جی۔ تم یہ دیکھو گے کہ قصائی کے پاس جو باٹ ہیں وہ ٹھیک ہیں۔"

"میاں، یہ مجھے پتا ہے۔ تمھارے بتائے بغیر پتا ہے۔"

"سمجھ گئے نا۔ اور پھر تم دیکھو گے کہ اس کی ترازو ٹھیک ہے یا نہیں۔"

"یوپاتور، یہ بات بھی کوئی کہنے کی ہے۔ مجھے پتا ہے۔"

"شکر ہے۔ اور اگر باٹ اور ترازو درست پائے گئے تو تم گوشت تول کر دیکھ لو گے کہ آدھ سیر ہے یا نہیں۔ اور تمھیں فوراً معلوم ہو جائے گا کہ حق پر کون ہے، قصائی یا تمھاری بیوی۔ یہ عجیب معاملہ ہے، فیلاگورس، کہ لوگ جب اپنے لیے گوشت خریدنے جاتے ہیں تو زیادہ سوجھ بوجھ کا ثبوت دیتے ہیں مگر جب کوئی عوامی امر درپیش ہوتا ہے تو عقل سے کام نہیں لیتے۔ نیکوماخوس مجرم ہے یا بے گناہ ہے؟ ترازو درست ہوگی تو جھوٹ سچ کا آپ پتا چل جائے گا۔ لیکن ترازو سے صحیح کام لینا مقصود ہے تو کسی طرف کے پلڑے کو پھونکیں مار مار کر اِدھر اُدھر نہ کیا جائے۔ کیوں جی، کیا تم یہ کہتے ہو کہ جو سرکاری افسر نیکوماخوس پر مقدمہ چلا رہے ہیں ان کا چال چلن یا کچھ اور ٹھیک نہیں؟"

"یہ تو کسی نے بھی نہیں کہا، یوپاتور۔"

"میں سمجھا تھا کہ تمھیں ان پر اعتبار نہیں۔ لیکن اگر تمھارے پاس ان پر اعتبار نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں تو پھر پلڑوں کو پھونکیں کیوں مار رہے ہو؟ تم ایسا یا تو اس لیے کر رہے ہو کہ تمھیں سچائی کا پتا چلانے سے مطلق کوئی دلچسپی نہیں یا صرف اس لیے کہ تم دو جماعتوں میں بٹ کر دنگا فساد کرنا چاہتے ہو۔ بھاڑ میں جاؤ تم لوگ، فیلاگورس۔ مجھے نہیں معلوم کہ نیکوماخوس مجرم ہے یا بے قصور ہے لیکن تم سب جس طرح انصاف کی راہ میں روڑے اٹکانے کی کوشش کے جرم میں ملوث ہو اس کے لیے تم پر لاکھ لعنت۔ حیرت ہے کہ اس برس بید کتنا خراب آیا ہے۔ مڑنے کو تو تانت کی طرح مڑ جاتا ہے مگر صلابت نام کو نہیں۔ ہمیں قدرے گرم موسم درکار ہے، فیلاگورس، مگر جو چیز دیوتاؤں کے بس میں ہو اس پر ہمارا کب زور چلتا ہے۔"

❋❋

اینا کیون

انگریزی سے ترجمہ: محمد سلیم الرحمٰن

واردات

ایک تپتی ہوئی رات ایک گلدار میرے کمرے میں آیا اور بستر پر میرے پہلو میں لیٹ گیا۔ میں اونگھ رہی تھی اور پہلے پہل مجھے خبر ہی نہیں ہوئی کہ وہ گلدار ہے۔ مجھے یوں لگا جیسے خواب میں کسی گدگدے تلووں والے جسیم جانور کو گھر میں، جس کے دروازے شدید گرمی کی وجہ سے چوپٹ کھلے پڑے تھے، دبے پاؤں چلتے سن رہی ہوں۔ وہاں اندھیرا کچھ اتنا زیادہ ہونے کے سبب یہ دکھائی کہاں ۔ ۔ ۔ یا کہ وہ لچکیلا، گٹھیلا پیکر مخملیں پنجوں کے بل دھیرے دھیرے چلتا ہوا میرے کمرے میں آیا اور کسی پس وپیش کے بغیر سیدھا میرے بستر کی طرف بڑھا جیسے اسے بخوبی علم ہو کہ بستر ادھر بچھا ہے۔ ایک ہلکی سی جست، پھر میری بانہہ پر، میری گردن پر، کندھے پر گرم گرم سانس، جیسے وارد ہونے والا لیٹنے سے پہلے مجھے سونگھتا رہا۔ کہیں دیر بعد، جب کھڑکی سے آنے والی چاندنی نے بُند کیوں والے تجریدی نقش ونگار کو اجاگر کر دیا، تو میں نے پہچانا کہ ایک غیر معمولی طور پر جسیم، خوش نما گلدار کی شکل میرے پہلو میں دراز ہے۔

وہ گہرے گہرے سانس لے رہا تھا، گو سانس لینے کی آواز سننا تقریباً محال تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ میٹھی نیند سو رہا ہے۔ میں اس کی چوڑی چکلی چھاتی کے یکساں پھیلاؤ اور سمٹاؤ کو دیکھتی رہی، اس کے چھبیلے، آسودگی بھرے جسم اور لچکیلے اعضا پر عش عش کر اٹھی اور میرا یہ یقین بالکل پختہ ہو گیا کہ تمام وحشی جانوروں میں گلدار سب سے خوبصورت ہے۔ گلداروں کی نسل کے اس مخصوص نمونے کے کاسۂ سر کی

بناوٹ میں مجھے ایک بات ایسی نظر آئی جو یکتا طور پر انسانوں جیسی تھی۔ بڑی بڑی بلیوں کا سر عموماً چپٹا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس اس گلدار کا سر قبہ دار تھا جس سے اندر موجود دماغ کے فائق ارتقا کے امکان کی طرف خیال جاتا تھا۔ میں اسے دیکھا کی اور پورے وقت اس کی فطری مہک کو بھی اپنے نتھنوں میں چڑھتے محسوس کرتی رہی۔ دھوپ، آزادی، چاند اور کچلی پتیوں کی ایک وحشی، اوائلی خوشبو جس میں جنگلی گل بوٹوں کی نیم شبانہ نمی سے ابھی تک سیلی سیلی، چتلی کھال کی ٹھنڈی تازگی گھل مل گئی تھی۔ مجھے یہ غیر انسانی مہک، جس نے انوکھے پن کے کسی ہالے کی طرح اسے گھیرے میں لے رکھا تھا، عجیب طور سے پر کشش اور دل کشا معلوم ہوئی۔

گھر کی دیواروں کی مانند میرا پلنگ بھی کٹھیا بانسوں پر تنی تاڑ کی چٹائیوں کا بنا ہوا تھا اور اس غضب کی گرمی میں بھی ہاتھ لگانے پر پھسلواں اور ٹھنڈا لگتا تھا۔ وہ پلنگ کم اور کمرے کے اندر کمرہ زیادہ تھا، تقریباً بارہ مربع فٹ کا ایک کشادہ چبوترا۔ چنانچہ میرے اور گلدار کے لیے اس پر بہتیری جگہ تھی۔ گرمیاں شروع ہونے کے بعد جتنی اچھی نیند مجھے اس رات آئی، اتنی پہلے نہ آئی تھی، اور میرے پہلو میں گلدار بھی بظاہر چین سے سوتا رہا۔ ایک دوسری نوع سے تعلق رکھنے والے توانا بدن کی اس انتہائی قربت سے مجھے ایسی خوشگواری محسوس ہوئی جسے میں کوئی نام دینے سے قاصر ہوں۔

جب میں صبح کی دھیمی روشنی میں، گھر کے باہر طوطوں کی ٹائیں ٹائیں سنتی، جاگی تو وہ مجھ سے پہلے اٹھ کر کمرے سے جا چکا تھا۔ باہر دیکھا تو وہ زمین کے اس چھوٹے سے قطعے پر، جسے میں گھر کے اگواڑے جنگل اور گھر کے بیچ نلائے رکھتی ہوں، مجسمہ وش کھڑا نظر آیا۔ میں نے سوچا کہ وہ رخصت ہونے کے بارے میں سوچ بچار کر رہا ہے۔ لیکن جب میں کپڑے پہن کر باہر آئی تو وہ ابھی وہیں کھڑا گنجان ہریاول کے حاشیے کا جائزہ لے رہا تھا جس میں بھاری بھرکم لدھڑ بارن بل اُدھمی انداز میں لڑھکتے پھر رہے تھے۔

میں نے اسے آواز دی اور گھر میں رکھا ہوا کچھ گوشت کھلایا۔ مجھے امید تھی کہ وہ بولے گا، یہ بتائے گا کہ وہ کیوں آیا ہے اور اسے مجھ سے کیا کام ہے۔ لیکن گو وہ فکر مند ہو کر اپنی بڑی بڑی چمکیلی آنکھوں سے میری طرف دیکھتا رہا، بظاہر میرے کہے کو سمجھتا گیا، اس نے جواب نہیں دیا اور سارے دن چپ رہا۔ مجھے تاکید سے یہ ضرور بتا دینا چاہیے کہ اس کی خاموشی میں اڑیل پن یا خصومت کا شائبہ

Scanned with CamScanner

تک نہ تھا اور میں نے اس کا برا نہ مانا۔ اس کے برعکس میں نے اسی کم آمیزی کی بنا پر اس کا احترام کیا اور چونکہ اس کی خاموشی منقطع ہوئے بغیر جاری رہی، اس لیے میں نے یہ توقع ہی چھوڑ دی کہ اس کی آواز مجھے سننے کو ملے گی۔ میں خوش تھی کہ مجھے بولنے کا بہانہ ہاتھ آ گیا اور اس سے باتیں کرتی رہی۔ ہمیشہ یہی لگا کہ وہ میری باتیں سن اور سمجھ رہا ہے۔

دن میں بیشتر وقت گلدار غائب رہا۔ میں نے قیاس کیا کہ وہ اپنی فطری خوراک شکار کرنے گیا ہے لیکن عموماً وہ تھوڑی دیر بعد لوٹ آتا اور ایک آدھ بار کے سوا ایسا معلوم نہیں ہوا کہ کہیں دور گیا ہو۔ اس کے حفاظتی گلوں کے نقش و نگار وحشی ٹہنیوں سے چھن کر آتی دھوپ سے بننے والے نقش و نگار سے اس قدر مکمل طور پر گھل مل جاتے تھے کہ بہت قریب ہوتے ہوئے بھی وہ درختوں کے درمیان میں مشکل ہی سے نظر آتا تھا۔ توجہ ایک جگہ مرکوز کر کے گھورنے کے بعد ہی میں اس میں اور اس کے پس منظر میں تمیز کر سکتی تھی۔ وہ کسی گھنی چھاؤں والی کھلی جگہ میں گھات لگائے دبکا نظر آتا یا پھر دیو قامت کووی کا وا درختوں کے، جن کی شاخوں کے پنجر سے نسبتاً کم تنومند پیڑوں اور ساتھ میں ان گنت بیلوں اور چھوٹے موٹے بوٹوں کو سنبھالا ملتا تھا، کسی ٹہنے کی لمبان پر نرالی پھبن سے پاؤں پھیلائے لیٹا ہوتا۔ طرفہ تماشا یہ تھا کہ جونہی میری نگاہ اس پر پڑتی، وہ لامحالہ سر گھما کر دیکھتا جیسے اسے خبر ہوگئی ہو کہ میں اس کی طرف دیکھ رہی ہوں۔ ایک بار میں نے اسے کہیں زیادہ دور، ریتلے ساحل پر، کھڑے دیکھا جو میرے گھر سے ذرا ظہور نظر آ جاتا تھا۔ پانی کے بالمقابل سیاہ سے خاکے کی صورت کھڑا وہ سمندر کو تک رہا تھا۔ لیکن اتنا فاصلہ ہونے کے باوجود اس کا سر میری طرف گھوم گیا، گویا میرا اس کی نظر کی پہنچ میں ہونا ممکن ہی نہ تھا۔ کبھی کبھار وہ اچانک اندر چلا آتا، تیز دلکی چلتا چپ چاپ سارے گھر کا چکر لگاتا، ایک کمرے سے دفعتاً دوسرے کمرے میں جا پہنچتا اور پھر اسی پراسرار انداز میں آناً فاناً چلتا بنتا۔ کبھی یوں ہوتا کہ وہ اپنا سر دہلیز پر دھرے، بالکل بت بنا، گھر سے ذرا باہر یا ذرا اندر پسر جاتا۔ بس اس کی چوکنی آنکھیں گھومے جاتیں اور اس کے حساس نتھنے ایسے مہکوں کے جواب میں پھڑکتے رہتے جن کا میرے کم ذکی حواس ادراک نہ کر سکتے۔

اس کی حرکات و سکنات ہمیشہ خاموش، خوش ادا، پر وقار اور محکم ہوتیں اور اپنی روزمرہ کی آرجار میں ہمارا جب بھی آمنا سامنا ہوتا، اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں مجھے پہچاننے میں کبھی خطا نہ کرتیں۔

Scanned with CamScanner

اپنے ملاقاتی سے میرا جی بہت خوش ہوا۔ اس کے سکوت کے باوجود یہ عیاں تھا کہ وہ مجھے جانتا پہچانتا ہے۔ اگر میں پیدل جنگل کے راستے کسی سے ملنے یا پڑوس کے گاؤں سے کھانے پینے کا سامان خریدنے جاتی تو وہ نہ جانے کہاں سے آ پہنچتا اور میرے ساتھ ہو لیتا۔ لیکن جونہی کوئی گھر دکھائی پڑتا ہمیشہ ٹھٹک جاتا اور ہرگز یہ موقع نہ دیتا کہ کسی کی نظر اس پر پڑ سکے۔ ہر رات، بے شک، وہ بستر پر میرے پہلو میں استراحت کرتا۔ جوں جوں ہفتے گزرتے گئے، ایسا محسوس ہوا کہ وہ دن کو بھی پہلے سے زیادہ وقت میرے پاس گزارنے لگا ہے۔ جب میں اپنا کام کرتی تو وہ نزدیک ہی بیٹھا یا لیٹا رہتا۔ کبھی کبھی بالکل قریب آ کر، جو کچھ میں کرتی ہوتی اسے بہت غور سے دیکھنے لگتا۔

پھر، خبردار کیے بغیر، وہ اچانک مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔ یہ ماجرا اس طرح پیش آیا۔ برسات، خنک تر موسم اپنے جلو میں لیے، آ پہنچی تھی۔ منھ اندھیرے کی ہوا میں ٹھری تھی۔ میں کپڑے پہننے سے نمٹ چکی تھی تو وہ میرے کمرے میں دوبارہ آیا اور ایک لمحے کے لیے مجھ سے ٹیک لگا کر کھڑا ہوا۔ اس نے دن کے وقت شاید مشکل ہی سے کبھی مجھے چھوا ہوگا— اس دیدہ و دانستہ انداز میں تو یقیناً کبھی نہیں چھوا تھا۔ میں نے اس کا یہ مطلب لیا کہ وہ مجھ سے کوئی کام لینا چاہتا ہے اور اس سے پوچھا کہ کیا بات ہے۔ وہ چپ چاپ آگے آگے چلتا اور ہر چند قدم کے بعد رک کر پیچھے یہ دیکھتا ہوا کہ میں ساتھ آ رہی ہوں یا نہیں، گھر سے باہر نکلا اور جنگل میں جا پہنچا۔ طوفانی آسمان پر گھنگھور گھٹا چھائی ہوئی تھی۔ درختوں سے، جن کے نیچے تقریباً اندھیرا تھا، رات کی بارش کی موٹی موٹی بوندیں میری گردن اور ننگی بانہوں کو ٹھٹھراتی ہوئی ٹپ ٹپ گر رہی تھیں۔ چونکہ وہ بظاہر یہ چاہتا تھا کہ میں اور دور تک اس کے ہمراہ چلوں اس لیے میں نے کہا کہ میں جا کر اپنا کوٹ لے آؤں۔

تاہم معلوم یہ ہوتا تھا کہ وہ بے صبری کے مارے انتظار کرنے کو تیار نہیں اور لمبی لمبی کلانچیں بھرتا جھپٹتا چلا گیا۔ مخملیں جلد کے نیچے اس کے شانے فولادی پسٹنوں کی طرح تنتے ابھرتے رہے۔ ادھر میں با دلِ ناخواستہ پیچھے پیچھے چلتی گئی۔ تل دھار اوپر دھار برسنے لگا۔ پانچ منٹ میں زمین دلدل بن گئی جس میں قدم قدم پر میرے پاؤں دھنستے جاتے تھے۔ اس وقت تک مجھے کپکپی چڑھ چکی تھی، میں شرابور ہو گئی تھی۔ سو میں رک گئی اور میں نے اسے بتا دیا کہ میں اور آگے نہیں جا سکتی۔ اس نے سر گھمایا اور ایک طویل لمحے کے لیے اس کی نرمل آنکھیں مجھ پہ جمی رہیں۔ وہ جس کیفیت کی غماز تھیں، میں اس کی لم کو نہ

Scanned with CamScanner

پہنچ پائی۔ پھر وہ خوش نما سر مڑا، منقش سمور کے نیچے پٹھے کھسکے اور اس کے ساتھ ہی اس نے بڑی زبردست چھلانگ بھر کر خود کو مینھ کی بوندوں کی چمکتی چلمن کے پار پہنچایا اور فی الفور نظر سے اوجھل ہو گیا۔ میں نے بہ عجلت تمام گھر کا رستہ لیا اور جا کے کپڑے بدلے۔ مجھے شام سے پہلے اس کی صورت نظر آنے کی توقع نہیں تھی، مگر ہوا یہ کہ وہ لوٹ کر ہی نہ آیا۔

گلدار کے پھیرے کے بعد ایسا کوئی واقعہ پیش نہ آیا جو کسی قسم کی دلچسپی کا حامل ہوتا۔ میری زندگی کام کاج اور چھوٹی چھوٹی باتوں کے پرانے ڈھرے پر پھر سے چل نکلی۔ برسات بیت گئی۔ جاڑوں کے دن چپ چپاتے موسمِ بہار میں گھل مل گئے۔ میں دھوپ اور قدرتی مناظر کا مزہ لیتی رہی۔ میرا دل کہتا تھا کہ گلدار واپس آئے ہی آئے اور اکثر چشم براہ رہتی، مگر اس پورے عرصے میں وہ ہرگز جو دکھائی دیا ہو۔ جب آسمان پاک صاف اور بے ابر ہو کر جنگل پر تن گیا تو درختوں پر رنگ برنگے استوائی پھول کھلنے لگے۔ میں اپنے ایک دو واقف کاروں سے ملنے چلی گئی۔ چند ایک لوگ مجھ سے ملنے میرے گھر چلے آئے۔ ہماری گفتگو میں گلدار کا کبھی نام تک نہ آیا۔

گرمی روز بروز بڑھتی گئی۔ ہر نیا دن شیشے کی طرح صاف شفاف طلوع ہوتا۔ فضا میں جنگلی سفید چنبیلی کی شہوانی مہک رچ گئی۔ لڑکیاں گلے میں ڈالنے اور بالوں میں اڑسنے کے لیے اس کے ہار گوندھنے لگیں۔ میں نے اپنے گھر کی دیواروں پر چند بڑے بڑے نئے میورل پینٹ کیے اور رنگین سیپیوں کے موزیک سے ایک چبوترے کی داغ بیل ڈالی۔ مہینوں سے مجھے یہ آس تھی کہ اب گلدار کے دیدار ہوں گے۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جب اس کا کوئی اتا پتا نہ ملا تو رفتہ رفتہ میری امید ٹوٹتی گئی۔

معمول کے مطابق امس کا موسم آ پہنچا اور ساری ساری رات گھر چوپٹ کھلا رہنے لگا۔ کسی اور وقت کی نسبت، رات کو، سونے سے ذرا قبل، گلدار مجھے زیادہ یاد آتا اور گو میں یہ خوب سمجھتی تھی کہ اب ایسی کسی بات کا امکان باقی نہیں، پھر بھی خود کو جھوٹ موٹ یہ تسلی دیتی کہ آنکھ کھلنے پر وہ مجھے دوبارہ اپنی بغل میں نظر آئے گا۔

گرمی کے مارے میری سکت زائل ہو گئی۔ موزیک کو آگے بڑھانے کا کام سست پڑ گیا۔ اس سے پہلے میں نے اس طرح کے کام پر ہاتھ ڈالنے کی کبھی کوشش نہ کی تھی اور یہ حساب نہ لگا سکنے کے

باعث کہ کل کتنی سیپیوں کی ضرورت پڑے گی، مستقل طور پر یہی ہوتا کہ جتنی سیپیاں لا کے ذخیرہ کرتی سب نبڑ جاتیں اور مزید سیپیاں بٹورنے کے لیے میں ساحل کے پھیرے لگا لگا کر ہلکان ہوتی رہتی۔

ایک روز جب میں ساحل پر تھی تو مجھے، دور سمندر پر، ایک نوجوان آدمی خشکی کی طرف آتا دکھائی دیا۔ وہ ایک بہت بھاری ساحل توڑ موج کے طرّے پر بالکل الف کھڑا تھا۔ ہوا بھر جانے سے اس کا لال چوغہ پھڑ پھڑا رہا تھا اور حواصلوں کا غول کا غول، بڑی متانت سے پر مارتا ہوا، اس کے پیچھے پیچھے پرا باندھے چل رہا تھا۔ اس اجنبی کو، ایسے تحفہ بدرقے سمیت، تن تنہا اس سمندر کی طرف سے، جہاں کبھی کسی جہاز کا گزر نہ ہوتا تھا، آتے دیکھنا اتنے اچنبھے کی بات تھی کہ میرے خیال نے فوراً اسے گلدار سے منسوب کر دیا۔ ان کے درمیان ضرور کوئی رابطہ ہوگا۔ شاید وہ میرے لیے کوئی خبر لے کر آ رہا ہو۔ جب وہ اور قریب آ گیا تو میں نے پکار کر اسے مخاطب کیا، تسلیم بجالائی اور سوال کیے۔ جن کا اس نے جواب دیا۔ لیکن موجوں کے شور اور ہمارے درمیان فاصلے کی وجہ سے میں اس کی بات سمجھ نہ سکی۔ ساحل پر آ کر مجھ سے بات کرنے کے بجاے وہ یکا یک مڑا اور پھر موجوں کے ساتھ دور سمندر کی طرف بہا چلا گیا۔ میں ششدر رہ گئی اور مایوس ہوئی۔ لیکن میں نے سیپیاں لے کر گھر کا رخ کیا اور پہلے کی طرح کام میں مگن ہو کر تھوڑی ہی دیر میں اس مڈھ بھیڑ کو بھول بھلا گئی۔

کچھ دن بعد، غروب کے وقت گھر آتے ہوے، گھر کی چھت کے سب سے اونچے حصے پر ایک حواصل بیٹھا دیکھ کر مجھے سمندر والا نوجوان یاد آ گیا۔ حواصل کی موجودگی پر مجھے حیرت ہوئی۔ قاعدہ ہے کہ حواصل ساحل سے اِدھر اُدھر نہیں ہوتے۔ میں نے کبھی کسی حواصل کو خشکی پر اتنے آگے تک آتے نہ دیکھا تھا۔ معاً مجھے سوجھا کہ اس پرندے کا ضرور بالضرور گلدار سے کچھ نہ کچھ تعلق ہے۔ شاید وہ اس کا کوئی پیغام لے کر آیا ہے۔ اسے بہلا پھسلا کر قریب بلانے کے لیے مجھے باورچی خانے میں ایک چھوٹی سی مچھلی مل گئی جو میں نے لا کر گھاس پر رکھ دی۔ حواصل نے فوراً جھپٹا مارا اور تن و توش کے باوجود قابل لحاظ پھرتی اور صفائی سے مچھلی چونچ میں پرو لی اور اڑتا بنا۔ میں نے اسے آواز دی، آنکھیں گاڑ کر اس کی اڑان پر نظر رکھنی چاہی، لیکن بس اتنی ہی جھلک دکھائی دی تھی کہ جنگل کے درختوں کے اوپر اس کے بڑے بڑے پر پھڑ پھڑاتے ہوے دور ہوتے جا رہے ہیں تو استوائی اندھیرے کا ناگہانی سیاہ پردہ سٹ سے نیچے آ رہا۔

Scanned with CamScanner

اس وقوعے سے، اس غیر شافی اختتام کے باوجود، یہ امید پھر سے بندھی کہ گلدار سے دوبارہ ملنا نصیب ہوگا۔ مگر بعد میں بات کسی طرح آگے نہ بڑھی۔ کیا مجال جو کوئی ذرا سا بھی غیر معمولی واقعہ پیش آیا ہو۔

ابھی وہی موسم چل رہا تھا جس میں جلتے بھلستے آسمان تلے زمین تونستی رہتی ہے۔ سہ پہر کو تجارتی ہوائیں کمروں میں آتیں اور انھیں ٹھنڈا کر دیتیں لیکن جونہی وہ چلنا بند ہوتیں، گھر میں پہلے سے بھی زیادہ تپش ہو جاتی۔ اب تک میں نے ہمیشہ ہی اپنے ملاقاتی کو یاد کر کے ایک پچھتاوے بھری لذت حاصل کی تھی۔ لیکن اب کہ میں بالآخر اس کی مراجعت کی تمام امید کھو چکی تھی یہ یاد خوشی سے زیادہ اداسی کو برانگیختہ کرتی تھی۔

آخرش موزیک، جس میں نفیس بندکیوں والی پوستین اور انسانی سر والے ایک عالی ظرف جانور کو نقش کے مرکز سے فخریہ انداز میں سامنے دیکھتے ہوئے پیش کیا گیا تھا، پایۂ تکمیل کو پہنچا اور خاصا پرشکوہ معلوم ہوا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ موزیک کے گرد زرد سیپیوں کی جدول کھینچنے کی ضرورت ہے اور ایک بار پھر ساحل کی طرف مہم پر روانہ ہوئی جہاں چمچماتی ہری موجوں سے برپا ہونے والی چکاچوند سے دھوپ کی شدت دوچند ہو گئی تھی۔ موجیں اس طرح جگمگا رہی تھیں جیسے ان پر اِدھر سے اُدھر تک ہیرے بکھیر دیے گئے ہوں۔ گرم ہوا سیٹیاں بجاتی ہوئی، میرے بالوں کو سہلاتی، ریت کو چاروں طرف اڑاتی، گزری اور سمندر پہ یوں تازیانے کی طرح جا کے ٹوٹی کہ ساحل توڑ موجیں گرج گرج کر اٹھنے لگیں جن کے اوپر، پھوار کی دمکتی بدلیوں میں، سمندری پرندوں کے جھلڑ چلچلاتے اڑ رہے تھے۔

کچھ دیر سیپیاں تلاش کرنے کے بعد میں سیدھی کھڑی ہو گئی کہ تمازت اور مشقت کی وجہ سے میرا سر قریب قریب چکرا گیا تھا۔ عین اس لمحے، جب میں ڈھیڑ ہے رنگوں اور غضب کی چکاچوند سے چندھیا چلی تھی، وہ نوجوان جسے میں نے پہلے بھی دیکھا تھا، کسی سراب کی مانند دوبارہ ظاہر ہوا۔ اس کے ہوا میں اڑتے چوغے کا سرخ رنگ شوخ زمردیں سبز لہروں کے مقابلے میں تھرا رہا تھا۔ اس مرتبہ جھلملاتی تابندگی سے بھرے ایک غبار کے اُس پار، مجھے گلدار اس کے ہمراہ، اپنے اصل قد کاٹھ سے کہیں زیادہ بڑا اور شاہانہ، نظر آیا اور وہ اس تیجیلے پن سے چل رہا تھا جیسے موجیں ٹھوس کانچ کی بنی ہوں۔

میں نے اسے پکارا اور گو وہ ساحل کو روندتی موجوں کی گھن گرج میں میری آواز نہ سن سکتا تھا،

Scanned with CamScanner

اس نے اپنا شان دار سر گھمایا اور دیر تک ایک عجیب، شگون بھرے انداز میں میری طرف دیکھا، بعینہٖ جیسے اس نے اس دفعہ آخری بار جنگل میں میری طرف دیکھا تھا۔ اس وقت بارش کی جگہ اڑتی پھوار کی جگمگاتی دھنکوں نے لے رکھی تھی۔ میں سمندر کی گگر کی طرف لپکی۔ پھر ان جناتی لوٹ پوٹ ریلوں کے پہاڑ جیسے ڈیل ڈول سے سہم کر، جو مجھ پر میناروں کی طرح چڑھے آ رہے تھے، یک لخت رک گئی۔ میں کوئی زورآور تیراک نہیں۔ پانی کی ان بہت عظیم، آگے کو بڑھتی دیواروں کو للکارنا دیوانگی معلوم ہوا کہ وہ یقیناً حقارت کے ساتھ مجھے ساحل پر اس طرح واپس لا پھینکتیں کہ میرے بدن کی کوئی ہڈی سلامت نہ رہتی۔ ان کی دھماکوں جیسی دہاڑ نے میرے کان بہرے کر دیے، کھاری پھوار سے میری بینائی آدھی رہ گئی۔ سارا ساحل ایک چکراتی، دمکتی چکاچوند بن گیا جس میں وہ دونوں سمندر آور دصورتیں میری نظر سے غائب ہوگئیں اور جب میری نگاہ دوبارہ ان پر ٹھیر سکی تو وہ رخ بدل چکی تھیں، خشکی سے انھوں نے منھ موڑ لیا تھا اور اتنی سی دیر ہی میں کہیں کی کہیں جا پہنچی تھیں اور بڑی سرعت سے دور ہٹتی، لحہ بہ لحہ چھوٹی ہوتی، دھوپ اور موجوں کی سنگین، خیرہ کن جگمگاہٹ میں گھٹتے گھٹتے ناپید ہوا چاہتی تھیں۔

ان کے غائب ہونے کے بعد دیر تک میں وہاں کھڑی اس مواج سمندر پر دور دور تک نظر دوڑاتی رہی جہاں میں نے کبھی بھولے سے بھی کسی قسم کی کشتی نہ دیکھی تھی اور جو اب ہمیشہ سے زیادہ خالی، سنسان اور اجاڑ معلوم ہو رہا تھا۔ اضمحلال اور مایوسی سے میرے دست و پا شل ہو کر رہ گئے اور میں مشکل سے خود پر جبر کر کے اکٹھی کی ہوئی سیپیوں کو اٹھا کر گھر لے گئی۔

یہ آخری بار تھی جب میں نے گلدار کو دیکھا۔ اس کے بعد اس کے یا اس نوجوان کے بارے میں ایک حرف بھی میرے سننے میں نہ آیا۔ کچھ عرصے میں ان دیہاتیوں سے پوچھ گچھ کرتی رہی جو سمندر کنارے آباد تھے۔ ان میں سے بعض نے کہا کہ انھیں یونہی سا یاد پڑتا ہے کہ سرخ چوغے والے ایک مرد کو موجوں پر سوار دیکھا تھا۔ لیکن وہ آخر میں ہمیشہ ٹال مٹول پر اتر آتے، بے یقینی میں مبتلا ہو جاتے اور کچھ کا کچھ کہنے لگتے۔ سو میں جان گئی کہ میں اپنا وقت گنوا رہی ہوں۔

میں نے گلدار کے بارے میں کبھی کسی سے ایک لفظ تک نہیں کہا۔ ان سیدھے سادے لوگوں کے سامنے جو چڑیا گھروں، سرکسوں، سنیماؤں اور ٹیلی وژن سے دور، اجاڑ بیابان میں رہتے ہیں، گلدار کا لفظوں میں نقشہ کھینچنا مشکل ہے، کہ انھیں کبھی کوئی ایسا حیوان دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا ہوگا جو

Scanned with CamScanner

اس سے دور کی مشابہت بھی رکھتا ہو۔ دنیا کے اس خطے میں کبھی گوشت خور جانوروں، بڑے ڈیل ڈول والے یا موذی درندوں نے ٹھکانا نہیں کیا۔ یہی سبب ہے کہ ہم بلا خوف وخطر رات رات بھر اپنے گھر کھلے رہنے دیتے ہیں۔

میری زندگی اسی روش سے کسی ہرج مرج کے بغیر گزرتی جا رہی ہے۔ کوئی واقعہ ایسا نہیں ہوتا جس سے شب وروز کی بے رنگی میں خلل پڑے۔ میں سمجھتی ہوں کہ کوئی دن جاتا ہے، شاید میں یہ بھی بھول جاؤں گی کہ گلدار میرے پاس آیا تھا۔ اب بھی حالت یہ ہے کہ رات کے وقت کو چھوڑ کر، جب مجھے نیند آنے کا انتظار ہوتا ہے، میں اس کو بھولے سے ہی یاد کرتی ہوں۔ لیکن ابھی تک، گو بہت ہی کبھی کبھار، وہ میرے خوابوں میں آ کے خلجان کا باعث ہوتا ہے اور مجھے بے چین اور اداس کر جاتا ہے۔ اگرچہ جاگنے پر وہ خواب مجھے کبھی یاد نہیں ہوتے، پھر بھی کئی دن تک ان کی وجہ سے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے طبیعت کسی ایسے نقصان کی مبہم تلخی سے بھاری ہو رہی ہو جو پہنچنا نہ چاہیے تھا اور جس کے لیے میں آپ تقصیروار ہوں۔

❁ ❁

سہ ماہی ''آج'' اور سٹی پریس کی کتابیں یہاں دستیاب ہیں

فضلی سنز
ٹیمپل روڈ، اردو بازار
کراچی

ویلکم بک پورٹ
اردو بازار
کراچی

تھامس اینڈ تھامس
نزد صدر جی پی او
کراچی

سٹی بک پوائنٹ
نزد مقدس مسجد، اردو بازار
کراچی

دی سیکنڈ فلور
5/6-C، خیابانِ اتحاد
ڈیفنس فیز 7، کراچی

مکتبہ دانیال
عبداللہ ہارون روڈ، نزد جبیس ہوٹل
صدر، کراچی

سندھی لینگویج اتھارٹی
لطیف آباد
حیدرآباد

سندھی ادبی بورڈ بک اسٹال
تلک چاڑی
حیدرآباد

کریمی بک کارپوریشن
نزد چاندنی شاپنگ مال
حیدرآباد کینٹ

خالد بک ڈپو
درانی چوک
خانپور

کتاب نگر
حسن آرکیڈ
ملتان کینٹ

ڈاکٹر ریاض مجید
D-288، پیپلز کالونی
فیصل آباد

کوپرا بک شاپ
70، شاہراہِ قائداعظم
لاہور

بک ہوم
بک اسٹریٹ، 46 مزنگ روڈ
لاہور

نگارشات
24، مزنگ روڈ
لاہور

مسٹر بکس
10۔ڈی، سپر مارکیٹ
اسلام آباد

لندن بک کمپنی
کوہسار مارکیٹ،
F-6-3، اسلام آباد

قلات پبلشرز
رستم جی لین، جناح روڈ
کوئٹہ

مکران بک ہاؤس
ایئرپورٹ روڈ، نزد واشتی مارکیٹ
گوادر

Scanned with CamScanner

۵۸

قیمت
۱۳۰ روپے

آج کی کتابیں

۳۱۶ مدینہ سٹی مال، عبداللہ ہارون روڈ،
صدر، کراچی ۷۴۴۰۰

Scanned with CamScanner